تذکرہ

مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ

محمد اسحاق بھٹی

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ ویلفیئر سوسائٹی

تذکرہ
مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ
تالیف
محمد اسحاق بھٹی
www.KitaboSunnat.com
مولانا غلام رسول رحمہ اللہ ویلفیئر سوسائٹی

طبع اول
ربیع الاول ۱۴۳۳ھ/فروری ۲۰۱۲ء

اہتمام ———— حافظ حمید اللہ

ناشر
مولانا غلام رسول ویلفیئر سوسائٹی
قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ رابطہ نمبر: 0344-6084317

ملنے کے پتے

گوجرانوالہ	والی کتاب گھر۔ اردو بازار۔ 055-4441613۔ مکتبہ نعمانیہ۔ اردو بازار۔ 055-4235072 مکتبہ الفرقان۔ اردو بازار۔ 0333-4264487
لاہور	المکتبہ السلفیہ لاہور۔ 042-37237184۔ کتاب سرائے۔ اردو بازار۔ 042-37320318 مکتبہ محمدیہ۔ اردو بازار۔ 042-37114650۔ مکتبہ اسلامیہ۔ اردو بازار۔ 042-37244973 دار الکتب السلفیہ۔ اردو بازار۔ 042-37361505۔ اسلامی اکیڈمی۔ اردو بازار۔ 042-37357585۔ مکتبہ قدوسیہ۔ اردو بازار۔ 042-37351124
فیصل آباد	مکتبہ اہل حدیث۔ امین پور بازار۔ 041-2629292 مکتبہ اسلامیہ۔ فیصل آباد۔ 041-2631204۔ طارق اکیڈمی۔ 041-8546964
کراچی	فضلی سنز۔ اردو بازار۔ 021-32629724۔ 021-32212991 علمی کتاب گھر۔ اردو بازار۔ 021-32628939۔ دار السلام۔ 021-34393936
اسلام آباد	المسعود۔ اسلام آباد۔ 051-2261356۔ دار السلام۔ 051-2281516, 2500237
راولپنڈی	مکتبہ عائشہ۔ 051-5551014۔ کتب خانہ رشیدیہ۔ 051-5771798
سعودی عرب	الفرقان۔ الریاض۔ 01-4358646۔ دار العلوم الندیہ۔ جدہ۔ 02-6336640

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا

مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى

وَهُوَ مُؤْمِنٌ

فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً
وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

ترجمہ

جوشخص نیک اعمال کرے گا، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہوگا
توہم اس کو دنیا میں پاک اور آرام کی زندگی میں رکھیں گے اور آخرت میں
اُن کے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے

عرضِ ناشر

مولانا غلام رسول ویلفیئر سوسائٹی کی بنیاد اپریل 2004ء میں رکھی گئی جس کے پہلے صدر پروفیسر ملک محمد نسیم صاحب منتخب ہوئے۔ مسلسل چھ سال تک سوسائٹی کی صدارت کے منصب پر فائز رہے۔ان کی کوششوں اور کاوشوں کے سبب یہ سوسائٹی آج ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ان کے بعد صدارت کا یہ بارِگراں میرے ناتواں کندھوں پر ڈال دیا گیا۔

سوسائٹی کے قیام کے روز ہی سے کئی اہم منصوبے اس کے پیش نظر تھے لیکن ابتدائی مرحلوں میں سوسائٹی کے اندر ان منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی سکت نہ تھی۔ ان اہم منصوبوں میں سے ایک منصوبہ حضرت مولانا غلام رسولؒ کی سوانح ازسرنو مرتب کرنے اور شائع کرنے کا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ منصوبہ آج پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔اور کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

سوسائٹی کی تشکیل سے پہلے ہر فرد اپنی ذات میں مگن، اپنے عزیز واقارب سے بے تعلق، ناآشنا اور باہمی رشتہ داریوں سے نابلد تھا۔ باہمی رابطے نہ ہونے کے برابر تھے۔ رابطوں کے فقدان کے سبب ایک دوسرے سے دور تھے۔ سوسائٹی قائم کرنے کا اولین فائدہ یہ ہوا کہ ایک دوسرے سے شناسائی ہوئی۔ رابطے بڑھے اور باہمی تعلقات اور رشتوں کا علم ہوا۔ اس کتاب کا آخری باب انہی تعلقات کے اظہار کی ایک کوشش ہے۔

کتاب کی ترتیب وتالیف اور اس کی ثقاہت کے بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ کئی کتابوں کے مصنف، کہنہ مشق ادیب اور خاکہ نگار مولانا محمد اسحٰق بھٹی صاحب نے تالیف کی ہے۔ان کا نام نامی ہی اس کے وقیع ہونے کی دلیل ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

مولانا بھٹی صاحب نے مولانا غلام رسولؒ کی سوانح ہی نہیں لکھی بلکہ اس عہد کی پوری تاریخ اس میں سمو دی ہے۔ حسب عادت اور حسب روایت اس میں ''کارِ مسیحائی'' بھی انجام دیا ہے کہ اس جہانِ فانی سے گئے ہوئے لوگوں کو ہمارے سامنے چلتے پھرتے لا کھڑا کیا ہے۔

بعض کم فہم لوگ اس قسم کی کتابوں کی تالیف واشاعت کو وقت کا ضیاع اور ایسی شخصیات کے خصائل کے ذکر سے گریز کو توحید کے منافی سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہدایت کا منبع اور سرچشمہ یہی شخصیات ہی تو ہیں۔ ان شخصیات سے صرف نظر کرکے وہ توحید کے تقاضوں کو پورا نہیں

کر رہے ہوتے بلکہ قدرت کی اپنے مخصوص بندوں پر نوازش ہائے بے پایاں سے لاعلمی کا ثبوت فراہم کر رہے ہوتے ہیں۔

سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی زبان سے یہ کہلواتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت نصیب فرما۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے اپنی عنایات ونوازشات کی انتہا کر دی۔ سورۃ نساء میں ان لوگوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: یہ لوگ انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین کی معیت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ (النساء:۶۹)۔

ان انعام یافتگان میں سے ایک طبقہ صالحین کا بھی ہے۔ یہی وہ اہل ذکر وفکر لوگ ہیں جن کی صحبت میں بیٹھنے اور ان سے نگاہیں نہ پھیرنے کا حکم اللہ نے اپنے رسول مکرم کو دیا۔ فرمایا:

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغدوة والعشيّ يريدون وجهه ولا تعد عينك عنهم (سورۃ الکہف)

(ترجمہ): ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا کرو جو محض اس (اللہ) کی رضا کے حصول کی خاطر اپنے رب کو صبح وشام پکارتے (اور اس سے دعائیں مانگتے) ہیں۔

قرآنی تعلیمات تک نارسائی اور اسلاف کے احترام اور ان کے معمولات یومیہ کے ذکر سے گریز ممکن ہے نیازمندوں کے غلوعقیدت کا ردّعمل ہو لیکن یہ دونوں راہیں افراط وتفریط کا نتیجہ ہیں۔ ان کے ''وسط'' میں ہی اصل راہ ہے۔

یہ اللہ کے ان بندوں میں سے ایک بندے کی داستانِ حیات ہے جو علم وعمل میں ہمہ وقت مستعد اور عزیمت کا کوہ گراں تھا۔ جس نے اپنی پوری زندگی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے لئے وقف کر دی تھی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

جناب حافظ حمید اللہ صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل کیلئے دن رات ایک کر دیئے اور دامے، درہمے، قدمے اور سخنے تعاون فرمایا۔ جزاه الله احسن الجزاء

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

ملک عصمت اللہ
صدر مولانا غلام رسول ویلفیئر سوسائٹی
قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ
حال مقیم شاہدرہ لاہور۔ 0334-4372647

فہرست

دوسرا باب:

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی ولادت

تیسرا باب:

تحصیل علم

چوتھا باب:

اساتذہ کرام

پانچواں باب:

اصحابِ تقوی کی تلاش میں

چھٹا باب:

حضرت اخوند سید محمد امیر صاحب رحمہ اللہ

ساتواں باب:

حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ

آٹھواں باب:

لاہور میں وعظ وتذکیر کا حکم

نواں باب:

دسواں باب:

گیارھواں باب:

1857ء کی جنگ آزادی اور مولانا کی گرفتاری

بارھواں باب:

حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ

تیرھواں باب:

چودھواں باب:

پندرھواں باب:

سولھواں باب:

پیکرِ سخاوت اور مجسمۂ مروّت

سترھواں باب:

عادات واطوار

اٹھارھواں باب:

انیسواں باب:

مولانا غلام رسول ﷫ کے چند معاصرین

بیسواں باب:

تلامذۂ کرام

اکیسواں باب:

بائیسواں باب:

مکتوبات

پینتیسواں باب:

چھتیسواں باب:

سینتیسواں باب:

اڑتیسواں باب:

تقریظ

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی زندگی پر تحریر کی گئی کتاب (تذکرہ مولانا غلام رسول) آپ کے پیشِ نظر ہے جس میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے بلاشبہ مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کا ذکر برصغیر کے ان فقہا وعلما میں ہوتا ہے جن کی زندگیاں دین اسلام کی تبلیغ، پسی ہوئی انسانیت کی خدمت اور بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کے لیے وقف ہوچکی تھیں۔ مولانا غلام رسول کی زندگی خود گوناگوں حوادث سے عبارت ہے انگریز دور میں ان کی گرفتاری بھی عمل میں آئی مگر یہ ساری چیزیں نہ تو ان کے راستے کی دیوار بن سکیں اور نہ ان کے پائے استقلال میں کوئی لرزش ہی پیدا ہوئی۔ اور انھوں نے انسانیت کی بھلائی اور بہتری کے لئے اپنا مشن جاری وساری رکھا۔ قلعہ میاں سنگھ میں ان کا قیام اس علاقہ کے لئے کسی سعادت سے کم نہیں۔ لوگ ان کے علم وعرفان سے فیض یاب ہوئے۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ نے فارسی اور پنجابی زبان میں شاعری کے ذریعے بھی اپنا پیغام لوگوں تک پہنچایا جو ان کے دلوں میں راسخ ہوگیا اور آج بھی لوگوں کو ان کے شعر زبانی یاد ہیں جنھیں عمر رسیدہ لوگ اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر پڑھتے اور روحانی تسکین

حاصل کرتے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں فتاوٰی مولوی غلام رسول، سی حرفی اور پکی روٹی خاص طور پر بہت مشہور ہوئیں۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی سوانح حیات کی طباعت کے سلسلہ میں محمد اسحاق بھٹی صاحب کی خدمات کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا انہوں نے بڑی محنت کے بعد مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی زندگی کے بارے معلومات مرتب کر کے کتابی شکل دی ان کے مساعی نہ صرف قابل تحسین بلکہ قابل داد بھی ہیں۔ میرے آباؤ اجداد بھی مولانا غلام رسول کے مداح تھے جبکہ میرا ذاتی لگاؤ بھی ان کے ساتھ تقریباً پچاس سال سے زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی سوانح حیات کی ترتیب وتدوین کے لئے حافظ حمید اللہ صاحب کا ہر ممکن تعاون بھی محمد اسحاق بھٹی صاحب کو حاصل رہا۔ ان کی شبانہ روز کوششوں سے ہی سوانح حیات شائع ہو کر منظر عام پر آرہی ہے جس میں مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی زندگی کے ہر ہر پہلو کے بارے میں وسیع ذخیرہ موجود ہے جس کا مطالعہ تا قیام قیامت آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ، بھٹکی ہوئی انسانیت کے لئے مینارۂ نور اور عوام الناس کے لئے مکمل راہنمائی کا مواد مہیا کرتا رہے گا۔ مولانا غلام رسول کی سوانح حیات کی اشاعت کے سلسلہ میں میں محمد اسحاق بھٹی اور حافظ حمید اللہ صاحب کی لحہ بہ لحہ کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں اور ان کی ترقی وخوشحالی کے لئے دعا گو ہوں۔

بریگیڈیئر محمد سلیم (ر)

تقریظ

حمد و ثنا کے تمام مبارک کلمات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے، درود وسلام امام کائنات حضرت محمد ﷺ کے لئے، دین کی اشاعت بہت بڑی سعادت اور اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو دین اسلام کی خدمت کیلئے منتخب کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اسلام ہی اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔

یہ دین اللہ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا اور آپ ﷺ نے اللہ کے دین پر عمل کرتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دکھلایا۔ انہوں نے آپ ﷺ کی تمام احادیث حتیٰ کہ اداؤں اور اشاروں کو بھی محفوظ کیا۔ ان کے بعد تابعین، تبع تابعین، محدثین، ائمہ کرام، اولیاء عظام میں منتقل ہوا۔ انہوں نے بھی اس دین پر عمل کیا اور آپ ﷺ کی اتباع کی، اور یہ سلسلہ چلتا رہا، اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ وہ دین اسلام آج ہمارے پاس پورے کا پورا محفوظ ہے۔

اللہ کی زمین پر انبیاء ورسل کے بعد سب سے زیادہ مرتبہ صحابہ کرام کا ہے اُن کے بعد محدثین کرام اور ائمہ دین کا ہے اور ان کے بعد اولیاء عظام کا مرتبہ ومقام ہے اور اولیاء کرام کی عزت واحترام کرنا ایمان کا جزو ہے۔ اور اولیاء کن کو کہتے ہیں، سید ابوبکر

غزنوی رحمہ اللہ ولی کامل کی پہچان اور مقام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ولایت کی دلیل فقط ایک ہے اور وہ محمد ﷺ کی کامل اتباع ہے۔

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران 3/2)

جو جتنا آپ ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کی سنت میں فنا ہوا وہ اتنا ہی مقرب الٰہی ہوا۔ حضرت محمد بن فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بدبختی کی تین علامات ہیں:

① صالحین کی صحبت نصیب ہو اور وہ ان کی عزت وحرمت سے محروم رہے۔

② عالم ہو اور بے عمل ہو۔ ③ عمل ہو اور اخلاص سے نہ ہو۔

سید ابو بکر غزنوی مزید فرماتے ہیں کہ میری بات کو پلے باندھ لو کہ ولایت اور قرب الٰہی کے تمام درجات اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہی سے حاصل ہوتے ہیں:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ﴾ (النساء: 69/3)

جن پر اللہ تعالیٰ کی نوازشیں ہوتی ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہیں انبیاء کی معیت نصیب ہوتی ہے جنہیں صدیقیت وشہادت کے بلند مقاموں سے نوازا جاتا ہے۔ نیز یہی وہ ہستیاں ہیں جنہیں صلحاء کی رفاقت جو کہ سب سے اچھی رفاقت ہے نصیب ہوتی ہے۔

صلحاء، اتقیاء، اولیاء کے سب درجات ومراتب کا انحصار اللہ اسکے رسول مقبول کی اطاعت اور اتباع پر ہے۔

اولیاء واجب الادب اور واجب التعظیم ہوتے ہیں۔ اولیاء کا نام ادب سے نہ لینا ان کی عزت نہ کرنا اور ان سے دشمنی رکھنا۔ بخاری شریف کی حدیث قدسی پڑھیے:

"اِنَّ اللّٰهَ قَالَ مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ". (بخاری کتاب الرقاق 6502) کے مطابق اللہ تعالیٰ کا ان سے اعلان جنگ ہے۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی حیات مبارکہ کا تذکرہ اور اس کو محفوظ کرنا آئندہ نسلوں کے لیے فوز وفلاح کی راہیں کھولنا ہے۔ اللہ والوں کا تذکرہ انتہائی خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

ہمارے ممدوح مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے مجاہدات اور ریاضتیں قرآن وسنت کی تعلیمات کے عین مطابق تھیں وہ اسلامی علوم کے متبحر عالم، فقیہ اور متکلم تھے۔ تزکیہ واحسان اسلام کی روح اور ایمان کا جوہر ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى. (الاعلیٰ)
قرآن وحدیث کی غرض وغایت ذات باری تعالیٰ کے ساتھ فرد کے شخصی تعلق کو قائم رکھنا ہے۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی داستان حیات کا مطالعہ یقیناً تپتے ہوئے ریگزاروں میں بادِ نسیم کے ایک جاں فزا جھونکے کی مانند ہے مولانا کی زندگی تعلیم وتدریس اور تبلیغ میں صرف ہوئی جانے کتنے اللہ کے بندے ان کی وجہ سے مسلمان ہوئے۔ اور راہ راست پر آئے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

اور ایسی صاحب کمال ہستیاں کبھی فنا نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں مٹنے والوں کو بقائے دوام بخش دیتا ہے۔

نیک ناموں کے نشان باقی رہیں گے حشر تک

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (یونس 62/10)
میں اس کتاب کے بارے میں کچھ بھی عرض کرنے کے قابل نہیں ہاں اس قدر معلوم ہے کہ جب سے بحیثیت مدرس مولوی صاحب کی مسجد میں آیا ہوں۔ عرصہ

دراز سے یہیں کا ہو کر رہ گیا ہوں۔ آج بھی اس مسجد میں اُن کی برکات موجود ہیں۔

تذکرہ مولانا غلام رسول رحمہ اللہ طالبین حق کے لئے گرانقدر روحانی دولت ہے۔ آپ کی پوری زندگی شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ تھی، آپ کے فرمودات ومعمولات رعب ووقار، تواضع وانکسار، متانت وشرافت، خشوع وخضوع، غنائے قلب حلم وتحمل اعتدال پسندی، مہمان نوازی، خادم پروری، خوش مزاجی، نفاست پسندی، اتباع سنت پر مبنی تھی۔ صبر ورضا، نیکی وتقویٰ، خدمت خلق خدا میں بلند مقام احسان پر فائز تھے۔ اور اُس کے اثرات آج بھی ان کے خاندان میں نظر آتے ہیں۔

حضرت اقدس کے ممدوح ممتاز عالم دین عظیم سوانح نگار مولانا محمد اسحاق بھٹی نے عامۃ المسلمین کیلئے ایک بلند کتاب تحریر کرکے آج کے دور کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ جبکہ مکتبہ سدید اسے زیور طبع سے آراستہ کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ مذکورہ کتاب اہل دل کے لئے احباب ذوق کے لئے مخلوق خدا کی اصلاح کے لئے بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوگی ان شاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ اسے شرفِ قبولیت سے نوازے۔ (آمین یارب العالمین)

قاری طاہر محمود، ایم اے وفاق

فاضل جامعہ اسلامیہ چاہ شاہاں گوجرانوالہ

مدرس شعبہ حفظ جامع مسجد رحمانیہ (مولانا غلام رسولؒ والی) قلعہ اسلام

گفتارِ اوّلیں

اہل ایمان کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ شدید محبت کرتے ہیں۔ والذین آمنوا اشد حبا للہ (البقرہ.165) اس کے جواب میں اللہ ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ اپنے بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرائیل کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو تو جبرائیل بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر جبرائیل آسمان پر اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو۔ سو اہل آسمان بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس کی محبت زمین پر اتار دی جاتی ہے (یعنی اہل زمین بھی اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں) (صحیح مسلم)

محبتوں کا یہ سلسلہ خدا کے اس محبوب بندے کی زندگی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی لوگ اس کو یاد کرتے ہیں۔ اس کا نام عزت واحترام سے لیتے ہیں۔

حضرت مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی خدا کے محبوب بندگان میں سے

تھے۔ مولانا سے عقیدت ومحبت کے اظہار کے لیے بندگانِ خدا کی ان کے مسکن قلعہ آمدورفت جاری رہتی ہے۔ ماضی قریب میں تین ایسی شخصیات تشریف لائیں جن کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔

عصر کی نماز سے فراغت کے بعد میں مسجد میں بیٹھا تھا کہ ایک بزرگ صورت شخص اٹھارہ بیس عقیدت مندوں کے ساتھ تشریف لائے۔ علیک سلیک کے بعد انھوں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں صوفی برکت علی کا خلیفہ مجاز اور داماد میاں منظور احمد ہوں۔ دارالاحسان فیصل آباد سے حاضر ہوا ہوں۔ میں نے احتراماً اٹھ کر ان سے معانقہ کیا اور انھیں تشریف رکھنے کے لیے کہا۔ انھوں نے بیٹھتے ہی مولانا غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ والہانہ عقیدت ومحبت کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا کہ سماں بندھ گیا۔ وہ منظر آج بھی نگاہوں کے سامنے ہے، رخصت ہوتے وقت حدیث کی کتاب ابن ماجہ، ایک جائے نماز، دوشربتِ بادام کی بوتلیں اور ایک ڈبہ مٹھائی کا عنایت فرمایا اور مجھ سے دارالاحسان آنے کا وعدہ لیا۔ کچھ دنوں بعد میں بھی حسب وعدہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے جس والہیت کے ساتھ میرا استقبال کیا اور اپنے مریدین سے تعارف کرایا، اس تصور سے اپنی کم مائیگی کے پیشِ نظر آج بھی جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے۔

کچھ عرصے بعد حضرت مولانا سید نفیس الحسینیؒ ہمارے گاؤں سے متصل ایک دوسرے گاؤں میں ایک دینی مدرسے کا سنگ بنیاد رکھنے اور دعاے خیروبرکت کے لیے تشریف لائے۔ ان کی خواہش پر مجھ ناچیز کو بھی اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ بندہ وہاں حاضر ہوا۔ حضرت شاہ صاحب میرے ساتھ جس محبت اور شفقت

سے پیش آئے، یہ ان کی حضرت مولانا غلام رسولؒ کے ساتھ عقیدت واحترام کا واضح ثبوت تھا۔ ان کی حالت بڑی عجیب تھی۔ دورانِ گفتگو جب بھی مولانا کا تذکرہ کرتے یا ان کا کوئی شعر پڑھتے تو ان کی آنکھوں سے آنسورواں ہو جاتے۔

ایک دن صوفی محمد عبداللہ صاحبؒ (ماموں کانجن ضلع فیصل آباد) کے جانشین حضرت مولانا صوفی عائش محمد صاحب عصر کی نماز کے بعد تشریف لے آئے۔ وہ قلعہ میں تھوڑی دیر ہی ٹھہرے، پھر واپس تشریف لے گئے۔ اگرچہ یہاں ان کے قیام کا وقفہ بہت مختصر تھا، لیکن ان کی سادگی، درویشی، اخلاقی بلندی اور پرُ خلوص محبت آج بھی یاد آتی ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

ہر آنے والے صالح فطرت مہمان کی طرف سے ایک ہی تقاضا ہوتا کہ مولاناؒ کی زندگی کے بارے میں کوئی کتاب یا ان کی سوانح عمری ہو تو ہمیں عنایت کریں، لیکن میرے پاس کچھ بھی نہ ہوتا۔ آنے والوں کا اشتیاق اور اصرار دیکھ کر ندامت کا شدید احساس ہوتا۔

حاجی محمد سعید طاہر میرے نہایت مخلص اور مہربان دوست ہیں۔ اولیائے کرام کی تاریخ اور شخصیات کے بارے میں معلومات کا مجسم انسائیکلو پیڈیا ہیں۔ مولانا غلام رسولؒ اور ان کے خاندان کے ساتھ والہانہ عقیدت ومحبت رکھتے ہیں۔ جب بھی ان سے اس موضوع پر بات ہوئی انھوں نے یہی مشورہ دیا کہ مولانا غلام رسولؒ کے حالات زندگی ازسرنو مرتب کیے جائیں جس سے موجودہ نسل یقیناً فائدہ اٹھائے گی اور اپنے اسلاف سے آگاہی حاصل کرے گی۔ محترم حاجی صاحب اور ان کے دوست چودھری صدیق احمد ایڈووکیٹ اس پر پیہم اصرار بھی کرتے رہے۔ ان کے مسلسل اصرار نے مجھ ناچیز

میں ایک عملی تحریک پیدا کر دی اور میں نے جتنا مواد دست یاب ہو سکتا تھا اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

حاجی محمد سعید طاہر نے اپنے ایک مخلص دوست، کتب کثیرہ کے مترجم اور بہترین مصنف مولانا محمد نذیر رانجھا سے مولانا مرحوم و مغفور کے فارسی مکتوبات کا اردو ترجمہ کروایا۔ محترم رانجھا صاحب نے اپنی ملازمت اور تصنیفی مصروفیات کے باوجود نہ صرف اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ ان میں سے ایک مشورہ یہ بھی تھا کہ اس عظیم کتاب کی تیاری اور ترتیب کے لیے ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جائے جو فنِ تاریخ کا ماہر اور تذکرہ نگاری میں ممتاز اور باکمال ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ اس عظیم تصنیفی کام کے لیے نہایت اہم شخصیت کا چناؤ بھی حاجی صاحب کی نگاہِ بصیرت کا کمال ہے۔ ان کی نگاہِ انتخاب مولانا محمد اسحاق بھٹی پر جا کر ٹھہر گئی۔ ہم تینوں دوست مولانا بھٹی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا سے اپنا تعارف کرایا اور مدعا بیان کیا۔ مولانا نے ہماری آمد پر نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ ہماری والہانہ طریقے سے آؤ بھگت کی اور کام کی بصد رضا و خوشی ذمہ داری قبول کر لی۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی ایک عبقری شخصیت، جید عالم دین، صاحبِ طرز ادیب اور کتب کثیرہ کے مصنف ہیں۔ ان کا غیر معمولی حافظہ ان پر اللہ رب العزت کا اضافی کرم ہے۔ زیرِ مطالعہ تصنیف کے لیے اگر مولانا بھٹی کا انتخاب نہ ہوتا تو یہ علمی اور تاریخی ورثہ اتنے خوب صورت اور عمدہ طریقے سے قارئین کرام تک نہ پہنچ پاتا۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے حضرت مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کے تمام واقعات کو نہایت دل نشین انداز اور انتہائی عمدگی کے ساتھ الگ الگ ابواب میں

ترتیب دیا ہے۔ فاضل مولف نے جس بے مثال عقیدت ومحبت اور جذبۂ اخلاص وایثار کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے، ان کے اور ان کے تمام معاونین کے لیے یقیناً یہ صدقہ جاریہ ہے۔

ناچیز کو یہ بھی اعتراف ہے کہ حضرت مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کے مفصل حالاتِ زندگی مرتب کرنے کا کام پہلے ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہر کام کی تکمیل کے لیے ایک وقت مقرر ہے، وہ وقت آیا تو کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

اس کتاب میں ایک جدت یہ کی گئی ہے کہ اس کے آخر کے چند ابواب حضرت مولانا غلام رسولؒ کے اخلاف کے متعلق تحریر کیے گئے ہیں، جن میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی، ان کے بھائیوں اور بیٹوں، بیٹیوں کی اولاد کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ ابواب برادر کبیر مولانا عصمت اللہ صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ اس میں انھوں نے نہایت دقیقہ نظری اور اعلیٰ ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے لیے انھیں بے انتہا محنت کرنی پڑی۔ عزیز واقارب سے بار بار رابطے کر کے اور ان کے پاس حاضری دے دے کر تمام معلومات اکٹھی کر کے اس کتاب میں سمودی ہیں۔ انھوں نے پوری کوشش کی ہے کہ کسی صاحب کا نام اندراج سے نہ رہ جائے۔ تاہم یہ انسانی کام ہے۔سہو ہوسکتا ہے لیکن اس میں نیت کا ہرگز ہرگز دخل نہیں۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو اس کی فوراً اطلاع راقم الحروف کو دیں تا کہ اس کی اصلاح دوسرے ایڈیشن میں کی جاسکے۔

ان ابواب کی شمولیت سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ایک دوسرے سے شناسائی ہوگی۔

آپس میں رابطے بڑھیں گے اور چھوٹی بڑی رشتہ داریاں از سرنو بحال ہوں گی۔ قرآن وحدیث میں صلہ رحمی کی از حد تاکید فرمائی گئی ہے جس پر عمل کے لیے خاندانی حسب ونسب کی پہچان اور اس کو محفوظ رکھنا انتہائی اہم ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائے۔

آخر میں خاکساران تمام اعزہ واحباب کا تہ دل سے ممنون ہے جنھوں نے اس کام کی تکمیل کی غرض سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ خصوصاً حکیم خبیب الرحمٰن اعوان کا شکرگزار ہوں، جنھون نے اپنی نئی کار کہیں بھی آنے جانے کے لیے وقف کردی اور ان کے برادر صغیر پروفیسر وحید الزمان قمر کا بھی انتہائی ممنون ہوں کہ جہاں ہم چاہتے لے جاتے رہے۔

برادرِ کبیر پروفیسر ملک محمد نسیم صاحب اور برادرِ صغیر علامہ محمد زبیر صاحب کا بھی از حد مشکور ہوں جنھوں نے کتاب کے متعلق خصوصی رہنمائی اور توجہ سے نوازا۔

میری دعا ہے کہ مولا کریم، رب رحیم نام ونمود کی خواہش سے ہمارے قلوب کو مطہر فرمائے اور خاندانی فخر وغرور کی ایمان لیوا مہلک بیماری سے محفوظ فرمائے۔ خلق خدا کے لیے اس تالیف کو ہدایت اور فیضان کا ذریعہ بنائے اور تمام اعزہ واحباب کو دارین میں بہترین اجر عطا فرمائے۔ آمین یارب العلمین۔

حمید اللہ سدید قلعوی

قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام)۔ ضلع گوجراں والا

20۔ شوال المکرّم 1431ھ

بمطابق 30۔ ستمبر 2010ء

حرفے چند

میں 1942 میں گوجراں والا میں حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں شامل تھا۔ میری عمر اس وقت سترہ سال کی تھی۔ ایک دن پتا چلا کہ آج موضع قلعہ میہاں سنگھ (اب قلعہ اسلام) میں مجلس احرار کا جلسہ ہوگا اور قلعہ میہاں سنگھ (اب قلعہ اسلام) یہاں سے سات میل کے فاصلے پر ہے۔ اساتذہ سے چھٹی لے کر بہت سے طلبا جلسہ سننے قلعہ میہاں سنگھ (اب قلعہ اسلام) کو چل پڑے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ کچا راستہ...... تانگوں پر بھی لوگ جا رہے تھے اور پیدل بھی۔ ہم پیدل جانے والوں میں تھے۔ مہینا معلوم نہیں کون سا تھا، البتہ یہ یاد ہے کہ موسم معتدل تھا۔ نہ گرمی، نہ سردی۔ جوانی اور صحت بھی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، ہنستے کھیلتے اور دوڑتے ہوئے ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ تقریر صاحب زادہ فیض الحسن نے کی تھی جو اس زمانے میں مجلس احرار کے مشہور رہنما اور مقرر تھے۔

اُس دور کے قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) کی دو باتیں مجھے یاد ہیں۔ ایک یہ کہ جلسہ گاہ کے قریب ایک جوہڑ تھا، جس میں ڈھور ڈنگر پانی پی رہے تھے اور وہاں

درخت بھی تھے۔ سامعین درختوں کے سائے میں بیٹھے تھے۔ درختوں کے سائے میں ہی سٹیج بنایا گیا تھا۔

دوسری یہ بات ذہن میں محفوظ ہے کہ جس مسجد میں ہم نے نماز پڑھی، وہ مسجد سطحِ زمین سے کافی اونچی تھی۔

نمازِ عصر تک جلسہ ہوا اور پھر ہم واپس آ گئے۔

گوجراں والا میں میرا زمانۂ طالب علمی دو سالوں (1941ء اور 1942ء) پر محیط ہے۔ 1941ء میں 1940ء کے کچھ دن بھی شامل ہیں اور 1942ء کے کچھ دن کم ہیں۔ اس زمانے میں گوجراں والا کے متعدد لوگوں سے سنا کہ قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) میں ایک بہت بڑے عالم سکونت پذیر تھے، جن کا نام مولوی غلام رسول تھا۔ وہ صاحبِ کرامات بزرگ تھے اور اللہ ان کی دعائیں قبول فرماتا تھا۔ استاذِ مکرم مولانا محمد اسماعیل سلفی بھی بعض اوقات ان کے تقوے اور خدماتِ دینی کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔

مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کی وفات 1874ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت ان کی وفات پر پینسٹھ چھیاسٹھ سال کا عرصہ گزرا تھا، اور کچھ لوگ موجود تھے، جنھوں نے ان کو دیکھا تھا اور ان سے میل جول اور ان کے وعظ سننے کے مواقع انھیں میسر آئے تھے۔ مجھے پہلی دفعہ اسی زمانے میں حضرت رحمہ اللہ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ان سے متعلق باتیں سن کر ذہن میں آتا تھا، کاش میں نے بھی ان بزرگ کو دیکھا ہوتا اور ان سے اپنے لیے دعائیں کرائی ہوتیں۔ یہ ایک معصوم سی خواہش تھی۔ اس قسم کی بہت سی خواہشیں ہمارے جیسے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

اس کے بعد وقت گزرتا گیا اور زمانہ خاص رفتار کے ساتھ اپنا سفر طے کرتا گیا۔ پاکستان معرضِ قیام میں آ گیا اور ملک کا جغرافیہ بدل گیا۔ ہم لوگ اپنا آبائی وطن چھوڑ کر پاکستان کے ضلع لائل پور (اور اب فیصل آباد) کے ایک گاؤں میں آ بسے۔

وقت نے پھر کروٹ لی اور میں لاہور آ گیا۔ یہاں غالباً 1962ء میں ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ نکلتا ہوا قد، گندمی رنگ، گول چہرہ، مناسب نقش ونگار، ملنسار، مقررانہ لہجہ، خوش لباس اور خوش کلام۔ پتا چلا کہ ان کا نام سلیم تابانی ہے اور مولانا غلام رسول قلعوی کے قریب ترین اخلاف میں سے ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے احترام آمیز محبت کے جذبات ابھرے اور ان سے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ میں اس زمانے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں خدمت ادارت انجام دینے پر مامور تھا اور روزنامہ ''امروز'' میں ہفتے میں دو دن مضمون لکھا کرتا تھا۔ ''امروز'' اس عہد کا بہت بڑا اخبار تھا۔ سلیم تابانی سے پہلی ملاقات اسی اخبار کے دفتر میں ہوئی تھی۔ یہ حافظِ قرآن تھے۔ پورا نام حافظ محمد سلیم تھا۔ سلیم تابانی قلمی نام تھا۔

پھر وقت نے ایک اور پلٹا کھایا اور مَیں 1965ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو گیا۔ اس زمانے کے ادارہ ثقافت اسلامیہ کو مرکزِ تحقیق اور مجمعِ اہل علم کی حیثیت حاصل تھی۔ میں نے وہاں ''فقہائے ہند'' کے نام سے کتاب لکھنا شروع کی جو پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک دس جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ کم وبیش چار ہزار صفحات پر مشتمل یہ کتاب حروفِ تہجی کی ترتیب سے لکھی گئی ہے اور برصغیر کے کئی ہزار علما و فقہا کے حالات اس میں آ گئے ہیں، کسی کے تفصیل سے اور کسی کے اختصار سے۔!

ایک روز میرے دوست سلیم تابانی مرحوم میرے پاس ادارہ ثقافتِ اسلامیہ آئے۔ باتیں کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ تم نے فقہائے ہند کی مختلف جلدوں میں بے شمار لوگوں کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ہمارے مولوی صاحب پر کچھ نہیں لکھا، اس کی کیا وجہ ہے؟ (حضرت مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے خاندان میں ''مولوی صاحب'' کہا جاتا ہے۔) حسنِ اتفاق سے میں اس وقت فقہائے ہند کی دسویں جلد کے ان علما وفقہا کے حالات لکھ رہا تھا، جن کے نام حرف غین سے شروع ہوتے ہیں اور یہ تیرھویں صدی ہجری کے بزرگانِ گرامی قدر تھے، جن میں مولانا غلام رسول بھی شامل تھے۔ میں نے وہ کتاب بھی کہیں سے حاصل کر لی تھی جو ''سوانح حیات مولانا غلام رسول'' کے نام سے ان کے فرزند کبیر مولانا عبدالقادر نے لکھی۔ میں نے سلیم تابانی سے کہا کہ چند روز تک فقہائے ہند کی وہ جلد چھپ جائے گی، جس میں مولانا غلام رسول کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ لیکن اس کی اشاعت میں کچھ تاخیر ہوگئی اور یہ 1989ء کے ماہ جون میں چھپی۔ اس کی دو یا تین کاپیاں جلد ساز سے میرے پاس آئی تھیں کہ سلیم تابانی تشریف لے آئے۔ وہ ان دنوں روزنامہ ''نوائے وقت'' سے منسلک تھے۔ کتاب میں اپنے ''مولوی صاحب'' کے حالات دیکھ کر نہایت مسرت کا اظہار کیا اور جتنی کاپیاں میری میز پر پڑی تھیں، اٹھا کر لے گئے۔ اس کتاب میں مولانا غلام رسول کے متعلق میرا مضمون تقریباً ساٹھ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

بہر حال ابتدا میں میرا تعارف اس خاندان کے جس فرد سے ہوا، وہ سلیم تابانی تھے۔ اس کے بعد مولوی ثناء اللہ صاحب سے جان پہچان ہوئی، جو شیش محل روڈ پر رہتے تھے۔ اخبار ''الاعتصام'' کا دفتر بھی وہیں تھا، جس کا میں ایڈیٹر تھا۔ اور مولوی ثناء

اللہ صاحب کی وہاں آمدورفت رہتی تھی۔ لیکن سلیم تابانی سے جلد ہی گہرے مراسم پیدا ہوگئے تھے۔ پھر تیسرے شخص جن سے تعلقات استوار ہوئے، وہ مولانا غلام رسول کے پڑپوتے ملک عصمت اللہ صاحب ہیں جو کئی سال سے مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور سے وابستہ ہیں اور اب ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے منصبِ ادارت پر فائز ہیں۔

اب وہ واقعہ سنیے جو زیر مطالعہ کتاب ''تذکرہ مولانا غلام رسول قلعوی'' کی تصنیف کا باعث ہوا۔

2009ء کے جون کا مہینا تھا اور ساڑھے گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ دن مجھے یاد پڑتا ہے اتوار کا تھا کہ تین حضرات میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ تینوں شلوار قمیص میں ملبوس۔ متشرع چہرے اور معززانہ وضع قطع۔ لیکن میں ان تینوں لائق احترام حضرات سے متعارف نہیں تھا۔ سلام دعا کے بعد ان میں سے ایک صاحب نے قدرے اپنایت آمیز بے تکلفانہ لہجے میں مجھے اپنے پاس بیٹھنے کے لیے فرمایا۔ شدید گرمی کا وقت تھا، میں نے عرض کیا، پہلے پانی پی لیجیے، پھر آپ کے پاس بیٹھوں گا اور بات چیت ہوگی۔ پانی پی چکے تو میں ان صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ انھوں نے فرمایا ہم تینوں گوجراں والا سے آئے ہیں۔ میرا نام محمد سعید طاہر ہے اور میں دیوبندی مسلک کے عالم مولانا محمد سرفراز خاں صفدر گکھڑوی کے اسلوبِ فکر سے تعلق رکھتا ہوں۔ دوسرے صاحب کی طرف اشارہ کرکے ارشاد ہوا کہ یہ چودھری صدیق احمد ایڈووکیٹ ہیں اور انکم ٹیکس کے سلسلے کے گوجراں والا کے مشہور وکیل ہیں۔ تیسرے صاحب کے متعلق بتایا کہ ان کا اسم گرامی حافظ حمید اللہ ہے اور یہ حضرت مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ (قلعہ میہاں سنگھ والے) کے پڑپوتے ہیں۔ مجھے ان حضراتِ ثلاثہ

کی تشریف آوری پر بے حد مسرت ہوئی اور مولانا غلام رسول کے پڑپوتے حافظ حمید اللہ کو دیکھ کر جی میں مزید خوشی کی لہر ابھری، اس لیے کہ وہ علم و صالحیت کی ایک عظیم اور فرحت انگیز داستان کی زندہ یادگار ہیں۔ بے ساختہ منہ سے نکلا: سبحان اللہ! کیڑی کے گھر نارائن آ گیا اور ساتھ ہی عرض کیا کہ اس شدید تریں گرم موسم میں اس گوشہ گیر فقیر کو کیسے یاد فرمایا۔

حافظ محمد سعید طاہر نے فرمایا ہم اس لیے آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ حضرت مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کتابی شکل میں لکھیں۔ اب حافظ حمید اللہ صاحب نے مجھے تین کتابیں دیں۔ ایک سوانح حیات مولانا غلام رسول (تصنیف مولانا عبدالقادر) دوسری پچاس پچپن صفحات کی چھوٹے سائز پر چھپی ہوئی مولانا غلام رسول کی پنجابی نظموں کی کتاب اور تیسری ان کی کچھ قلمی تحریریں جو کتابی صورت میں مجلد ہیں۔ یہ مجلد تحریریں چار سو صفحات کے لگ بھگ ہوں گی۔

میں نے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اس فقیر کو اس اہم کام کا اہل سمجھا اور عرض کیا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مختلف تصنیفی کاموں میں بہت مصروف ہوں۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ حضرت مولانا غلام رسول سے متعلق اپنی کتاب فقہائے ہند کی ایک جلد میں مضمون لکھ چکا ہوں۔

انھوں نے جواب دیا کہ وہ مضمون ہم نے پڑھا ہے۔ وہ مختصر مضمون ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مولانا ممدوح کے متعلق خاص انداز و ترتیب کے ساتھ تفصیل سے لکھا جائے۔ ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ آپ قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) کا چکر لگائیں اور وہ قصبہ اور مولانا کی مسجد دیکھیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ بعض حضرات نے

ہمیں مشورہ دیا ہے کہ مولانا کے حالات آپ ہی سے لکھوائے جائیں۔ ظاہر ہے یہ میرے لیے خوشی کی بات تھی اور میں نے یہ خدمت سرانجام دینے کا وعدہ کیا۔

اس کے چند روز بعد مولانا غلام رسول کے بڑے پڑپوتے اور حافظ حمید اللہ صاحب کے برادرِ کبیر ملک عصمت اللہ مجھے قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) لے گئے۔ حافظ محمد سعید طاہر صاحب کو بھی گوجراں والا سے بلالیا گیا۔ چودھری صدیق احمد ایڈووکیٹ سے بھی ٹیلی فون پر تشریف لانے کے لیے کہا گیا لیکن وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہیں آسکے۔

وہاں میں نے مولانا مرحوم ومغفور کی مسجد بھی دیکھی جواب کافی وسیع ہوچکی ہے۔ اس میں ظہر اور عصر کی نمازیں پڑھیں۔ ان کے منبر کی زیارت بھی کی، جس پر بیٹھ کر وہ وعظ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ان کا وہ حجرہ بھی دیکھا، جس میں وہ لوگوں کو ذکر واذکار کی تلقین کیا کرتے تھے۔

مسجد اور حجرے کی ہیئت اگرچہ بدل چکی ہے تاہم انھیں دیکھ کر اور وہاں گھوم پھر کر جی میں عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔ منبر کی شکل بھی وہ نہیں رہی، لیکن یہ وہی منبر تھا، جس پر عالم رؤیا میں ان کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بٹھایا تھا اور فرمایا تھا کہ یہاں بیٹھ کر لوگوں کو دینِ اسلام کی تبلیغ کیا کریں۔ یعنی اس اعتبار سے وہ مامور تھے۔ اس منبر کی نیچے کی لکڑی تو وہی ہے جس پر مولانا بیٹھ کر خطبۂ جمعہ دیا کرتے اور وعظ فرمایا کرتے تھے، لیکن وہ لکڑی بہت پرانی ہوچکی تھی، اس لیے نئی لکڑی لگا کر اس کی مرمت کی گئی ہے۔ میرا خیال ہے بہتر یہ تھا کہ اس پرانے منبر کو بہ طور یادگار اسی طرح رہنے دیا جاتا اور نیا اور منبر بنالیا جاتا۔

باب المدینہ

باب الکعبہ
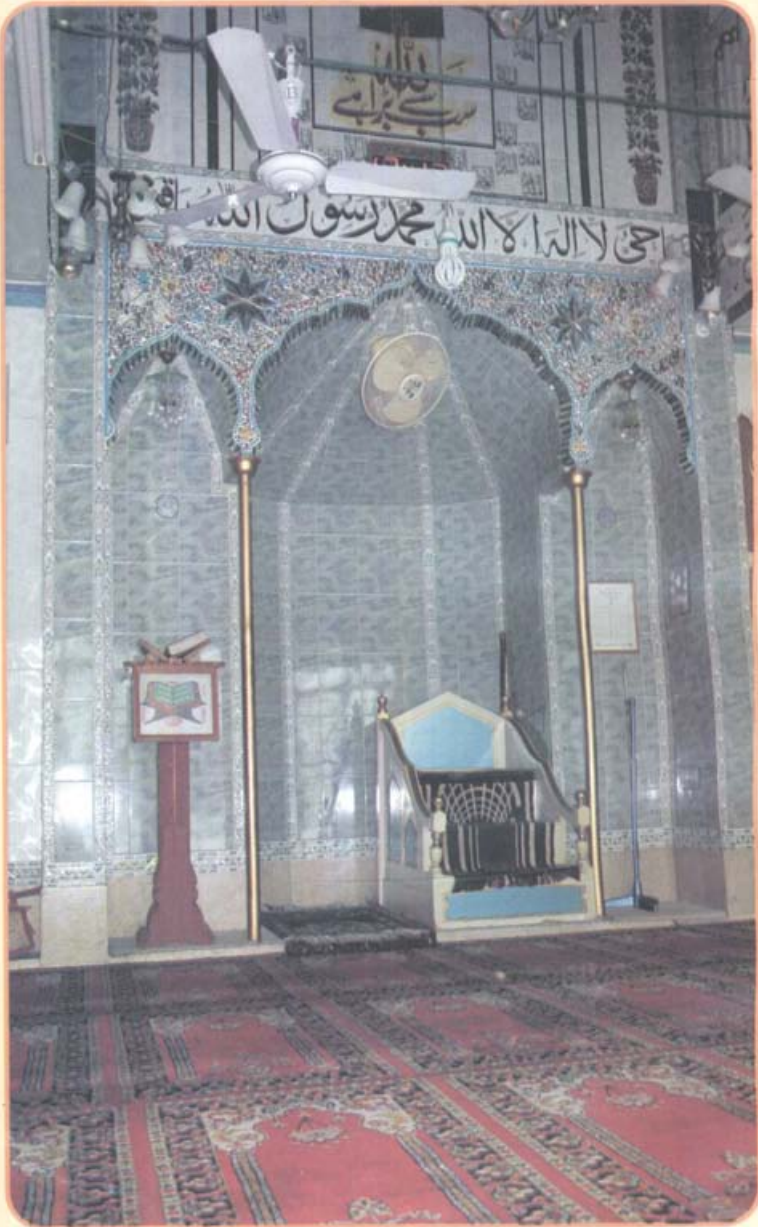
مسجد کے منبر ومحراب کا منظر

مسجد کا حجرہ

ہم اس خاندان کے قبرستان میں بھی گئے۔ وہاں مولانا کے مرقد اور دیگر حضرات کی قبروں پر دعائے مغفرت کی۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کا زمانہ متحدہ ہندوستان کا زمانہ تھا۔ مسلمان، سکھ، ہندو، عیسائی، چمار اور اچھوت وغیرہ اکٹھے زندگی بسر کرتے تھے۔ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان وہ مقابلے کا دور تھا۔ اس وقت مسلمان ملک کے بہت سے علاقوں میں مالی اعتبار سے تو بے شک کم زور تھے، لیکن علمی اور مذہبی اعتبار سے ان کی حیثیت مضبوط تھی۔ ہندوؤں کے مختلف فرقوں (آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں وغیرہ) سے ان کے مذہبی جھگڑوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ باہم مناظرے بھی ہوتے تھے، لیکن مسلمان علماً مناظروں میں کامیاب رہتے تھے۔ اس کے نتیجے میں بعض مقامات کے غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہوجاتے تھے۔ اس طرح مناظروں کا سلسلہ مسلمانوں کی افرادی تقویت کا باعث بنتا تھا۔ اس کا ثبوت حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے مناظروں سے ملتا ہے۔ انھوں نے بہت سے ہندو اور عیسائی مناظروں سے مناظرے کیے اور ہر مناظرے میں کامیاب رہے، جس کے نہایت اچھے نتائج نکلے۔

مناظروں کے علاوہ بعض مسلمان اہل علم کی تقریروں اور وعظوں سے اثر پذیر ہو کر بھی غیر مسلم اسلام قبول کر لیتے تھے۔ خود مولانا غلام رسول کے مواعظ سے بے شمار غیر مسلمان حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ (جیسا کہ آئندہ صفحات سے پتا چلے گا)۔

اُس وقت برصغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی اور وہ نہایت سخت مزاج حکمران تھے۔ بالخصوص مسلمانوں اور مسلمانوں میں بھی علما سے ان کا رویہ ہمیشہ متشددانہ اور متعصبانہ رہا۔ صالح فطرت علماء نے بھی ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، جس کے نتیجے میں ان کو تشدد کا

نشانہ بنایا گیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد تو ان سے بے حد سختی کا برتاؤ کیا گیا، انھیں گرفتار کیا گیا، جیلوں میں بند کیا گیا، کالے پانی بھیجا گیا، کتنے ہی علماء کو پھانسی دے دیا گیا۔ مولانا غلام رسول کو بھی گرفتار کیا گیا، گھر میں نظر بند کیا گیا اور ان کے وعظ پر پابندی لگادی گئی۔ ایک عرصے کے بعد یہ پابندی اور نظر بندی ختم ہوئی اور انھیں وعظ وتقریر کی اجازت ملی۔ اس دور کے علمائے کرام نہایت مستقل مزاج اور اسلام کے مخلص ترین مبلغ تھے۔

اس موضوع سے متعلق موقع کی مناسبت سے میں نے کتاب کے ایک باب میں 1857ء کی جنگ آزادی کے وجوہ واسباب کا تذکرہ کردیا ہے اور مختصر الفاظ میں بتا دیا ہے کہ یہ جدوجہد کیوں شروع ہوئی؟ اس میں اس دور کے معاشرے کے کن کن لوگوں نے حصہ لیا اور کیوں لیا؟ پھر اس کا انجام کیا ہوا اور اس میں حصہ لینے والوں کو کس سزا کے مستوجب قرار دیا گیا؟

مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ مستجاب الدعوات اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ ان کی قبولیتِ دعا اور کرامتوں کے بے شمار واقعات مشہور ہیں جو پہلی مرتبہ ان کے بڑے بیٹے مولانا عبدالقادر نے اپنی کتاب ''سوانح حیات مولانا غلام رسول'' میں بیان کیے۔ یہ کتاب آج سے کم وبیش اسّی (80) برس قبل شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی چھپی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور بہت پڑھی گئی۔ مولانا غلام رسول کے بارے میں اولیں ماخذ یہی کتاب ہے۔ میں نے اپنی کتاب فقہائے ہند (مطبوعہ 1989ء) میں ان کی بعض کرامتیں اسی کتاب کے حوالے سے لکھی ہیں۔

یاد رہے دنیا اللہ کے صالح بندوں سے کبھی خالی نہیں رہی۔ بعض لوگوں کو بزرگانِ

دین کی کرامات اور قبولیتِ دعا کے واقعات پر اعتراض کرنے کی عادت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب لوگ ہماری طرح کے بے عمل ہیں، جس طرح ہماری دعا قبول نہیں ہوتی، اسی طرح کسی کی بھی نہیں ہوتی۔

میری گزارش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کی دعائیں قبول فرماتا ہے۔ ان کی بھی قبول فرماتا ہے جو قبولیتِ دعا پر اعتراض کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا عام اعلان ہے، جسے حکم کا درجہ حاصل ہے۔

﴿وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المومن:60)

"اور تمھارے پروردگار کا فرمان ہے کہ مجھ سے دعا کرو، میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔"

جو لوگ اللہ کو پکارنے اور اس کی عبادت کرنے سے انکاری ہیں، ان کے لیے دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے۔ چنانچہ اسی آیت میں ارشاد ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾ (المومن:60)

"بے شک جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں، وہ ضرور ذلیل ہو کر جہنم میں جائیں گے۔"

اس سے آگے فرمایا:

﴿هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (المومن:65)

"وہ اللہ زندہ ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، تم خالص اسی کو

پکارو۔"

اگر کسی کو اللہ سے مانگنے اور اس کی بارگاہ میں دعا کرنے کا طریقہ آتا ہے تو وہ ضرور اللہ سے انتہائی اخلاص اور خشوع وخضوع سے دعا کرے گا اور اس کی دعا قبول ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا واضح الفاظ میں ارشاد ہے۔

﴿اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا﴾

(البقرہ: 186)

"جب کوئی دعا کرنے والا مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں، لوگوں کو بھی چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔"

گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے حضور جو شخص دست دعا دراز کرتا اور گڑگڑا کر اس سے مانگتا ہے، اپنی جائز ضرورتوں کے لیے اس سے سوال کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے لازماً دیتا ہے۔ چنانچہ مولانا غلام رسول اپنے رب کے سامنے جھکتے اور عاجزانہ انداز میں اس سے مانگتے تھے اور اللہ ان پر خوش ہوتا اور ان کی التجا قبول فرماتا تھا۔

مولانا ممدوح ہمیشہ صالحین کی تلاش میں رہے اور انھوں نے پوری زندگی اصحاب تقویٰ کی صحبت میں بسر کی۔ وہ صالحین کون تھے؟ وہ تھے ان کے استاذ مکرم میاں سید نذیر حسین دہلوی، سید محمد امیر (کوٹھا والے) حضرت سید عبداللہ غزنوی، سید امام عبدالجبار غزنوی، مولانا محی الدین عبدالرحمن لکھوی، حافظ عبدالمنان وزیرآبادی، مولانا رحیم بخش لاہوری اور ان کی طرح کے دیگر حضرات گرامی۔

انھیں اصحاب تقویٰ سے ملنے اور ان سے فیض حاصل کرنے کا انتہائی شوق تھا، جہاں کسی نے کسی نیک آدمی کے بارے میں بتایا وہ اس کے پاس پہنچے، لیکن متاثر انھی

اوصاف کے حاملین سے ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اہل بدعت اور تارکینِ کتاب وسنت مدعیانِ تصوف سے انھوں نے کبھی تعلق نہیں رکھا۔ ان سے ہمیشہ نفرت کا اظہار کیا۔

مولانا غلام رسول قلعوی رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات ابدال سے بھی رہی اور مجذوبوں سے بھی۔ یہ بھی صالحین واتقیا کی جماعتیں ہیں۔ اس سلسلے کی تفصیل کا مجھے علم نہیں، اور بھی بہت لوگ اس سے آگاہ نہیں ہوں گے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس چیز کی حقیقت کا ہم علم نہیں رکھتے، اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابدال بھی موجود ہیں اور مجذوب بھی۔ ان کا ذکر صلحاو اتقیا کے تذکروں میں آتا ہے۔ ان کی عادات و اطوار اور حرکات وسکنات کے بھی کچھ قصے مشہور ہیں جو عام لوگوں سے مختلف نوعیت کے ہیں۔ مولانا غلام رسول قلعوی کا ان سے تھوڑا یا زیادہ تعلق رہا ہے۔

مولانا ممدوح شاعر بھی تھے۔ انھوں نے فارسی میں بھی شعر کہے اور پنجابی میں بھی۔ ان کے عربی شعروں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ ان کے پنجابی اشعار کا تعلق اس دور سے ہے، جب وہ مروجہ تعلیم سے فارغ ہو کر ایک خاص جذبے کے تحت اصحابِ تقویٰ کی تلاش میں مشغول تھے اور لوگوں کی نشان دہی پر دیوانہ وار مختلف مقامات کے چکر لگا رہے تھے۔ صوفیا کی بولی میں کہنا چاہیے کہ وہ ایک عاشقِ زار کی طرح نہایت بے تابی کے عالم میں محبوب کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے سی حرفی لکھی۔ اس عہد میں سی حرفیاں لکھنے کا عام رواج تھا جو حرفِ الف سے شروع ہو کر حرف ی تک چلتی تھیں۔ ہر حرف کے مطابق شعر کا آغاز ہوتا تھا۔ پھر چار مصرعے مکمل ہونے کے بعد دوسرا حرف لایا جاتا تھا۔ مثلاً:

الف: اٹھ جیا کچھ فکر کریے تیرے ستیاں رین وہا گئی آ۔

اس سے اگلے تین مصرعے اسی قافیہ اور ردیف کے ہیں۔

ب: بس سیو میرے وس ناہیں واری اپنی اپنی جاونا ایں۔

د: درداں دی اٹھ کے آہ ماریں کیہی ستیاں عمر گزار یائی۔

سی حرفی کا آخری بند ''ی'' سے شروع ہوتا ہے۔

ی: یاد ناہیں ذرا گور تینوں جس راہ اکلیاں جاونا ایں۔

اس طرح پوری سی حرفی (یعنی تیس حرفوں والے اشعار) کا سلسلہ چلتا ہے۔ لیکن مولانا غلام رسول کی سی حرفی اٹھائیس حروف پر ختم ہو جاتی ہے۔

مولانا غلام رسول کے علاوہ مولوی عبدالستار، ہدایت اللہ اور دلپذیر وغیرہ شاعروں کی سی حرفیاں بھی ہیں۔ پنجابی کی یہ سی حرفیاں کسی زمانے میں بہت پڑھی جاتی تھیں۔ اب ان کا رواج نہیں رہا۔ ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز میں سی حرفی لکھی۔ سی حرفی کے آخری مصرعے میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے۔ مولانا غلام رسول اپنا تخلص غلام استعمال کرتے ہیں۔ شعری نقطہ نظر سے ان کی سی حرفی کی کیا حیثیت ہے، اس کا مجھے علم نہیں، لیکن شرعی نقطۂ نظر کے عین مطابق ہے اور ناصحانہ انداز کی ہے۔ اس کے ہر بند میں اللہ سے ڈرایا گیا ہے، نیک اعمال کی تلقین کی گئی ہے۔ موت اور قبر و قیامت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

حرف ت کا مربع بند ملاحظہ ہو۔

ت: تک رہیاں دلا غافلا وے توں تے کھیڈ توں باز نہ آونائیں

جھناں راہاں توں رب نے منع کیتا واگاں توڑ اونھاں ول جاونائیں

تینوں موت وی غافلا ہٹک رہی ذرا دیکھ توں کیا کما ونائیں

اج خیر دے عمل غلام کر لے بھلکے اٹھ جہان توں جا ونائیں

سی حرفی کے بعد پنجابی نظم کی کتاب میں مولانا نے نبی ﷺ کے حلیہ مبارک اور شمائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے بارے میں چند اشعار ہیں۔ آگے نعت آنحضرت ﷺ مرقوم ہے اور پھر اپنے آباد و اجداد اور بھائیوں کا تذکرہ ہے۔ یہ تمام اشعار ایک خاص انداز اور جذبے کے ساتھ لکھے گئے ہیں جو بے حد موثر اور بہت سے واقعات پر مشتمل ہیں۔

ان اشعار میں چرخہ اور سوت کا ذکر بھی ہے۔ اشعار کتاب کے آئندہ صفحات میں مرقوم ہیں۔ یہاں بھی بطور نمونہ چند اشعار پڑھ لیجیے۔

تغافل نال گزری عمر ساری

گیاں سیاں رہیاں کھڑی بیچاری

نہ میں جاگ چرخے تند پائی

تمامی رات سونے میں گوائی

گیاں سیاں کویلے سار ہوئی

کسے جا ہک نہیں ملدی ہے ڈھوئی

کیا کرساں جو بھلکے کات منکسن

اجل دی جنج بوہے آن ڈھوسن

کسی زمانے کے پنجاب میں چرخہ کاتنا پنجابی خواتین کی ثقافت کا دلچسپ حصہ تھا۔

سردیوں کی راتوں میں بالخصوص جوان عمر لڑکیاں چرخہ کاتتی ہوئی قسم قسم کی باتیں کرتی اور لوک گیت گاتی تھیں۔ پرانی پنجابی شاعری میں چرخے کا اکثر ذکر آتا ہے۔ مولانا غلام رسول نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ میں نے پوری زندگی غفلت میں گزار دی، کوئی نیک کام نہیں کیا۔ کل کو موت کا فرشتہ آیا اور میری زندگی ختم ہوگئی تو قبر میں منکر نکیر پوچھیں گے کہ بتاؤ تم نے کیا نیکی کے کام کیے؟ میں اس کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکوں گا۔ میں نے تو کوئی اچھا کام کیا ہی نہیں، ساری رات یعنی تمام زندگی فضول کاموں میں بسر ہوئی۔

نہ میں جاگ چرخے تند پائی

تمامی رات سونے میں گوائی

ان کے کلام میں مختلف مقامات پر چرخہ کاتنے کا ذکر آتا ہے۔ اگر چرخہ نہیں کاتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نیک عمل نہیں کیے۔ اگر کاتا ہے تو اس کے معنی ہیں کہ نیک عمل کیے ہیں۔ جس طرح چرخہ کاتنے والی لڑکی سے اس کے ماں باپ خوش ہوتے ہیں اور اس کے کاتے ہوئے سوت سے کھدر کے کپڑے بنائے جاتے ہیں، اسی طرح اچھے کام کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور اس کے بدلے میں اسے جنت دی جاتی ہے۔ پھر جس طرح چرخہ نہ کاتنے والی سے ماں باپ ناراض ہوتے ہیں، اسی طرح اعمالِ خیر نہ کرنے والے پر اللہ تعالیٰ خفگی کا اظہار فرماتا ہے۔ یعنی چرخہ کاتنا کنایہ ہے، نیکی سے اور چرخہ نہ کاتنا، کنایہ ہے، برائی سے!

اردو کتاب میں تھوڑے یا زیادہ پنجابی اشعار درج کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا، لیکن مولانا غلام رسول رحمہ اللہ نے وعظ وتقریر میں ذریعۂ اظہار چوں کہ پنجابی کو قرار دیا تھا

اور ان کے اصل مخاطب پنجاب کے لوگ تھے، اور اس وقت پنجاب کے قصبات ودیہات بلکہ شہروں میں بھی زیادہ تر پنجابی بولی جاتی تھی، آج کل کی طرح اردو بولنے کا زیادہ رواج نہ تھا، پھر وہ پنجابی کے شاعر بھی تھے، اس لیے وہ لوگوں کو پنجابی زبان میں خطاب فرماتے تھے اور وعظ میں مناسب مواقع پر پنجابی شعر بھی پڑھتے تھے اور شعر خالص اصلاحی قسم کے تھے، لہٰذا ہمیں ان کے حالات پر مشتمل کتاب میں ان کے بہت سے اشعار درج کرنا پڑے ہیں۔ کتاب میں ان کے اشعار کے اندراج سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان کا ارشادفرمودہ یہ شعری ذخیرہ کسی حد تک محفوظ ہو جائے۔

مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرۂ حیات کا ایک حصہ ان کے مکتوبات سے تعلق رکھتا ہے جو انھوں نے متعدد حضرات کے نام تحریر فرمائے۔ ان کے تمام مکتوبات تو محفوظ نہیں رہ سکے، البتہ جن مکتوبات تک ہماری رسائی ہوئی، وہ وہی ہیں جو ان کے صاحب زادے مولانا عبدالقادر نے ان کے سوانح حیات میں درج کیے ہیں۔ یہ تمام مکتوبات فارسی زبان میں ہیں اور ان میں فارسی اشعار کثرت کے ساتھ مندرج ہیں۔ ان میں خود ان کے اپنے اشعار بھی ہیں اور دیگر حضرات کے بھی۔!

ان فارسی مکتوبات اور اشعار کا اردو ترجمہ حافظ محمد سعید طاہر صاحب کے کہنے پر ان کے دوست جناب مولانا نذیر احمد رانجھا صاحب نے کیا۔ اب فارسی جاننے والے بہت کم لوگ ہوں گے۔ یہ بڑی اہم خدمت ہے جو محترم مولانا نذیر احمد رانجھا صاحب نے حافظ محمد سعید کی فرمائش پر انجام دی۔ اس پر ان دونوں حضرات کا بہت بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

اب ان مکتوبات اور اشعار کے بارے میں ایک اور بات سنیے۔!

ایک روز میرے قابلِ احترام دوست مولانا عارف جاوید محمدی نے (جو کویت میں قیام فرما ہیں) مجھے کویت سے ٹیلی فون کیا کہ سنا ہے تم مولانا غلام رسول قلعوی کے حالات لکھ رہے ہو۔

میں نے عرض کیا، میں یہ خدمت انجام دے رہا ہوں، لیکن معلوم نہیں، اس میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

انھوں نے فرمایا کہ میں اس سلسلے میں تمھیں ضروری مواد بھجوا رہا ہوں۔

چند روز کے بعد ان کی طرف سے جو مواد مجھے موصول ہوا، وہ حسب ذیل تھا۔

❁ مولانا غلام رسول قلعوی رحمۃ اللہ علیہ کے فارسی مکتوبات اور ان کے اشعار کا اردو ترجمہ جو دہلی کے مولانا ابوالکلام احمد صاحب نے کیا اور یکم جنوری 2010ء (14۔محرم 1431ھ) کو انھوں نے دہلی سے مولانا عارف جاوید محمدی کی خدمت میں کویت بھیجا۔

❁ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ سند جو انھوں نے مولانا غلام رسول قلعوی کو عنایت فرمائی۔

❁ مولانا غلام رسول کے ہاتھ کی تحریر فرمودہ سورہ فاتحہ اور چند قرآنی آیات۔

❁ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کا مکتوبِ گرامی جو انھوں نے بہ زبان فارسی مولانا غلام رسول کو ان کے ایک خط کے جواب میں ارسال فرمایا۔ ساتھ ہی اس کا اردو ترجمہ۔

حضرت میاں صاحب، مولانا غلام رسول کے استاذ ہیں، لیکن وہ اپنے اس شاگرد کو بے حد احترام سے خطاب فرماتے ہیں اور معذرت کرتے ہیں کہ وہ سستی اور عدمِ

فرصت کی وجہ سے انھیں خط نہیں لکھ سکے۔

مولانا ممدوح صاحب کرامات بزرگ تھے اور اسے بھی ان کی کرامت ہی سے تعبیر کرنا چاہیے کہ اس فقیر نے ان کے حالات میں کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حالات سازگار بنا دیے اور غیر متوقع طور پر کویت اور دہلی کے دور دراز ملکوں میں رہنے والے اہل علم نے بھی اس سلسلے میں میری مدد فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزاے خیر سے نوازے۔

اب اس سلسلے کے دو خط ملاحظہ ہوں۔

پہلا خط مولانا عارف جاوید محمدی کا ہے جو انھوں نے مجھے مرکز دعوۃ الجالیات (کویت) سے 23۔اپریل 2010ء کو ارسال فرمایا۔ مولانا عارف جاوید محمدی کو بزرگانِ دین کے حالات، ان کی دینی خدمات اور ان کے خطوط اور ان کی اسناد سے بے حد دلچسپی ہے۔ لکھتے ہیں:

حضرت محترمی و مخدومی مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خیریتِ طرفین مطلوب ۔ حضرت مولانا غلام رسول قلعوی علیہ الرحمہ کے نام حضرت میاں صاحب کا مکتوب گرامی اور اجازہ میں نے حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی بخاری شریف کے آخر میں دیکھا ہے۔ اس کے ساتھ مولانا عبدالغنی مجددی کا اجازہ بھی تھا جو مجھ سے کہیں گم ہوگیا ہے۔ بخاری شریف کا یہ نسخہ مکتبہ دارالدعوۃ السّلفیہ (لاہور) میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف علیہ الرحمہ کی لائبریری میں موجود تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب کی اس مطبوعہ کتاب سے فوٹو کاپی کرائی گئی تھی جو ان کے حالات میں ان کے فرزند گرامی مولانا عبدالقادر نے ''سوانح حیات حضرت مولانا غلام رسول'' کے نام سے لکھی ہے اور مولانا ابوالکلام احمد دہلوی سے ان کا ترجمہ کروایا گیا ہے۔

حضرت مولانا (ابوالکلام احمد) کا خط بھی ساتھ ارسال خدمت ہے۔

مولانا ابوالکلام احمد صاحب دہلی رہتے ہیں۔ استاذ الاساتذہ ہیں اور پرانے بزرگوں میں سے ہیں۔

حضرت مولانا غلام رسول صاحب رحمہ اللہ کی چند تحریرات بھی ارسال خدمت ہیں۔

بھائی سعید احمد صاحب، اہل خانہ اور احباب گرامی کی خدمت میں سلام مسنون۔

والسلام

عارف جاوید محمدی

اب مولانا ابوالکلام احمد صاحب دہلوی کا خط پڑھیے جو انھوں نے دہلی سے مولانا عارف جاوید محمدی کو لکھا اور پھر وہ خط انھوں نے کویت سے مجھے بھیجا۔

مولانا ابوالکلام احمد نے خط میں اہل حدیث کے علم تصوف اور علم طریقت کا جس انداز میں ذکر فرمایا ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ اس باب میں مولانا کے جذبات قابل قدر ہیں۔ انھیں اس موضوع پر کھل کر لکھنا چاہیے اور اہل حدیث علمائے دین کی کرامات اور ان کی قبولیت دعا کے واقعات کی تفصیل بیان کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں بہت عرصہ ہوا مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم و مغفور نے کچھ کام کیا تھا اور بڑی عمدگی سے بعض اہل حدیث علمائے کرام کی کرامتوں کا تذکرہ فرمایا تھا۔

اصحابِ کرامات علمائے اہل حدیث کی اس فہرست میں انھوں نے حضرت سید عبداللہ غزنوی ، مولانا غلام رسول قلعوی اور حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہم اللہ کے اسمائے گرامی درج فرمائے ہیں۔

بہر حال ذیل میں مولانا ابوالکلام احمد دہلوی کا مکتوب گرامی پڑھیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لااله الا الله محمد رسول الله

المرکز الاسلامی ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر

نیو دہلی۔ 110025 (ہند)

ٹیلی فون: 11911126953003

التاریخ: 14-1-1431 (1-1-2010)

ذوالمجد والکرم الشیخ عارف جاوید محمدی صاحب حفظہ اللہ وتولاہ

السلام علیکم ورحمة الله وبركاته!

مولانا عبداللہ معروف بہ غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ والا) رحمتہ اللہ علیہ کے خطوط اور نظموں کا ترجمہ مع تصحیح مکمل ہے۔ شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک شعر جو اصل میں غلط چھپا ہوا ہے، اس کی تصحیح و ترجمہ بعد میں ان شاء اللہ ارسال خدمت کروں گا۔

متن چوں کہ خط شکستہ کے انداز کا ہے، نیز اس میں کافی غلطیاں تھیں، اس لیے پورے مجموعے کو خود اپنے خط میں لکھ کر منقح کر دیا ہے۔ بعض حرص محمود ہے اور بعض مذموم۔ اور علم کی حرص پر رشک کرنا بجا ہے، حدیث میں تو ''حسد'' کا لفظ

آیا ہے، لیکن اس کے معنی رشک کے ہیں۔ آپ کی حرصِ علمی کو دیکھتے ہوئے اپنے خط کا اصل آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، عکسی کاپی اپنے پاس رکھ لی ہے۔ سلفیوں کی بابت دشمنوں کی اڑائی ہوئی ہوائی ہے کہ انھیں علم باطنی میسر نہیں، وہ اہل ظاہر ہیں، طریقت نہیں جانتے، صرف شریعت سے واقف ہیں۔ واشگافانہ کہوں تو ان کے نزدیک یہ لوگ تصوف سے نابلد ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ ان خطوط کو شائع کردوں اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھوں تاکہ دنیا باخبر ہوجائے کہ اہل حدیث کے یہاں علم طریقت و تصوف ہے، مگر وہ جو مبنی برکتاب وسنت ہے۔ اور اہل حدیث کو مطعون کرنے والوں کو بتایا جائے کہ

لذتِ بادہ ناصح کیا جانے
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

ہمارے علم طریقت کی چاشنی، کتاب وسنت کے مخلوطہ سے وجود میں آئی ہے۔ اوروں کے یہاں انحراف ہے اور زیغ وضلالت، ہداہم اللہ للصراط المستقیم۔

علامہ عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے رسالہ عمل بالحدیث کی کتابت ہوچکی ہے، دو صفحات گم ہیں، اس لیے طباعت رکی ہوئی ہے، اس کی کاپی فوری ارسال فرمادیں۔

بشرط امکان شیخ ابو خالد، شیخ ابو السعود دونوں حفظہم اللہ کو ہدیۂ سلام عرض فرما دیں۔ اللہ کرے آپ مع اہل وعیال بعافیت ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام احمد عفی عنہ

اب حضرت میاں سید نذیر حسین صاحب کا مکتوب گرامی پڑھیے جو انھوں نے مولانا

غلام رسول کے اس خط کے جواب میں ارسال فرمایا، جس میں انھوں نے حضرت سے شکوہ فرمایا تھا کہ وہ انھیں خط نہیں لکھتے۔ یہ خط جو فارسی زبان میں ہے اور شکستہ انداز کا ہے، مجھے مولانا عارف جاوید محمدی نے کویت سے بھیجا ہے۔اس پر میں ان کا شکرگزار ہوں۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا ابوالکلام احمد دہلوی نے کیا ہے۔ مولانا غلام رسول کا وہ خط نہیں ملا، جس کے جواب میں میاں صاحب نے یہ مکتوب انھیں ارسال فرمایا۔

یہاں حضرت میاں صاحب کا اپنے قلم سے لکھا ہوا خط بھی دیا جارہا ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی ......! کچھ پتا نہیں مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کے کتنے خطوط ہوں گے جو انھوں نے مختلف لوگوں کے نام لکھے اور ضائع ہوگئے۔ ذیل میں حضرت میاں صاحب کا خط ملاحظہ ہو۔ اس کے بعض الفاظ کا پڑھنا مشکل ہے، تاہم بہ طور تبرک یہاں درج کیا جارہا ہے۔

اب اس مکتوبِ گرامی کا ترجمہ پڑھیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کی حمد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام کے بعد۔

عاجز محمد نذیر حسین کی جانب سے، حسنات وکمالات کے جامع مولوی عبداللہ عرف مولوی غلام رسول کی خدمت میں۔ اللہ ان کے فضائل اور اعمال فاضلہ کے ساتھ انھیں سلامت رکھے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے بعد۔ آپ کے خاطر مجموعۂ فیض پر واضح ہو کہ میرا حال یہ خط لکھنے تک بخیر ہے۔ آں محترم کی خبر وخیریت کے لیے دعا گو ہوں۔ عنایت نامہ جو عافیت کی بشارت دے رہا ہے، موصول ہوا، جو میرے

بجھے ہوئے دل کو روشن کرنے والا اور رقیق آنکھوں کے لیے سرمہ ثابت ہوا۔
مجھ سے آپ کا جو شکوہ اور گلہ بیانی ہے، اس سے جدائی کی آگ میں جلتا ہوا دل
دریائے ندامت میں ڈوب گیا۔ خیال ہوا کہ اپنے کوائف کی اطلاع اور
آنحضرت کے مبارک مزاج کی صحت، دل پارہ پارہ کے لیے ضروری ہے۔
بعض بدنی عوارض اور قلتِ فرصت کی وجہ سے کوتاہ دست ہو جاتا ہوں۔ معاف
فرمائیں کہ عذر شرفاء کے یہاں مقبول ہوتا ہے۔ بے حد سستی جو مجھ میں پائی
جاتی ہے، اس سے اپنے دوست واحباب سے بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔
امید کہ دعاے خیر میں نہ بھولیں گے اور طلبہ کو حدیث کا درس ہمیشہ دیتے رہیں
گے۔ اللہ آپ کو اخلاص عطا فرمائے اور آپ پر بھرپور انعام کرے اور اللہ آپ
کا ناصر ہو۔ حالات سے وقتاً فوقتاً خاص کر اپنے احوال و اشغال سے مسرور و
سرفراز فرماتے رہیں۔ اور ہاں مجالس الابرار اور شرح موطا کو (اپنے لیے)
کافی بہتر پائیں گے۔

والسلام مع الاکرام مع خیر ختام

مہر

سید محمد نذیر حسین

حضرت مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ کا خط نہایت خوب صورت ہے۔ ان کے
ہاتھ کی لکھی ہوئی آیات قرآنی ہمیں مولانا عارف جاوید محمدی نے کویت سے ارسال
فرمائی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔

حافظ محمد سعید طاہر کا ذکر حافظ حمید اللہ سدید صاحب نے اس کتاب کے آغاز

(گفتارِ اولیں) میں فرمایا ہے۔ اس فقیر نے بھی اپنی ابتدائی گزارشات (حرفے چند) میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک باخبر اور صاحبِ مطالعہ اہلِ علم ہیں۔ بزرگانِ دین کے بارے میں ان کی معلومات خاص طور سے بڑی وسیع ہیں اور مجھے پتا چلا ہے کہ اس موضوع سے متعلق فارسی اور اردو کی بہت سی کتابیں ان کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی کے فارسی مکتوبات بھی میں نے ان کے پاس دیکھے اور ان کا عکسی مجلد نسخہ انھوں نے مجھے عنایت فرمایا۔ اس پر میں ان کا احسان مند ہوں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں ''تذکرہ مولانا غلام رسول قلعوی رحمۃ اللہ علیہ'' میں ان کے پنجابی اشعار زیادہ نہیں درج کرنا چاہتا تھا، اس لیے کہ اردو کتاب میں کسی دوسری زبان کے چند اشعار تو آسکتے ہیں، زیادہ اشعار لانا مناسب نہیں سمجھا جاتا، لیکن حافظ محمد سعید طاہر نے فرمایا کہ زیادہ اشعار آنا چاہییں۔ یہ بہت ناصحانہ اور دردانگیز اشعار ہیں۔ ان کے کہنے سے میں نے دوبارہ سہ بارہ اشعار پڑھے تو خیال ہوا کہ حافظ صاحب کی رائے صحیح ہے، چنانچہ ان کے بہت سے اشعار کتاب میں درج کر دیے گئے۔

مشہور اور نامور بزرگوں کے علاوہ عام شخصیات سے متعلق کتابیں بھی حافظ صاحب ممدوح کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا میری ان سے جون 2009ء میں پہلی ملاقات ہوئی تھی، جب وہ میرے غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ ابھی گفتگو کا آغاز ہوا ہی تھا کہ فرمایا: ''وہابیانہ گیارھویں شریف''۔ یہ سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا کہ میں نے نہایت محدود دائرے میں ایک ''حرکت'' کا ارتکاب کیا تھا، اس کا انھیں کیسے پتا چلا۔

شاید خوانندگانِ محترم بھی اس سے متعجب ہوئے ہوں۔ لیکن متعجب ہونے کی ضرورت نہیں، آپ کو بھی اس ''وہابیانہ گیارھویں شریف'' میں شامل کر لیتے ہیں......

شرح اس متن کی یہ ہے کہ ایک بزرگ محمد صادق صاحب ضلع قصور کے ایک گاؤں موضع برج کلاں میں سکونت پذیر ہیں۔ وہ احناف کے بریلوی نقطۂ نظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ کئی سال ہوئے انھوں نے میری ایک کتاب ''کاروانِ سلف'' پڑھ کر مجھے خط لکھا۔ یہ ان کا پہلا خط تھا جو مجھے ملا۔ خط سے پتا چلا کہ انھوں نے میری بعض کتابیں پڑھی ہیں۔ بہ تقاضائے اخلاق میں نے ان کے خط کا جواب دیا۔ بعدازاں ان کے بھی چند خطوط آئے اور میں نے بھی انھیں خط لکھے۔ ایک دن ان کا خط آیا کہ وہ مولانا عبدالستار خاں نیازی کے عقیدت مند ہیں اور ان کے حالات کتابی صورت میں چھپوانا چاہتے ہیں، تمھاری ان سے ملاقات رہی ہے، اس سلسلے میں کچھ ضرور لکھو۔

میرا واقعی مولانا عبدالستار خاں نیازی سے تعلق رہا ہے۔ وہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ میں اس زمانے میں بہ حیثیت ایڈیٹر ہفت روزہ ''الاعتصام'' سے منسلک تھا اور ان کی تشریف آوری پر ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ان سے میل جول کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

بہرحال محترم محمد صادق صاحب کے کہنے پر میں نے مولانا عبدالستار خاں نیازی کے بارے میں مضمون لکھا، جس میں ان سے گیارہ واقعات کا تذکرہ کیا جو میرے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ میں نے لکھا کہ مولانا ممدوح بریلوی مسلک سے وابستہ تھے۔

وہ لازماً گیارھویں شریف کرتے ہوں گے (یا گیارھویں شریف دیتے ہوں گے)۔
ان گیارہ واقعات کو میری طرف سے مولانا عبدالستار خاں نیازی کے لیے چھوٹی سی گیارھویں شریف سمجھ لیا جائے۔ میں نے اس مضمون کا عنوان بھی ''وہابیانہ گیارھویں شریف'' رکھا۔ ہم وہابی ٹھہرے۔ ہم ناواقفوں کی گیارھویں شریفیں اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ اپنی بے علمی کا اعتراف کرلینا چاہیے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ صحیح لفظ کیا ہے۔ گیارھویں شریف دینا ہے یا گیارھویں شریف کرنا ہے۔

حافظ محمد سعید طاہر صاحب نے یہ الفاظ کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا تھا۔ محمد صادق صاحب کی وہ کتاب چھپی اور مجھے ازراہ کرم انھوں نے ارسال فرمائی۔ مجھے تعجب ہوا کہ حافظ محمد سعید طاہر نے یہ کتاب بھی پڑھ لی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مطالعہ میرے جیسے لوگوں کی گیارھویں شریفوں تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ کتابیں پڑھتے بھی ہیں اوران کے مندرجات یاد بھی رکھتے ہیں۔

اب آیئے اس موضوع کی طرف جس کا تعلق حضرت مولانا غلام رسول قلعوی کی تصانیف اور حافظ محمد سعید طاہر کے مطالعہ سے ہے۔ میری ایک کتاب کا نام ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' ہے۔ یہ کتاب جو سات سو صفحات پر مشتمل ہے، پہلی مرتبہ 2005ء میں مکتبہ قدوسیہ لاہور نے شائع کی۔ میرے محترم دوست حافظ محمد سعید طاہر کے مطالعہ میں بھی آئی۔ اس کتاب میں حضرت مولانا غلام رسول قلعوی کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو صفحہ 422 سے صفحہ 425 تک چار صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کی تصانیف میں فتاوی مولوی غلام رسول، رسالہ تراویح اور تفسیر سورہ فاتحہ کا ذکر بھی ہوا ہے۔ حافظ صاحب نے مجھے ان چار صفحات کی فوٹو کاپی بھجوائی ہے اور پوچھا ہے کہ تذکرہ مولانا

غلام رسول میں ان کتابوں کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ ①

حافظ محمد سعید طاہر صاحب کا سوال بالکل صحیح ہے، لیکن اب میری گزارش سنیے!

بات یہ ہے کہ جب میں نے ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں مولانا غلام رسول کے متعلق لکھا تو مجھے کسی صاحب نے بتایا تھا کہ مسئلہ تراویح پر بھی مولانا کا ایک رسالہ موجود ہے، لیکن میں نے وہ رسالہ نہیں دیکھا تھا، جب زیر مطالعہ کتاب لکھنے لگا تو ملک عصمت اللہ صاحب نے اپنے ایک عزیز پروفیسر صاحب کا نام لے کر فرمایا کہ ان کی تحقیق کے مطابق یہ رسالہ حضرت مولانا کی تصنیف نہیں ہے، یوں ہی کسی نے ان کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ ''فتاوی مولانا غلام رسول'' کے بارے میں معلوم ہوا کہ ایک پڑھے لکھے شخص قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) تشریف لائے، چند روز مولانا غلام رسول صاحب کے پوتے اور ملک عصمت اللہ صاحب کے والد گرامی مولوی عبدالرحمن صاحب مرحوم کے پاس بہ طور مہمان رہے اور ان سے حضرت مولانا کے مسودات لے گئے جن میں غیر مطبوعہ فتاوے بھی تھے۔

تفسیر سورہ فاتحہ کے متعلق مجھے پتا چلا تھا کہ وہ قلمی صورت میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی لائبریری میں موجود ہے۔ میں نے وہ تفسیر لائبریری میں تلاش کی لیکن مجھے نہیں ملی۔ ان وجوہ کی بنا پر میں نے اس کتاب میں ان تینوں کتابوں (یا

① مولانا غلام رسول قلعوی کے حالات پر مشتمل یہ کتاب کمپوز کرا کے میں نے ملک عصمت اللہ صاحب کو دے دی تھی کہ وہ اور ان کے متعلقین اسے پڑھ لیں۔ اگر وہ اس میں کہیں حک و اضافہ کرنا چاہیں تو کر لیا جائے۔ کتاب خود پڑھ کر انھوں نے حافظ محمد سعید طاہر کو بھی دکھائی اور حافظ صاحب چوں کہ ماشاء اللہ بہت باخبر ہیں، اس لیے انھوں نے ان تصانیف کی نشان دہی کی اور مجھے رسالہ تراویح بھی بھجوا دیا جو فارسی زبان میں ہے اور اس کا ترجمہ مولانا محمد سرفراز خاں مرحوم نے کیا ہے۔

رسالوں) کا ذکر نہیں کیا۔

اب سنیے رسالہ تراویح کے بارے میں جو میرے مہربان دوست حافظ محمد سعید طاہر کی طرف سے مجھے ملا۔ یہ رسالہ حضرت مولانا غلام رسول کی جانب منسوب ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا اس فارسی رسالے کا اردو ترجمہ مولانا محمد سرفراز خاں صاحب نے کیا ہے۔ اس پر حضرتِ مترجم نے جو مقدمہ تحریر فرمایا ہے اوراس میں غیر مقلدوں کا جس انداز میں ذکر فرمایا ہے، میں اس قسم کا انداز اختیار نہیں کرسکتا۔ میرے ذہن اور قلم کی تربیت جن عظیم القدر اصحابِ علم کی نگرانی میں ہوئی ہے، ان کے اسمائے گرامی علی الترتیب یہ ہیں: حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی، حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی، حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور حضرت مولانا محمد حنیف ندوی رحمہم اللہ۔ ان حضرات کی تربیت سے مجھے یہ سبق ملا ہے کہ اپنے مسلک پر قائم رہو اور اختلافی مسائل میں دوسروں کے متعلق اظہار رائے میں احتیاط سے کام لو۔

تراویح آٹھ ہیں یا بیں۔ اس مسئلے میں اور اس قسم کے بعض دیگر مسائل میں اصحابِ علم کے درمیان صدیوں سے تحقیق کا دنگل جاری ہے۔ دونوں طرف سے احادیث کے مرحوم راویوں کے ضعف اور صحت پر بحث ہوتی رہتی ہے اور ہوتی رہے گی۔ میرے اور حافظ محمد سعید کے کہنے سے کوئی اپنے موقف سے دست بردار نہیں ہوگا۔ خود میں اور حافظ محمد سعید بھی نہیں ہوں گے۔ یاد رہے، نہ آٹھ تراویح پڑھنے والوں کے لیے قرآن وحدیث میں دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے اور نہ بیں تراویح والوں کو جنت کے ٹھیکے دار قرار دیا گیا ہے۔ ایک روایت میں چالیس رکعت تراویح کا

ذکر بھی ہے۔ تراویح نفلی نماز ہے، نوافل ساری رات پڑھتے رہیے۔ دن کو بھی یہ سلسلہ جاری رکھیے۔ نیت نیک ہو تو ثواب ہی ثواب ہے۔

اگر علمائے کرام جھگڑنے کے موڈ میں نہ ہوں تو اس مسئلے پر ایک اور طریقے سے بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ تراویح بیس ہوں یا آٹھ، دونوں صورتوں میں حفاظِ قرآن بالعموم ایک پارہ پڑھتے ہیں اور مقتدی سنتے ہیں۔ آٹھ تراویح پڑھیں گے تو قیام زیادہ ہوگا اور اس میں اللہ کے اس حکم پر عمل کیا جائے گا وقوموا الله قانتين (البقرہ: 238) (اور اللہ کے سامنے عاجزی کے ساتھ کھڑے رہو۔) بیس تراویح پڑھیں گے تو رکوع وسجود زیادہ ہوں گے، یہ بھی اللہ کے حکم پر عمل ہوگا۔

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾

(الحج: 77)

”ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو۔“

میں ہر مسلک کے علمائے کرام کا احترام کرتا ہوں۔ میں نے مختلف مسالک کے ہزاروں علمائے کرام کے حالات لکھے ہیں۔ اس فقیر پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص احسان ہے کہ برصغیر کے جتنے علمائے کرام کا تذکرہ اردو زبان میں میں نے کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا۔ میں حضراتِ علما کی نفسیات کو بھی خوب جانتا ہوں۔

حافظ محمد سعید طاہر کی خدمت میں یہ گزارش کرنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ علمائے کرام کسی فقہی مسئلے میں جھگڑیں یا نہ جھگڑیں، یہ ان کی صواب دید یا تحقیق پر موقوف ہے۔ لیکن ہم دونوں فیصلہ کر لیں کہ ہم آپس میں ہرگز نہیں جھگڑیں گے۔ کوئی بیس تراویح پڑھے، چالیس پڑھے، ساری رات پڑھتا رہے، آٹھ پڑھے۔ ہمارے نزدیک

سب ٹھیک ہے۔ کوئی شخص تراویح نہ پڑھنا چاہے تو نہ پڑھے۔ فرض اور سنتیں اور وتر پڑھ لے۔

مولانا غلام رسول تو اپنے دور کے ولی اللہ اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے ہی، واقعہ یہ ہے کہ ان کی آل اولاد میں بھی صالحیت کے آثار موجود ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ سخاوت، مروت، رحم دلی، ایثار، اللہ کا خوف، عبادت کا ذوق، بڑے کا احترام، چھوٹے پر شفقت، نرم خوئی ایسے بہت سے اوصاف اس خانوادے کے افراد میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔

قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) کے قریب ایک گاؤں کا نام "مان" ہے۔ وہاں کے لوگ مولانا غلام رسول اور ان کے اخلاف سے بے حد عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے۔ ان میں ایک بزرگ چودھری عبداللہ تھے جو مولانا غلام رسول کے پوتے مولانا محمد اشرف کے خاص معتقدین میں سے تھے۔ چودھری عبداللہ کے فرزند گرامی پروفیسر محمد صدیق مان نے اس خاندان کے بعض بزرگوں کے واقعات قلم بند کیے ہیں۔ ان میں چند واقعات ذیل میں ملاحظہ فرمایئے جو ہمارے جیسے بے عملوں کے لیے سبق آموز ہیں۔ لکھتے ہیں:

❁ مولانا محمد اشرف بڑے وجیہ، خوب صورت اور بلند اخلاق عالم تھے۔ اس کے ساتھ ہی بہت نیک اور صالح فطرت بزرگ تھے۔ وہ طبیب تھے اور علاج معالجے کے لیے روزانہ بے شمار لوگ ان کے پاس آتے تھے۔ ان کے گاؤں اور اردگرد کے دیہات کے لوگ اپنے بعض معاملات کے فیصلوں کے لیے بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے فیصلوں کو قابل عمل قرار دیتے تھے۔ مولانا ممدوح نے

اپنے مطب میں سٹو و رکھا تھا، جس پر وہ چائے بناتے اور مہمانوں کو پلاتے تھے۔ ان کے ہمہ گیر احترام کی وجہ سے بعض لوگ ان پر حسد بھی کرتے تھے اور حکومت کے اہل کاروں کے پاس جا کر ان کے متعلق غلط سلط باتیں کرتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ حسد کے نتیجے میں معاملہ یہاں تک بڑھا کہ پولیس مولانا محمد اشرف کو گرفتار کرنے کے لیے آ گئی۔ اس وقت وہ اپنے چند مہمانوں سے باتیں کر رہے تھے۔ پولیس والے باہر بیٹھ گئے۔ مولانا کو پتا چلا تو انھوں نے چائے بنائی اور پولیس والوں کو بھجوائی اور پیغام دیا کہ میں مہمانوں میں مصروف ہوں، آپ چائے پئیں، میں چند منٹ تک آ جاؤں گا۔ مولانا مہمانوں سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو دونوں ہاتھ پولیس والوں کے آگے کر دیے کہ میں حاضر ہوں۔ گرفتار کرو اور ہتھکڑی لگاؤ، جہاں لے جانا چاہتے ہو، لے چلو۔

پولیس والوں نے انھیں دیکھا تو بے حد مرعوب ہوئے۔ نہایت احترام سے انھیں سلام کیا۔ معافی مانگی اور واپس چلے گئے۔ حاسدین کا یہ گروہ جسے ''فرقہ حاسدیہ'' کہنا چاہیے ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کرنے والے لوگ بھی موجود تھے۔ اس کے بعد بھی ہر دور میں فرقہ حاسدیہ کا وجود رہا۔ مولانا غلام رسول سے بھی کتنے ہی لوگ حسد کرتے تھے، جن میں اس دور کے بعض علمائے دین بھی تھے، جو انھیں تکلیف پہنچانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

❀ مولانا محمد اشرف بلا تفریق مذہب و نسل سب کے کام آتے اور سب سے شفقت کا برتاؤ فرماتے۔ وہ صبح سویرے عیسائیوں کی بستی میں جاتے۔ ان میں سے کوئی بیمار ہوتا تو اسے دوا دیتے، کسی کو ٹیکا لگاتے. کسی کو کھانے پینے کی کسی چیز کی ضرورت

ہوتی تو مہیا فرماتے، کسی کو گوشت پہنچاتے۔ ان کی تیمارداری کرتے۔ عیسائی دوا کے پیسے پیش کرتے تو فرماتے پیسے فی الحال اپنے پاس رکھو۔ جب تمھیں افاقہ ہوگا، پھر سوچیں گے۔ اللہ تعالیٰ میری ضرورتیں پوری کر رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ تمھاری ضرورتیں بھی پوری کرے اور تمھیں شفا بخشے۔

تمام مریضوں کے ساتھ ان کا یہی برتاؤ تھا۔ کسی نے دوا کے پیسے دے دیے تو لے لیے، نہیں دیے تو مانگے نہیں۔ دوا کے ساتھ دعا بھی دی اور مریض کو خوش کرنے کی کوشش فرمائی۔

❁ موضع مان کا ایک چودھری قسم کا آدمی چوری کے الزام میں مولانا محمد اشرف کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ پہلے تو اس نے چوری سے انکار کیا۔ پھر کچھ بحث وتکرار کے بعد مان گیا اور کہا کہ میں نے واقعی چوری کی ہے۔ مولانا نے پنچایت میں اس پر بیس روپے جرمانہ عائد کیا۔ اس نے جرمانہ ادا کر کے مولانا کے ہاتھ چومے اور نہایت خوشی کے ساتھ نعرہ بلند کیا۔۔۔ پنچایت زندہ باد۔

❁ پروفیسر محمد صدیق رقم طراز ہیں کہ خطبۂ جمعہ مولانا محمد اشرف ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ بے حد موثر وعظ ہوتا تھا۔ بسا اوقات ان کے وعظ کے اثر سے لوگ رونے لگتے اور ان کے رونے کی آواز سب کو سنائی دیتی۔ جمعے کی دوسری اذان پروفیسر محمد صدیق مان کے والد محترم چودھری عبداللہ مان دیا کرتے تھے اور نماز جمعہ کی امامت عام طور پر مولانا محمد اشرف کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالرحمٰن کراتے تھے۔ وہ عالم دین نہ تھے لیکن ان کی آواز نہایت خوب صورت تھی اور اس میں بے حد سوز تھا۔ وہ پہلی رکعت میں زیادہ تر سورہ قیامہ پڑھا کرتے تھے۔ جب دوران

قرأت میں فاذابرق البصر☆ وخسف القمر☆ وجمع الشمس والقمر☆ یقول الانسان یومئذٍ این المفر پڑھتے تو آواز گلوگیر ہوجاتی اور پھر ہچکی بندھ جاتی۔ مقتدی بھی رونے لگتے۔ مولوی عبدالرحمٰن بے حد رقیق القلب تھے۔ اللہ سے ڈرنے والے اور انتہائی خاشع و خاضع۔

۞ محمد صدیق مان کہتے ہیں کہ مولانا محمد اشرف کے بڑے صاحب زادے عبداللہ صاحب میرے ہم جماعت تھے اور میرا زیادہ وقت عبداللہ صاحب کے ساتھ گزرتا تھا۔ اس بنا پر میں کسی حد تک ان کے گھریلو معاملات سے آگاہ تھا۔ عبداللہ صاحب کی والدہ (یعنی مولانا محمد اشرف کی اہلیہ) کے پاؤں کو چنبل کی بیماری لاحق تھی۔ اس لیے گھریلو کام کاج بالخصوص سالن اور روٹی وغیرہ پکانے میں مولانا محمد اشرف اپنی اہلیہ کی مدد فرماتے۔ یہ عمل بھی سنت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں شامل ہے، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی گھر کے بعض امور کی انجام دہی میں امہات المومنین کی مدد فرمایا کرتے تھے۔

۞ مولانا محمد اشرف کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالرحمٰن مسجد میں نماز پڑھنے آتے تو غسل خانوں میں اگر غلاظت ہوتی تو پانی کی بالٹیاں بھر کر اسے صاف کرتے، پھر وضو کر کے نماز پڑھتے۔ یہی مولوی عبدالرحمٰن ہمارے دوست ملک عصمت اللہ اور مولانا غلام رسول کی مسجد کے امام و خطیب حافظ حمید اللہ سدید کے والد محترم تھے۔ ان کا تذکرہ اس کتاب کے ایک باب میں ملک عصمت اللہ نے قدرے تفصیل سے کیا ہے جو قارئین کے مطالعہ میں آئے گا۔

۞ اب ایک واقعہ مولانا غلام رسول کے صاحب زادے مولانا عبدالعزیز کے متعلق

سنیے جو پروفیسر محمد صدیق مان اپنے والد مکرم چودھری عبداللہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ چودھری صاحب ممدوح فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ ہمارے کماد کے کھیت میں بے شمار چوہے آگئے اور کماد کی فصل برباد ہونے لگی۔ میں نے مولوی عبدالعزیز کی خدمت میں عرض کیا تو فرمایا تم جاؤ اور چوہوں کے بلوں کی مٹی لے کر کھیت کے تین کونوں میں بکھیر دو۔ چوتھا کونا خالی رہنے دینا۔ میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد مولانا عبدالعزیز وہاں پہنچ گئے اور کھیت کے خالی کونے میں کھڑے ہو گئے۔ چودھری عبداللہ کہتے ہیں کہ مولانا نے مجھے بھی اپنے ساتھ کھڑا کر لیا۔ آواز دی: چوہو! یہ کماد انسانوں کی خوراک ہے، تمھاری نہیں۔ لہٰذا تمام چوہے جلد از جلد کھیت سے باہر نکل جائیں۔ دوبارہ یہاں نہ آئیں۔

چودھری عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا آواز سنتے ہی چوہوں کی قطاریں ہمارے پاؤں کے پاس سے گزر رہی تھیں۔ ان کے بچے ان کے مونہوں میں تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور خوشی سے ہنسی بھی آرہی تھی۔

اس طرح کے بہت سے واقعات و کرامات مولانا غلام رسول اور ان کے بعض اخلاف کے بارے میں مشہور ہیں جو اس کتاب میں خوانندگانِ محترم کے مطالعے میں آئیں گے۔

بزرگانِ دین کے متعلق واقعات سے مَیں ابتدائے عمر ہی سے دل چسپی رکھتا ہوں۔ بے حد شوق سے ان کے واقعات سنتا بھی ہوں، پڑھتا بھی ہوں اور لکھتا بھی ہوں۔ جن حضرات سے ان کے مراسم رہے اور وہ ان کی ادائے صالحیت سے متاثر

ہوئے، ان سے بھی مجھے قلبی لگاؤ ہے۔ اس سے قبل میں نے صوفی عبداللہ صاحب کے حالات بھی بڑی دل چسپی سے لکھے ہیں، جو ''تذکرہ صوفی محمد عبداللہ'' کے نام سے مکتبہ سلفیہ لاہور نے شائع کیے۔ میرے نزدیک حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے واقعاتِ حیات بھی نہایت سبق آموز ہیں جو اس فقیر نے تحریر کیے اور مکتبہ سلفیہ کی طرف سے شائع ہوئے۔ اب ''تذکرہ مولانا غلام رسول قلعوی'' بھی نہایت محنت اور انتہائی شوق سے لکھا ہے۔ اس ایک عالی منزلت شخصیت کے تذکرے میں پہلے تذکروں کی طرح بے شمار حضرات کے تذکار آگئے ہیں، جن میں ان کے اساتذہ، تلامذہ، معاصرین، متعلقین، دوست احباب اور دور ونزدیک کے تقریباً تمام رشتے دار شامل ہیں۔

حضرت مولانا غلام رسول کی وفات کے بعد جن حضرات نے ان کی تاریخ وفات فارسی اشعار میں لکھی، ان میں ایک بزرگ مولوی غلام حسین (سکنہ ساہو والا چیمہ ضلع سیالکوٹ) ہیں جو ان کے شاگرد بھی تھے اور رشتے دار بھی۔ انھوں نے انتیس اشعار میں مولانا کے اوصاف بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ 1291ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ آخری شعر جس سے تاریخ وفات نکالی گئی ہے، یہ ہے:

براے سالِ تارتخش دگرگوں جلوہ شد دردل

ندیدیم ہم چو اوکس ناصحِ عذب البیاں پیدا

1291

ایک شعر میں فرمایا ہے کہ وہ 15۔ محرم 1291ھ کو ظہر کے بعد تلقین کرتے فوت ہوئے۔

گزشت از محرم پانزدہ روزے پس از پیشین
بوقت بیعت تلقین شدآں راز ونہاں پیدا

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تاریخ وفات 15۔محرم 1291ھ ہے۔عیسوی حساب سے یہ 4۔مارچ 1874ء تاریخ بنتی ہے۔اس طرح آج کی تاریخ تک (جب کہ یہ مقدمہ بہ عنوان ''حرفے چند'' لکھا گیا ہے) ان کی وفات پر قمری حساب سے ایک سو چالیس برس سات مہینے چھبیس دن کا اور عیسوی حساب سے ایک سو چھتیس برس پانچ مہینے اٹھارہ دن کا عرصہ بیت چکا ہے۔اس وقت اللہ کے فضل سے ان کی پانچویں چھٹی نسل اپنا سفرِ حیات طے کر رہی ہے۔

آیے!اب اس فقیر کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے۔

ربنا فاغفرلنا ذنوبنا و کفر عنا سیا تنا و تو فنامع الا برار

ربنا آتنا في الدنيا حسنة و في الاخرة حسنة و قنا عذاب النار

بروز اتوار	بندۂ عاجز
11۔رمضان 1431ھ	محمد اسحاق بھٹی
22۔اگست 2010ء	اسلامیہ کالونی۔ساندہ۔لاہور

خاندانی پس منظر

مولانا غلام رسول قلعوی کا نسب نامہ جو ان کے صاحب زادۂ گرامی مولانا عبدالقادر نے تحریر فرمایا ہے، یہ ہے: غلام رسول بن مولوی رحیم بخش بن حافظ نظام الدین خادم بن حافظ بہاء الدین بن حافظ محمد اکرم بن حافظ عصمت اللہ بن حافظ عبداللہ بن شیخ سکندر بن نور محمد بن پیر محمد۔

اس نسب نامے میں مولانا غلام رسول رحمہ اللہ سے لے کر حافظ عبداللہ رحمہ اللہ تک سات بزرگوں کے ناموں کے آغاز میں بڑے بڑے القاب لکھے گئے ہیں، مثلاً فاضل، العالم، الکامل، ولی اللہ، اہل اللہ، المتقی وغیرہ۔ ان بزرگانِ عالی قدر کے حالات تو نہیں ملتے لیکن قرائن سے پتا چلتا ہے کہ فی الواقع یہ القاب ان پر صادق آتے ہیں۔ رحمہم اللہ

مولانا عبدالقادر تحریر فرماتے ہیں:

یہ نسب نامہ میں نے اپنے بزرگوں کی قلمی کتب سے نقل کیا ہے۔ سلسلۂ نسب قطب شاہ تک پہنچتا ہے۔ ہمارے جدِ اعلیٰ جن کا نام سکندر تھا، موضع سکندر پور

ضلع گجرات (پنجاب) میں رہتے تھے۔ موضع سکندر پور کے واحد مالک تھے۔
انہی کے نام سے گاؤں کا نام مشہور ہو گیا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے زمیندار تھے
اور ذات کے اعوان تھے۔ ①

یہ مولانا غلام رسول قلعوی کے فرزند کبیر مولانا عبدالقادر کا بیان کردہ نسب نامہ ہے۔ مولانا غلام رسول کے پڑپوتے جناب محمد زبیر اعوان (ایم اے اسلامیات و عربی۔ ایل ایل بی آنرز) کی ایک تحریر میرے سامنے ہے، جو مولانا غلام رسول کے دادا حافظ نظام الدین خادمؔ کے مختصر سے تذکرے پر مشتمل ہے۔ محمد زبیر اعوان صاحب نے شیخ سکندر تک نسب نامہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شیخ سکندر کوہستان نمک سے ہری پور ہزارہ کے ایک گاؤں میں سکونت پذیر ہوئے تو اس گاؤں کا نام آپ کے نام پر سکندر پور رکھ دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ سکندر ضلع گجرات میں منتقل ہو گئے اور وہاں بھی ایک گاؤں آباد کیا۔ یہ گاؤں بھی شیخ سکندر کے نام سے سکندر پور مشہور ہو گیا۔ بعد ازاں حافظ نظام الدین خادم کے بزرگ بھومہ باٹھ ضلع گوجراں والا میں مقیم ہوئے اور وہاں سے کوٹ بھوانی داس منتقل ہو گئے۔"

مولانا عبدالقادر کے فرمان کے مطابق مولانا غلام رسول کا آبائی مسکن پنجاب کے ضلع گجرات کا ایک گاؤں سکندر پور تھا۔ یہ گاؤں انہی کے ایک بزرگ شیخ سکندر نے آباد کیا تھا جن کا نام خاندانی نسب نامے میں آٹھویں نمبر پر آتا ہے۔ وہ عہد مغلیہ میں اس گاؤں کے واحد مالک تھے۔ ان لوگوں کے علم و عمل اور اعلیٰ اخلاق کی بنا پر اس

① سوانح حیات مولانا غلام رسول صفحہ 16، 17

علاقے میں انھیں بے حد احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ یہ خاندان سکندر پور کی سکونت ترک کر کے ضلع گوجراں والا کے موضع کوٹ بھوانی داس میں اقامت گزیں ہو گیا۔ وہاں بھی ان کی علمی اور عملی حیثیت کی رو سے انھیں اعزاز کا مستحق گردانا گیا۔ چوں کہ یہ سب لوگ علمائے دین تھے اور ان کی وجہ سے وہاں دور و نزدیک کے اصحاب علم کی بہ کثرت آمد و رفت رہتی تھی، اس لیے کہا جانے لگا کہ

کوٹ بھوانی داس دا بغداد ہے پنجاب دا

یعنی کوٹ بھوانی داس کو اہل علم اور تقویٰ شعار لوگوں کی کثرت کے باعث پنجاب کا بغداد کہا جائے تو بجا ہوگا۔

مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں اس خاندان کے بعض اہل علم افتا اور قضا کے مناصب پر فائز رہے اور عوام و خواص میں انھیں تکریم کا مقام حاصل ہوا۔

حافظ نظام الدین خادم رحمہ اللہ

مولانا غلام رسول کے دادا کا اسم گرامی حافظ نظام الدین تھا۔ وہ فارسی کے شاعر تھے اور خادم تخلص کرتے تھے۔ محمد زبیر اعوان نے اپنے ایک مضمون میں ان کی تاریخ ولادت 1176ھ (1762ء) تحریر کی ہے اور مقام ولادت ضلع گوجراں والا کا گاؤں ''بھومہ باٹھ'' لکھا ہے۔ نیز بتایا ہے کہ وہ اپنے علاقے کے مشہور عالم دین، ادیب وانشا پرداز، قادر الکلام شاعر اور علم الرؤیا کے ماہر تھے۔ ان کا روحانی تعلق ایک بزرگ کاکا شاہ سے تھا جو ضلع سیالکوٹ کے موضع ''گڈ گوڑ'' کے رہنے والے تھے۔ شاہ صاحب ممدوح بدعات اور غیر شرعی رسوم سے سخت متنفر اور ان کے شدید مخالف تھے۔

حافظ نظام الدین خادم بھی شرعی معاملات میں بہت متشدد تھے، یعنی دونوں بزرگ اس معاملے میں ایک ہی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔

حافظ نظام الدین خادم رحمہ اللہ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ افسوس ہے وہ کتابیں دست بردِ زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ ان کے جو قلمی آثار اس وقت موجود ہیں، ان میں ایک ''انشائے خادمی'' ہے۔ یہ کتاب بقول محمد زبیر اعوان متعدد مرتبہ شائع ہوئی اور پنجاب کی درس گاہوں کے نصاب کا حصہ رہی۔ انھوں نے کئی فارسی کتابوں کے حاشیے بھی لکھے، جن میں ایک علمی شہ پارہ ''فرہنگ بہارِ دانش'' کی شرح ہے۔ یہ شرح انھوں نے اپنے بیٹوں کی تعلیم کے لیے لکھی تھی لیکن اس سے دوسرے لوگ بھی مستفید ہوئے۔

''رقعات نظام الدین'' بھی ان کی تحریرات میں شامل ہے۔ رقعات نظام الدین اور بہار دانش کی شرح کے قلمی نسخے پروفیسر ڈاکٹر احمد حسین قلعداری ضلع گجرات کے گنجینۂ کتب میں محفوظ ہیں۔

علاوہ ازیں حافظ نظام الدین خادم رحمہ اللہ نے نظامی گنجوی کے تتبع میں مثنوی کی صنف میں بزبانِ فارسی ''گلزارفقہ'' کے نام سے فتاوی ترتیب دیا، جو ایک سو چودہ اوراق پر مشتمل ہے اور ہر صفحے پر چودہ اشعار درج ہیں۔ اس منظوم فتاوے کا قلمی نسخہ موضع وارث کوٹ (ضلع گوجراں والا) کے مشہور خطاط خانوادے کے ایک رکن مولوی عنایت اللہ خوش نویس کے کتب خانے میں موجود ہے۔

حافظ نظام الدین خادم رحمہ اللہ کو اسہال کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ وہ کچھ دن اس مرض میں مبتلا رہے۔ پھر اسی مرض سے 1239ھ (1824ء) کو نماز پڑھتے ہوئے

حالتِ رکوع میں وفات پا گئے۔

وفات کے بعد ان کی دستار سے حسب ذیل فارسی اشعار نکلے جو انھوں نے زندگی کے آخری دور میں لکھے اور دستار میں رکھ لیے۔ ان اشعار سے صاف پتا چلتا ہے کہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ ان کی زندگی کے آخری دن ہیں اور وہ اسی بیماری کی حالت میں سفرِ آخرت پر روانہ ہو جائیں گے۔

یاراں وداع ماست سلامی و خیر باد
پا در رکاب ہم چو صبا ایستادہ ایم
پرواز می کنیم چو بلبل ازیں چمن
اینک بکوچ بالِ عزیمت کشادہ ایم
یاد آورید حلقہ چو ساز ید انجمن
از ما کہ ہم چو حلقہ بروں اوفتادہ ایم
نوبت زما گزشت کنوں نوبت شماست
ما الفراق خواندہ بہ رفتن آمادہ ایم
بردا شتیم خاطر ایں کارواں سرا
سوئے وطن گہی کہ ازاں بوم زادہ ایم
دارید ہوش دم بتغافل میا دید
ما عمر خویش بیہودہ برباد دادہ ایم
عمر عزیز بر سر سود و زیاں گزشت
فارغ کنوں زفکر کم و بیش زیادہ ایم

بگزر اشتیم ایں غزل آخر یں نشاں
ما خود قدم بوادئ اقدس نہادہ ایم
شاہد شوید جملہ بہ اقرارو صدق من
من بعد تن زنیم مطیع ارادہ ایم

ان اشعار میں شاعر نے دردناک انداز میں دنیا سے اپنے رخصت ہونے کا اعلان کیا ہے اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کو آخری سلام کیا اور خیر باد کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اسی طرح یہاں سے پرواز کررہے ہیں جیسے باغ سے بلبل پرواز کرجاتا ہے۔ دنیاے فانی سے ہمارا معاملہ ختم ہوا، اب یہاں رہنے کی تمھاری باری ہے۔ یہ دنیا کاروانِ سَرا ہے، جسے چھوڑ کر ہم وطن کو جارہے ہیں۔ لوگو! تم یہاں ہوش سے رہو، ہم نے تو اپنی عمر بے ہودہ کاموں میں گزاری۔ ہماری آخری نشانی یہ چند اشعار ہیں جو ہم نے یہاں چھوڑے۔

حافظ نظام الدین خادم رحمہ اللہ کے فرزندِ گرامی مولوی رحیم بخش تھے۔ یہ بھی نہایت صالح اور عالم دین تھے۔ یہ مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے والدمحترم تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے غلام رسول کی طالب علمی کے زمانے میں وفات پائی۔ (اس کا ذکر آگے آئے گا)

اعوان:

حضرت مولانا غلام رسول قلعوی، جن کے حالات اس کتاب میں بیان کرنا مقصود ہے، اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ممدوح سے متعلق گزارشات پیش کرنے سے پہلے یہ بتا دیا جائے کہ ''اعوان'' کا اطلاق کن لوگوں

پر ہوتا ہے اور انھیں اعوان کیوں کہا جاتا ہے؟

اس سلسلے میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ذیل میں مختصر الفاظ میں چند باتیں بیان کی جاتی ہیں۔

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مختلف اوقات میں جن قابل احترام خواتین سے شادی کی، ان میں ایک خاتون کا نام خولہ بنتِ جعفر تھا۔ اس خاتون سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام محمد الاکبر رکھا گیا۔ انھیں محمد بن حنفیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان سے جو سلسلۂ نسل چلا، اسے علوی یا اعوان کے نام سے موسوم کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ اولاد جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئی، آگے چل کر سادات کہلائی اور جو اولاد خولہ بنت جعفر سے ہوئی، اسے محمد بن حنفیہ (ابن علی رضی اللہ عنہ) کی وجہ سے علوی کہا جانے لگا اور یہی علوی آگے چل کر اعوان کہلانے لگے۔ یہ لوگ برصغیر پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

ان کے جدِ اعلیٰ سالار میر قطب حیدر شاہ تھے، جن کے خاندان کے متعدد افراد نے سلطان سبکتگین اور اس کے فرزند سلطان محمود غزنوی کی فوج میں بہت سی اہم جنگی خدمات سرانجام دیں۔ قطب شاہ 358ھ (969ء) میں پیدا ہوئے اور جوانی کی عمر کو پہنچے تو سلطان محمود غزنوی کی اجازت سے دریائے سندھ عبور کر کے پنجاب کے بعض علاقوں میں داخل ہوئے۔ بعض غیر مسلم حکمرانوں سے باقاعدہ جنگ کی اور فتح یاب ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے پنجاب کے علاقے کالا باغ میں سکونت اختیار کر لی اور اسلام کی تبلیغ کو اپنا مقصد حیات قرار دے لیا۔ ان کی تبلیغی کوششوں سے بے شمار غیر

مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ اس مردِ مجاہد نے 73 سال کی عمر میں 431 ھ (1040ء) کو وفات پائی۔ کالا باغ وغیرہ کے علاقے میں ان کی تبلیغی مساعی کا سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہا۔

اب ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لفظ اعوان ہے یا آوان؟
بعض مورخین کا خیال ہے کہ لفظ اعوان ہے جو تعاون، معاونت، اعانت، مدد وغیرہ کے معنے دیتا ہے۔ بعض اصحابِ تحقیق اسے سنسکرت زبان کا لفظ ''آوان'' قرار دیتے ہیں۔ لیکن معنے اس کے بھی وہی ہیں یعنی مددگار۔ برصغیر کے محکمۂ مال کے کاغذات میں اعوان اور آوان دونوں الفاظ ملتے ہیں۔

اب دیکھتے ہیں کہ ایک خاص برادری کے لیے لفظ ''اعوان'' استعمال کرنے کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس کا ایک متعین پس منظر بیان کیا جاتا ہے جو یہ ہے کہ

- ''اعوان'' جمع ہے عون کی۔ یہ عربی لفظ ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غیر فاطمی اولاد نے (یعنی اس اولاد نے جو حضرت علی کی دوسری بیویوں سے تھی) سادات کا پورا پورا ساتھ دیا اور ان کے محافظ ومعاون بن کر ان کے ساتھ رہے۔ اس اعانت و رفاقت کی وجہ سے ''اعوان'' کا لفظ ان کے لیے مخصوص ہوگیا۔ اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غیر فاطمی اولاد کے لوگ وقت وحالات کے تغیر کے ساتھ ساتھ علوی، محمدی، حنفی یا عمری بھی کہلاتے رہے۔[1]
- اعوان کی ایک اور وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ سلطان سبکتگین کے بعد اور سلطان

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب ''اعوان تاریخ کے آئینے'' میں (از محبت حسین اعوان) طبع 2006ء ص 93۔

محمود غزنوی کے دور میں ان کے جنگی معرکوں میں علویوں نے ان کی بھرپور مدد کی تو سلطان محمود غزنوی نے اپنے دورِ حکومت میں اس خطاب کی تجدید کی اور یوں ''اعوان'' کا لفظ علویوں کے لیے مخصوص ہو گیا جو اب تک چل رہا ہے۔①

❁ واقعہ کربلا کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جس اولاد نے سادات کی سب سے زیادہ جانی، مالی اور اخلاقی اعانت کی، انھیں چوتھی صدی ہجری کے بعد ''اعوان'' کہا جانے لگا اور حضرت علی کی غیر فاطمی اولاد کے لیے یہ لفظ مخصوص ہو گیا۔

❁ سنسکرت زبان میں بھی ''آوان'' کے معنی محافظ اور معاون کے ہیں۔ چنانچہ بعض جگہ کاغذاتِ مال میں قوم اعوان کو قوم آوان لکھا گیا ہے۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے تلہ گنگ کو ''آوان محل'' کا نام دیا تھا۔ اس نواح کے کئی علاقوں میں اعوان برادری کی اکثریت ہے اور وہ اس علاقے میں آوان کاری کے نام سے مشہور ہیں۔②

❁ سالار قطب شاہ حیدر وہ بزرگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرزندِ گرامی حضرت محمد بن حنفیہ کی اولاد سے تھے۔ ان کی اولاد قطب شاہی اعوان کہلاتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے عمر الاطرف کی اولاد کو برصغیر پاک و ہند میں علوی بھی کہا جاتا ہے اور اعوان بھی۔ لیکن حضرت علی کے فرزند عباس علَم دار کی اولاد برصغیر میں نہیں ہے۔③

یہ ہے نہایت مختصر الفاظ میں اعوانوں کی تاریخ اور انھیں اعوان کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ۔ ہمارے ممدوح حضرت مولانا غلام رسول قلعوی مرحوم و مغفور چوں کہ

① اعوان تاریخ کے آئینے میں ص 94۔ ② ایضاً ص 94۔ ③ ایضاً ص 95۔

اعوان تھے، اس لیے ان سے متعلق اس کتاب میں اختصار کے ساتھ اس کا ذکر کر دیا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ اعوان کا کیا مطلب ہے اور ایک خاص برادری کو اعوان کیوں کہا جاتا ہے۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی ولادت

کوٹ بھوانی داس سے تین کوس (موجودہ حساب سے پانچ کلومیٹر) کی مسافت پر ایک گاؤں ''پیروکوٹ'' تھا۔ وہاں ایک شخص میاں محمد یوسف فروکش تھے جو اس علاقے کے نیک اطوار بزرگ تھے۔ نجاری ان کا پیشہ تھا۔ وہ مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے والد مولوی رحیم بخش کے دوست تھے اور دونوں حقیقی بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک دن چھوڑ کر اگلے دن وہ مولوی رحیم بخش کے پاس کوٹ بھوانی داس آیا کرتے تھے۔ دونوں کی گفتگو ہمیشہ علم و عمل اور خیر و صالحیت کے دائرے میں رہتی تھی۔

ایک روز میاں محمد یوسف نے مولوی رحیم بخش کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ ایک بیٹا عطا فرمائے گا جو نہایت صالح اور پرہیزگار ہوگا۔ اس کی تبلیغ دین اور صالحیت سے متاثر ہو کر کثیر تعداد میں لوگ اسلام کی صراطِ مستقیم پر گام زن ہوں گے۔ اس کا نام غلام رسول رکھنا۔ وہ صحیح معنوں میں غلامِ رسول یعنی اطاعتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دم بھرنے والا اور متبع کتاب و سنت ہوگا۔

اسی اثنا میں مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی والدہ نے خواب دیکھا کہ ان کی گود میں

چودھویں رات کا چاند آ گرا ہے اور اس کی روشنی مشرق سے مغرب تک چلی گئی ہے۔ یہ چاند ان کی گود میں مسلسل بڑھتا جا رہا ہے اور اس کی روشنی چارسو پھیل رہی ہے۔ بعض لوگوں سے اس کی تعبیر پوچھی گئی تو بتایا گیا کہ اس خاتون کے بطن سے ایسا عالی بخت بیٹا پیدا ہوگا جو بڑا ہو کر کتاب وسنت کی تبلیغ کرے گا اور اس کی تبلیغ سے لوگ مستفیض ہوں گے اور شریعت مطہرہ کا نور پھیلے گا..... پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا۔

ولادت

1228ھ (1813ء) کو مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ کوٹ بھوانی داس (ضلع گوجرانوالا) میں پیدا ہوئے۔ یہ تین بھائی تھے۔ بڑے حکیم غلام محمد، منجھلے ہمارے ممدوح غلام رسول اور سب سے چھوٹے حکیم شیر محمد۔ تینوں بھائی پڑھے لکھے اور زیورِ تقویٰ سے آراستہ تھے۔ لیکن مولانا غلام رسول کا معاملہ کچھ اور ہی نوعیت کا تھا جو سب سے مختلف تھا۔ اللہ ان سے جو کام لینا چاہتا تھا وہ دوسرے بھائیوں کے مقدر میں نہ تھا۔ لکل فن رجال کا اطلاق ایسے ہی مواقع پر ہوتا ہے۔

عالم طفولیت

مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ کے بارے میں ان کے تذکرہ نگار بیٹے مولانا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ انھوں نے بچپن میں والدہ ماجدہ کی گود میں کبھی پیشاب نہیں کیا۔ والدہ نماز کے اوقات میں بچے کو چارپائی پر لٹا دیتیں اور خود نماز پڑھنے لگتیں، وہ آرام سے لیٹے رہتے، والدہ کے دورانِ نماز میں کبھی نہیں روئے۔ تہجد کی نماز بھی آرام سے پڑھ لیتیں اور بچہ چپ چاپ لیٹا رہتا۔ ان کے والد مولوی رحیم بخش فرمایا کرتے تھے کہ میرا

بچہ اتنا خاموش طبع ہے کہ رونا جانتا ہی نہیں۔ رمضان المبارک میں صبح سے شام تک نہ دودھ پیتے نہ پانی۔ ان کی اس خصوصیت کی بنا پر لوگوں میں مشہور تھا کہ میاں رحیم بخش کا شیر خوار بچہ روزے رکھتا ہے۔ اس روزے دار بچے کو لوگ ان کے گھر دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ [1]

متقی بچہ

غلام رسول کے ساتھ کھیلنے والے بچوں میں سے کوئی بچہ شرارت کرتا یا کسی کو پریشان کرتا اور برا بھلا کہتا تو وہ اسے روکتے اور سمجھاتے کہ اس طرح کی حرکتیں کرنا بری بات ہے۔ اسلام میں اس سے منع کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے اس وقت انھوں نے نہ کوئی تعلیم حاصل کی تھی اور نہ تعلیم حاصل کرنے کی عمر تھی۔ نہ اہل علم کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے، نہ اس طرح کا شعور تھا۔ کسی قسم کے وعظ ونصیحت سے بھی انھیں کوئی تعلق نہ تھا، لیکن ان کے اندر ایک فطری جذبہ تھا اور ضمیر کی ایک خوش گوار صدا اور معصوم سی تمنا تھی جو غیر شعوری طور پر ان کے دل کی گہرائیوں سے اٹھتی اور اپنے ساتھی بچوں کے کانوں تک پہنچتی اور انھیں متاثر کرتی تھی۔ اس تاثر کی وجہ سے لوگ انھیں "متقی بچہ" کہنے لگے۔ ان کے گاؤں کے ہندوؤں میں مشہور تھا کہ مولوی رحیم بخش کا یہ بچہ ولی اللہ ہے۔ گاؤں کے عام لوگوں کو ان سے اتنی عقیدت ہوگئی تھی کہ کوئی بیمار ہوجاتا تو وہ ان سے پانی دم کرا کے مریض پر چھڑکتے یا اسے پلاتے تو اللہ اسے صحت عطا فرما دیتا۔

[1] سوانح حیات مولانا غلام رسول صفحہ 27۔

ایک عجیب واقعہ

ان کے بچپن کا ایک واقعہ سنیے جو نہایت عجیب و غریب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن ایک کمہار نے ان سے کہا:

متقی صاحب! میرا گدھا گم ہوگیا ہے، میں نے بہت تلاش کیا، لیکن ملا نہیں، میں سخت پریشان ہوں۔

کہا: گدھا آپ کے گھر میں ہے۔

اس نے کہا: میرے گھر میں نہیں ہے، گم ہوگیا ہے۔

انھوں نے جب زور دے کر کہا کہ گھر میں ہے تو وہ یہ دکھانے کے لیے کہ گھر میں نہیں ہے، انھیں پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ دیکھا تو گدھا گھر میں کھڑا تھا۔

مطلب یہ کہ بچپن ہی میں ان پر آثار بزرگی ظاہر ہونے لگے تھے اور ان کے اندر علاماتِ کرامات کروٹ لینے لگی تھیں۔

بہر حال یہ خاندان متقی خاندان تھا، اس خاندان کے بچے بھی صالحیت کے اوصاف سے متصف تھے۔ اب بھی اس خاندان کے افراد میں حلم، رواداری، سخاوت، خداترسی اور نرم دلی کے آثار پائے جاتے ہیں۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ پانچ سال کے ہوئے تو انھیں قرآن مجید پڑھنے کے لیے مسجد میں ایک استاد کی خدمت میں لایا گیا۔ لیکن پڑھنے میں نہایت کم زور تھے۔ نہ یادداشت نہ حافظہ۔ بڑی مشکل سے قرآن مجید پڑھا۔ والد اور گھر کے تمام افراد پریشان وفکر مند۔ جو کچھ سوچا تھا وہ ظہور میں نہیں آرہا تھا۔ چند سال اسی طرح گزر گئے۔ پڑھنے لکھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اتنا نیک اور شریف طبع بچہ، بالکل غبی۔ والدین کے لیے ذہنی اعتبار سے یہ نہایت تکلیف رساں معاملہ تھا۔

ایک خواب اور اس کی تعبیر

پنجاب میں اس وقت سکھوں کا راج تھا اور راجا رنجیت سنگھ تختِ حکومت پر متمکن تھا، جس کی حکمرانی کا دور انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر 1839ء تک چلتا ہے۔ اس غبی اور کم زور ذہن بچے نے خواب میں دیکھا کہ وہ راجا رنجیت سنگھ کے طویلے میں اذان دے رہا ہے اور اس کی اذان سن کر بہت بڑی تعداد میں دور دور سے لوگ اس کی طرف آرہے ہیں۔ یہ خواب اس بچے نے اپنے جدِ امجد حافظ نظام الدین خادم

کو سنایا تو انھوں نے اس کی یہ تعبیر کی کہ تم آگے چل کر اسلام کے اتنے بڑے مبلغ بنو گے کہ بہت سے لوگ تمھاری تبلیغ سے اثر پذیر ہو کر تمھارے ہاتھ پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوں گے۔

یہ ایک خواب تھا جو عالم طفولیت میں مولانا غلام رسول نے دیکھا اور یہ اس کی تعبیر تھی جو ان کے دادا حافظ نظام الدین خادم رحمہ اللہ نے اپنے ہونہار پوتے کو بتائی۔ آگے چل کر یہ تعبیر بالکل صحیح ثابت ہوئی اور ایک دنیا نے ان سے حصولِ فیض کیا، جس کی تفصیل کتاب کے آئندہ اوراق میں ہمارے علم میں آئے گی۔

دادا کی خدمت اور ان کی دعا

اس واقعہ سے چند روز بعد حافظ نظام الدین رحمہ اللہ کو اسہال کا مرض لاحق ہوگیا، جس نے طوالت اختیار کرلی۔ اب غلام رسول ان کی خدمت میں رہنے لگے۔ بیماری کی وجہ سے حافظ صاحب نہ رات کو سو سکتے تھے، نہ دن کو۔ غلام رسول بھی ان کے ساتھ جاگتے اور ان کی غلاظت صاف کرتے۔ ایک دن سحری کے وقت انھوں نے دیکھا کہ بچہ جاگ رہا ہے اور ہاتھوں سے ان کی غلاظت صاف کررہا ہے۔ انھوں نے تعجب سے فرمایا: غلام رسول تم جاگ رہے ہو اور غلاظت صاف کررہے ہو؟ جس طرح تم میری خدمت کرتے اور اپنے ہاتھوں سے میری غلاظت صاف کرتے ہو، ایک وقت آئے گا کہ اسی طرح لوگ تمھاری خدمت کریں گے، تمھیں لوگوں میں مقبولیت حاصل ہوگی اور تمھاری تبلیغ اسلام سے لوگوں کے دلوں کی غلاظت اور گندگی ختم ہوگی۔

مولانا غلام رسول کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنے عقیدت مندوں کو یہ

واقعہ سناتے اور فرماتے کہ مجھے اپنے دادا صاحب ہی سے فیض حاصل ہوا ہے اور میں جو کچھ ہوں، یہ ان کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

کاکا شاہ صاحب کی تشریف آوری

جس دن حافظ نظام الدین نے اپنے پوتے غلام رسول سے فرمایا کہ جس طرح تم میری خدمت کرتے ہو، اسی طرح لوگ تمھاری خدمت کریں گے، اس سے دوسرے دن حافظ صاحب کے ایک دوست کاکا شاہ کوٹ بھوانی داس تشریف لائے، ان صاحب سے ملے اور ان سے گفتگو کی۔

کاکا شاہ صاحب ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں موضع گڈگوڑ کے رہنے والے تھے۔نہایت پرہیزگار بزرگ تھے۔ حافظ صاحب نے ان سے فرمایا کہ میرا اب آخری وقت ہے۔ غلام رسول میں صالحیت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ میں نے اس کے لیے حصول فیض کی دعائیں کی ہیں۔ اس کی پرورش اور حفاظت کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے۔لیکن آپ اس کا خیال رکھیں۔ یہ لڑکا ضائع نہ ہوجائے۔

دوسرے روز شاہ صاحب فی امان اللہ کہہ کہ اپنے گاؤں گڈگوڑ چلے گئے اور اس سے اگلے دن حافظ نظام الدین کا انتقال ہوگیا۔

کچھ روز بعد شاہ صاحب دوبارہ کوٹ بھوانی داس آئے اور غلام رسول کو پڑھنے کے لیے چند الفاظ بتائے ۔ دوسرے دن انھوں نے ان سے وہ الفاظ پوچھے تو جواب دیا کہ جو الفاظ آپ نے بتائے تھے، میں وہ الفاظ بھول گیا ہوں۔ شاہ صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: اتنی جلدی بھول گئے۔ حافظہ ندارد۔۔۔ کہا تم میرے دوست

کے پوتے ہو۔ تمھارے متعلق انھوں نے مجھے خاص طور پر وصیت کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے غلام رسول کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: برخوردار! کہو:

اللهم بارك لي في علمي و عملي رب زدني علما۔

''اے اللہ! میرے علم اور عمل میں برکت فرما اور میرے علم میں اضافہ فرما''

مولانا غلام رسول کی عمر اس وقت تقریباً بارہ برس کی تھی۔ یہ الفاظ پڑھنے کے بعد ان کا ذہن کھل گیا۔ وہ جو کچھ پڑھتے فوراً حافظے کی لوح پر نقش اور زبان پر جاری ہو جاتا۔ ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں:۔

''مولانا غلام رسول فرمایا کرتے تھے کہ جس دن شاہ صاحب نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے یہ دعا پڑھائی تھی، اس دن سے اگر میں نے سو صفحے کی کتاب کا مطالعہ کیا تو وہ پوری کتاب مجھے یاد نہیں رہی تو اس کا مطلب میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا۔''[1]

شاہ صاحب نے رخصت ہوتے وقت ان سے کہا کہ جب میں تمھیں بلاؤں، مجھے ضرور ملنا۔ جس طرح ہو سکے درسی کتابیں پڑھ لو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری حفاظت فرمائے گا۔ وہی سب کا حافظ و ناصر ہے۔ یاد خدا میں مشغول رہو۔ یہ کہہ کر دعا کی اور چلے گئے۔

شاہ صاحب کی نصیحت

اپنے دادا حافظ نظام الدین خادم رحمہ اللہ کی وفات کے چند روز بعد مولانا غلام رسول تحصیل علم کے لیے لاہور آئے۔ یہاں کی لال مسجد (اندرون بھاٹی گیٹ) میں اس عہد کے

[1] سوانح حیات مولانا غلام رسول صفحہ 32

ایک عالم مولانا غلام محی الدین بگوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے۔ دو ماہ کے بعد استاذِ محترم سے اجازت لے کر شاہ صاحب کی خدمت میں گڈ گوڑ گئے۔ وہ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور نصیحت فرمائی کہ چھتیس مرتبہ روزانہ نمازِ تہجد میں سورۂ یٰسٓ پڑھا کرو۔ اس کے علاوہ بہ کثرت درود شریف اور چند وظائف پڑھنے کی تاکید فرمائی۔ نیز ارشاد فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اسی طرح کرو جس طرح صحابہ کرام کرتے تھے۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ اسی راہ کو اختیار کرو گے تو دنیا وآخرت میں کامیابی حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ سب راہیں غلط ہیں۔ بدعات کے ارتکاب سے بچو۔ بدعتی پیروں کی مجلس میں نہ بیٹھو۔ یاد رکھو ہمارے لیے اتباع کا اصل نمونہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام ہیں، انھی جیسے اعمال کیے جائیں گے تو رشد و ہدایت کا دروازہ کھلے گا۔ زکوٰۃ ادا کرو اور سخاوت کو اپنا معمول قرار دو۔ غلط کردار لوگوں کی صحبت سے اپنے آپ کو بچا کر رکھو۔ متبع شریعت لوگوں سے تعلق رکھو۔ جو لوگ اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام نہیں مانتے، بے شک وہ کتنی کرامتیں دکھائیں اور کتنے ہی لوگ ان کے گرویدہ ہوں، لیکن تم ان کی کوئی بات نہ مانو۔ وہ گم راہ اور جھوٹے لوگ ہیں، ان سے دور رہو۔ اصل صوفی اور شیخ وہ ہے، جس کے افعال واعمال فرامینِ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق ہوں۔ ایسے ہی لوگ کامل اور لائق بیعت ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان اوصاف سے محروم ہیں، ان سے کنارہ کش رہو۔ شاہ صاحب نے انھیں اس قسم کی اور بھی نصیحتیں کیں۔

شاہ صاحب کی ان نصائح سے مولانا غلام رسول نہایت متاثر ہوئے۔ وہ فرماتے

ہیں کہ یہ باتیں سن کر ان کے سامنے حقیقت واضح ہوگئی اور انھیں پتا چل گیا کہ نیکی کیا ہے اور برائی کیا ہے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب ان سے کوئی خلافِ سنت کام ہونے لگتا تو انھیں ایسے محسوس ہوتا کہ اس کے ارتکاب سے انھیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منع فرما رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے انھیں اس درجہ محبت پیدا ہوگئی اور دل میں ایسا انقلاب آیا کہ بے شک انھیں مار دیا جائے، ان کے ٹکڑے کردیے جائیں اور انھیں آگ میں پھینک دیا جائے، وہ ہر حال میں اتباعِ سنت پر کاربند رہیں گے اور ہر صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا رشتہ محبت قائم رکھیں گے۔

شاہ صاحب کی وفات

شاہ صاحب سے اجازت لے کر مولانا غلام رسول رخصت ہونے لگے تو انھوں نے فرمایا کہ تم دلجمعی اور محنت سے علم حاصل کرو۔ اتباع سنت کو اپنا مقصدِ حیات ٹھہراؤ اور مجھے ملتے رہو۔ میری خواہش ہے کہ تم نہایت اخلاص کے ساتھ اللہ کے دین کی تبلیغ کرو۔ میں تمھیں اپنے لیے ذریعۂ نجات سمجھتا ہوں۔ شاید تم میرے لیے باقیاتِ صالحات میں سے ہو۔ میں بار بار تاکید کرتا ہوں کہ حصول علم میں ہرگز کوتاہی نہ کرنا۔

مولانا واپس لاہور آئے تو مولانا غلام محی الدین بگوی لاہور کی سکونت ترک کر کے اپنے اصل مسکن بگہ چلے گئے تھے اور ان کی جگہ ایک اور استاذ ان کی مسندِ درس پر فائز ہوگئے تھے۔ وہ مدرس اور عالم تو بے شک اچھے تھے لیکن ان کی عملی حالت کم زور تھی۔

مولانا غلام رسول کچھ عرصہ ان کے حلقۂ درس میں رہے اور اس اثنا میں ان سے علم نحو کی دو کتابیں پڑھیں۔ ایک ہدایت النحو، دوسری کافیہ۔

کچھ مدت کے بعد مولانا نے اپنے استاذ سے شاہ صاحب ممدوح کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے اجازت طلب کی، لیکن انھوں نے اجازت نہیں دی۔ چند روز کے بعد پھر اجازت مانگی، اب بھی انھیں اجازت نہیں ملی۔ تیسری دفعہ پھر درخواست کی، لیکن منظور نہیں کی گئی۔ اب انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے چلے جانا چاہیے، چنانچہ کتابیں اٹھائیں اور شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری کے لیے چل پڑے۔ ان کے گاؤں پہنچے تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب وفات پا گئے ہیں۔ ان کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی اور اپنے گاؤں کوٹ بھوانی داس آ گئے۔

والد محترم کی رحلت

مولانا غلام رسول گاؤں پہنچے تو ان کے والد محترم مولوی رحیم بخش بیٹے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ فرمایا اچھا ہوا تم آ گئے اور مجھ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بیٹے کی دین داری اور شوقِ حصولِ علم سے بڑے مطمئن تھے۔ مولانا کی آمد کے دوسرے دن وہ جماعت کے ساتھ نماز عصر پڑھ رہے تھے کہ چوتھی رکعت کے سجدے میں رحلت فرما گئے۔ ظاہر ہے یہ اچانک موت تھی اور بہت بڑا حادثہ تھا۔ لیکن اللہ کو یہی منظور تھا۔ صبر شکر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ان کی وفات چوں کہ حالتِ سجدہ میں ہوئی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یقیناً ان کی مغفرت فرمادی ہوگی۔ والد کے کفن دفن کے بعد وہ بگہ تشریف لے گئے اور وہاں مولانا غلام محی الدین بگوی کے برادرِ صغیر مولانا احمد الدین

بگوی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ پھر باقی ماندہ تمام مروّجہ درسی کتابیں انہی سے پڑھیں۔

مولانا غلام محی الدین بگوی اور مولانا احمد الدین بگوی دونوں بھائی اپنے عہد کے مشہور مدرس اور عالم تھے۔ ان سے بے شمار شائقین علوم دینیہ نے استفادہ کیا۔

اساتذہ کرام

مولانا غلام رسول نے (جیسا کہ گزشتہ سطور سے معلوم ہوا) مدارسِ دینیہ کے مروجہ علوم کی تحصیل پنجاب کے دو علمائے کرام سے کی، مولانا حافظ غلام محی الدین بگوی سے اور ان کے چھوٹے بھائی حافظ احمد الدین بگوی سے۔ ان دونوں کا اس عہد کے جلیل القدر علما و مدرسین میں شمار ہوتا تھا۔ سب سے پہلے وہ لاہور میں بازار حکیماں کی لال مسجد میں مولانا حافظ غلام محی الدین بگوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ پھر موضع بگہ میں حافظ احمد الدین کی خدمت میں حاضری دی۔ ذیل میں پہلے مولانا غلام محی الدین بگوی کے ضروری حالات پڑھیے۔ اس کے بعد حافظ احمد الدین بگوی کا تذکرہ کیا جائے گا۔

مولانا حافظ غلام محی الدین بگوی پنجاب کے جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، وہ کئی پشتوں سے مرجع خلائق تھا اور اس کے اکثر افراد علم و عمل اور زہد و تقویٰ کی دولت سے بہرہ ور تھے۔ مولانا ممدوح کے والد کا نام حافظ نور حیات، دادا کا حافظ محمد شفا اور پڑدادا کا اسم گرامی نور محمد تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت

عکرمہ رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

حافظ غلام محی الدین کے اسلاف میں ایک بزرگ عبدالرحمٰن بن صالح تھے جو آٹھویں صدی ہجری میں واردِ پنجاب ہوئے۔ پھر عبدالرحمٰن کی اولاد سے ایک شخص محمد ہاشم نے گیارھویں صدی ہجری میں دریائے جہلم کے کنارے موضع بگہ میں سکونت اختیار کی جو بھیرہ کے قریب ضلع سرگودھا کا ایک گاؤں ہے۔

محمد ہاشم کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام محمد صالح تھا اور ایک کا محمد یوسف۔ دونوں علم وعرفان اور زہد و ورع کی نعمت سے متمتع تھے۔ محمد صالح کی اولاد نے ضلع سرگودھا کے قصبہ جھاوریاں اور شاہ پور کو اپنا مسکن بنایا اور محمد یوسف کے اخلاف نے اپنے آبائی گاؤں بگہ میں اصلاح وارشاد اور درس وتدریس کا حلقہ قائم کیا۔ پھر آگے چل کر محمد یوسف کے جانشین میرداد بگوی اور میرداد کے صاحب زادے حافظ نور محمد بگوی اپنے عہد کے ممتاز عالم ہوئے جو مبلغ کتاب وسنت تھے اور غیر شرعی رسوم و رواج کی تردید میں بہت تیز تھے۔

حافظ نور محمد کے جانشین حافظ محمد شفا ہوئے۔ انھوں نے 1220ھ (6-1805ء) میں وفات پائی۔ حافظ غلام محی الدین انھی حافظ محمد شفا کے پوتے تھے۔ والد کا نام حافظ نور حیات تھا۔

حافظ غلام محی الدین بگوی اپنے علاقے اور عہد کے ممتاز عالم تھے۔ تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، اصول و معانی اور دیگر علوم متداولہ میں درک رکھتے تھے۔ زہدواتقا کی دولت سے بھی بارگاہِ الٰہی سے انھیں خاص حصہ ملا تھا۔

حافظ غلام محی الدین محرم 1210ھ (اگست 1795ء) کو اپنے آبائی گاؤں بگہ میں

پیدا ہوئے۔ ان کے بارے میں ایک عجیب واقعہ منقول ہے جو ان کے بالکل ابتدائی ایام سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے راوی ان کے والد ماجد حافظ نور حیات ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات وہ نمازِ تہجد کے لیے اٹھے تو ازراہِ محبت اپنے بچے غلام محی الدین کو گود میں اٹھا کر ساتھ لے گئے اور دریائے جہلم کے کنارے پہنچے۔ کپڑا بچھا کر بچے کو لٹا دیا اور خود وضو کر کے نوافل پڑھنے لگے۔ اندھیری رات تھی اور بچہ قدرے فاصلے پر تھا۔ کچھ دیر بعد انھیں خیال گزرا کہ ایسا نہ ہو کوئی درندہ آجائے اور بچے کو اذیت پہنچائے، بچے کو اپنے پاس ہی لٹانا چاہیے۔ اس خیال سے جب وہ بچے کو اٹھانے گئے تو دیکھا کہ ایک مبارک صورت سفید ریش بزرگ بچے کو گود میں لیے بیٹھے ہیں۔ باپ نے بزرگ سے درخواست کی کہ اس بچے کے لیے دعا فرمائیں کہ یہ باعمل عالم ہو۔ بزرگ نے کہا یہ باعمل عالم ہی ہوگا اور لوگوں کو اس سے فیض پہنچے گا۔ یہ الفاظ کہہ کر وہ بزرگ ان کی آنکھوں سے غائب ہو گئے۔

غلام محی الدین چار برس چار ماہ کے ہوئے تو انھیں مسجد میں لے جا کر حافظ حسن کے سپرد کر دیا گیا جو بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے۔ حافظ حسن سخت طبیعت تھے۔ قرآن مجید پڑھاتے وقت وہ ان بچوں کو بڑی سخت سزا دیتے تھے، جو اچھی طرح سبق یاد نہیں کرتے تھے، لیکن غلام محی الدین ذہین شاگرد تھے، انھوں نے کبھی استاد کو ڈانٹ ڈپٹ یا سختی کرنے کا موقع نہیں دیا۔ انھوں نے تھوڑے عرصے میں ناظرہ قرآن مجید پڑھ لیا تھا۔ آواز اچھی تھی، مگر قرآن مجید حفظ نہیں کیا تھا۔ ان کے قرآن پڑھنے کے بعد پہلا ماہ رمضان آیا تو لوگوں نے ان کے والد حافظ نور حیات سے کہا کہ تراویح میں غلام محی الدین سے قرآن سننا چاہیے۔ والد نے بیٹے سے پوچھا کہ تم قرآن مجید سنا سکو

گئے؟ عرض کیا آپ اگر روزانہ میرے ساتھ ایک پارے کا دور کرلیا کریں تو سنا سکوں گا۔ چنانچہ یہ سلسلہ شروع کر دیا گیا اور انھوں نے اسی ماہ رمضان میں پورا قرآن مجید حفظ کرلیا اور نماز تراویح میں سنا بھی دیا۔

قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد علوم مروجہ پڑھنے کا عزم کیا اور 1229ھ (14-1813ء) کو اپنے چھوٹے بھائی احمد الدین کو ساتھ لے کر دہلی جانے کا منصوبہ بنایا۔ احمد الدین کی عمر اس وقت آٹھ برس کی تھی اور وہ قرآن مجید کا دسواں پارہ حفظ کررہے تھے۔لیکن دہلی کے سفر کی تیاری اور وہاں پہنچنے تک انھوں نے پورا قرآن مجید حفظ کرلیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑے بھائی حافظ غلام محی الدین کی طرح یہ بھی ذہین اور حصول علم کے شائق تھے۔

دہلی اس زمانے میں علم و علما کا مرکز تھا اور اصحاب علم کے درس کے سلسلے جاری تھے۔ دونوں بھائیوں نے مختلف حضرات علما سے استفادہ کیا مگر حدیث کا درس حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی سے لیا اور سندِ حدیث حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے لی۔ حافظ غلام محی الدین نے حدیث کی کتابیں ختم کرلیں تو ان کے استاذِ محترم حضرت شاہ محمد اسحاق اپنے اس لائق شاگرد کو حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لے گئے اور سند حدیث عطا فرمانے کی درخواست کی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان سے حدیث اور علم حدیث کے متعلق چند سوالات پوچھے جن کے انھوں نے صحیح صحیح جواب دیے۔ شاہ صاحب جواب سن کر خوش ہوئے اور سندِ حدیث عطا فرما کر دعا کی اور فرمایا ان شاء اللہ آپ سے لوگوں کو فیض پہنچے گا۔ ساتھ ہی نصیحت کی کہ ”وطن جا کر ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے لوگوں میں تفرقہ پیدا ہو۔“

قیام دہلی کے زمانے میں انھوں نے شاہ غلام علی مجددی کی بیعت کی اور ان سے استفاضہ کیا۔

تکمیل تعلیم کے بعد حافظ غلام محی الدین اپنے وطن بگہ آئے۔ ان کے والد حافظ نور حیات وفات پاچکے تھے۔ اس وقت پنجاب میں سکھوں کا راج تھا۔ حافظ صاحب ممدوح کی علمی شہرت کافی پھیل چکی تھی۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے وزیر فقیر عزیز الدین (متوفی 1260ھ) کو ان کے علم و کمال کا پتا چلا تو وہ بگہ گئے اور اصرار کر کے حافظ غلام محی الدین کو لاہور لے آئے۔ انھوں نے یہاں بازار حکیماں کی لال مسجد میں سلسلۂ درس جاری کر دیا۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا، جن میں مولانا غلام رسول بھی شامل تھے۔ تقریباً تیس سال وہ اس مسجد میں پڑھاتے رہے۔ پھر بیمار ہو گئے اور اپنے گاؤں بگہ چلے گئے۔ وہاں بھی بیماری کی حالت میں سلسلۂ درس جاری رکھا، حافظ صاحب ممدوح حلیم الطبع، کثیر المطالعہ اور کثیر الدرس عالم دین تھے۔

مولانا ممدوح کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں مولانا غلام رسول، حافظ ولی اللہ لاہوری، مولانا شاہ محمد فیروز پوری اور مولانا نورالدین چکوڑوی شامل ہیں۔

انھوں نے 30 شوال 1273ھ (22۔ جون 1857ء) کو اپنے آبائی گاؤں بگہ میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔ ''خورشید عالم'' سالِ وفات نکلتا ہے۔[1]

مولانا حافظ غلام محی الدین بگوی کی وفات کے بعد ان کے دو بیٹوں مولانا غلام محمد بگوی اور مولانا عبدالعزیز بگوی نے درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کی خاندانی روایت کو قائم رکھا۔

[1] ملاحظہ ہو حدائق الحنفیہ ص 476 تا 478۔ تذکرہ علمائے ہند ص 157 تا 158۔

حافظ احمد الدین بگوی

مولانا حافظ غلام محی الدین بگوی کے چھوٹے بھائی مولانا حافظ احمد الدین بگوی تھے جو 1223ھ (1808ء) کو بمقام بگہ پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید کا دسواں پارہ حفظ کر رہے تھے کہ بڑے بھائی (حافظ غلام محی الدین) کے ساتھ تحصیل علم کے لیے دہلی جانے کا فیصلہ کیا، لیکن روانگی سے پہلے تھوڑے عرصے میں پورا قرآن مجید بھی حفظ کر لیا اور بھائی سے بعض درسی کتابیں بھی پڑھ لیں۔ نہایت ذہین اور ذکی طالب علم تھے۔ اس کے ساتھ ہی تقویٰ اور صالحیت کی دولت بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ چودہ سال دہلی میں اقامت گزیں رہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی سے کتبِ حدیث پڑھیں اور سند حدیث لی۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو انھیں اور ان کے برادرِ کبیر حافظ غلام محی الدین کو حاصل ہوا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد واپس اپنے وطن بگہ آئے اور بڑے بھائی کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ ایک غیر معروف گاؤں تھا جس نے ان حضرات کے علم و فضل کی وجہ سے بڑی شہرت پائی اور تشنگانِ علوم کے لیے باعث کشش ہوا۔

مولانا حافظ احمد الدین بگوی خوش کردار، بلند اخلاق اور ہم دردِ خلائق عالم دین تھے۔ بالخصوص طلبا پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اس کے علاج معالجے کا انتظام کرتے اور اسے اپنے ہاتھ سے دوا تیار کر کے دیتے۔

1856ء میں لاہور کی بادشاہی مسجد سکھوں کے قبضے سے چھڑا کر مسلمانوں کی تحویل میں دی گئی تو ایک روایت کے مطابق انہی مولانا احمد الدین بگوی کو اس کے امام مقرر کیا گیا تھا۔

مولانا غلام محی الدین اور مولانا احمد الدین بگوی نے درس و تدریس کے سلسلے میں یہ پروگرام بنا رکھا تھا کہ ان میں سے ایک بھائی چھ مہینے لاہور رہتا تھا اور ایک چھ مہینے گاؤں میں۔ اس طرح دونوں بھائیوں کا باری باری سے لاہور اور بگہ میں چھ چھ مہینے کے لیے درس و تدریس اور افتا و اصلاح کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

مولانا احمد الدین بگوی سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے تحصیل علم کی، جن میں مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ) حافظ ولی اللہ لاہوری، مولانا کرم الٰہی بھیروی، مولانا غلام علی قصوری اور مولانا غلام قادر بھیروی کے اسمائے گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔

مولانا احمد الدین نے تدریس کے علاوہ تصنیفی خدمات بھی سرانجام دیں اور بعض درسی کتابوں پر حواشی لکھے۔ لیکن نہ وہ ان حواشی پر نظر ثانی کر سکے اور نہ ان کی طباعت ہوسکی۔ وہ مسودے طلبا کے ہاتھ آئے اور انھوں نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کے حواشی یا تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

① احمدیہ حاشیہ شرح ملا جامی

② حاشیہ خیالی

③ حاشیہ مطوّل

④ ضیاء الصرف شرح صرف میر

⑤ دلیل المشرکین (عربی) یہ کتاب 1259ھ (1843ء) میں مکمل ہوئی۔ اس کا خطی نسخہ جو خود فاضل مؤلف کے ہاتھ کا مکتوبہ ہے، مولانا عبدالحمید سواتی (بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجراں والا) کے پاس موجود تھا۔ انھوں نے اصل متن سے اس کا

ترجمہ ''ایضاح المومنین'' کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ اس کتاب میں شرک کی مختلف قسمیں بیان کی گئی ہیں اور قرآن و حدیث اور آثار سلف کے حوالوں سے اس کی تردید کی گئی ہے۔

⑥ ایک کتاب مسئلہ غنا سے متعلق ہے۔

مولانا ممدوح طبعِ موزوں رکھتے تھے اور شاعر بھی تھے۔

انھوں نے 13۔شوال 1286ھ (16۔جنوری 1870ء) کو بگہ میں وفات پائی اور جامع مسجد بھیرہ کے قریب دفن کیے گئے۔ لفظ ''غفور'' سے سالِ وفات برآمد ہوتا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا احمد الدین اپنے بڑے بھائی مولانا غلام محی الدین سے تیرہ سال چھوٹے تھے اور ان سے تیرہ سال بعد فوت ہوئے۔ قمری حساب سے مولانا غلام محی الدین کی تاریخ ولادت محرم 1210ھ اور عیسوی حساب سے اگست 1795ء ہے اور مولانا احمد الدین کی 1223ھ (1808ء) ہے۔ اب تاریخ وفات ملاحظہ ہو۔ مولانا غلام محی الدین کی تاریخ وفات 30 شوال 1273ھ (22۔جون 1857ء) ہے اور مولانا احمد الدین کی 1286ھ (1869ء)۔ [1]

مولانا غلام رسول قلعوی نے مولانا غلام محی الدین اور مولانا احمد الدین دونوں بھائیوں کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان میں سے کس استاذ سے کون سی کتاب پڑھی۔ حدیث شریف کی کتابیں انھوں نے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے پڑھیں۔ میاں صاحب کا ذکر ان شاء اللہ آئندہ صفحات

[1] نزہۃ الخواطر ج 7 ص 54 (طبع ملتان 1992ء۔1413ھ) حدائق الحنفیہ ص486۔487۔ نیز دیکھیے ص 476 تا 478۔

میں آئے گا۔

اب آخر میں ایک گزارش سنیے۔!

اس باب کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ مولانا غلام رسول سب سے پہلے تحصیل علم کے لیے لاہور میں بازار حکیماں کی لال مسجد میں حافظ غلام محی الدین بگوی کی خدمت میں آئے۔ حافظ غلام محی الدین بگوی کے تذکرہ نگاروں نے بھی یہی لکھا ہے کہ بازار حکیماں کی لال مسجد میں ان کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ لیکن بازار حکیماں میں یہ لال مسجد کہاں تھی اور کس گلی میں تھی؟ اس کا تعین لاہور کا کوئی مورخ نہیں کرتا۔

تاریخ لاہور سے متعلق جن کتابوں کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی، وہ ہیں سید محمد لطیف کی تاریخ لاہور، کنہیا لال کی تاریخ لاہور، نور احمد چشتی کی تحقیقات چشتی اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کی ''تاریخی مساجد لاہور''۔ ڈاکٹر چغتائی کی کتاب کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، صرف لاہور کی مساجد ہیں۔ اس موضوع کی یہ نہایت اہم اور تحقیقی کتاب ہے۔ انھوں نے قدیم دور کے لاہور کی 87 مسجدوں کی تصویریں بھی کتاب میں شائع کی ہیں۔ یہ کتاب بڑے سائز کے 124 صفحات پر مشتمل ہے جو 1976ء میں ''کتاب خانہ نورس کبیر سٹریٹ اردو بازار، لاہور'' نے شائع کی۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی مقدمہ کتاب (صفحہ 6) میں لکھتے ہیں:

''مولوی غلام محی الدین بن حافظ نور حیات بگوی کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ تیس سال لاہور میں حکیموں کی لال مسجد میں تدریس فرماتے رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی حافظ احمد الدین 1859ء میں بادشاہی مسجد لاہور کے امام تھے۔ مگر آج تک حکیموں کی لال مسجد کا کہیں تعین نہ ہوسکا اور مولوی غلام محی

الدین کے لڑکے مولوی غلام محمد پچھلی صدی میں دیر تک بادشاہی مسجد لاہور کے امام رہے۔ نہ معلوم کیسے کیسے جید عالم و فاضل لاہور میں مقیم رہے اور یہاں مساجد بھی تھیں۔"

معلوم ہوتا ہے جس طرح سکھوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں لاہور کی بہت سی مسجدیں منہدم کردیں، اسی طرح اس مسجد کا بھی خاتمہ کردیا۔ اب اس کا صرف نام رہ گیا ہے، مسجد ختم ہوگئی۔ لہٰذا مولانا غلام رسول کی اس اولیں درس گاہ کا تعین کرنا ممکن نہیں۔

اصحابِ تقویٰ کی تلاش میں

قمری حساب سے مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی ولادت 1228ھ میں ہوئی جو عیسوی حساب سے 1813ء بنتا ہے۔ نیکی کے آثار تو ان میں ابتدائی عمر ہی میں نمایاں ہونے لگے تھے جو بہ فضل الٰہی اس زمانے اور علاقے کے بزرگ کاکا شاہ صاحب کی دعا اور تلقین ونصیحت سے مزید ابھر آئے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کا شوق بھی ذہن میں تیزی سے کروٹ لینے لگا تھا۔ تقریباً بارہ سال کی عمر میں انھوں نے باقاعدہ طلبِ علم کی راہ پر قدم رکھا۔ قمری حساب سے یہ کم وبیش 1240ھ کا زمانہ ہے اور عیسوی حساب سے 25-1824ء کا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ کہیں آنے جانے کے موجودہ ذرائع کا کوئی تصور نہ تھا۔ بالعموم پیدل سفر کیا جاتا تھا اور دورِ حال کے نقطۂ نظر سے کہنا چاہیے کہ ایک گھنٹے کی مسافت پہروں میں طے ہوتی تھی۔ لاہور اور بگہ کے اساتذہ (مولانا حافظ غلام محی الدین اور حافظ احمد الدین بگوی) سے انھوں نے آٹھ سال کے لگ بھگ تعلیم حاصل کی اور بیس برس کی عمر میں اس دور کے مروجہ علوم کی تکمیل کی۔ اس وقت ان کا خاندان کوٹ بھوانی داس میں مقیم تھا۔

قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) میں قیام

اس سے کچھ عرصہ پیشتر مہاراجا رنجیت سنگھ کی فوج کے ایک جرنیل میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) (ساکن موضع مغل چک) نے اپنے گاؤں سے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر ایک نئے گاؤں کی بنیاد رکھی تھی، جہاں اس سے قبل کوٹلی اور شاہ پور نام کے دیہات آباد تھے، جو پنجاب کی سکھ حکومت کی غارت گری سے اجڑ گئے تھے۔ یہ نیا گاؤں قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) کے نام سے موسوم ہوا۔ گوجراں والا سے یہ گاؤں بجانب مغرب دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) اس زمانے کے سکھوں میں شریف آدمی تھا اور مولانا غلام رسول کے والد حافظ رحیم بخش کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنے استاذِ مکرم حافظ رحیم بخش سے اپنے آباد کردہ گاؤں قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) تشریف لانے اور وہاں مستقل طور سے سکونت اختیار کرنے کی درخواست کی لیکن انھوں نے انکار کردیا۔ ان کی وفات کے بعد اصرار کرکے وہ ان کے بڑے بیٹے (حکیم غلام محمد) کو وہاں لے گیا۔ پھر بڑے بھائی حکیم غلام محمد کے کہنے پر مولانا غلام رسول بھی اس گاؤں میں تشریف لے گئے اور دونوں بھائیوں نے قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) میں سکونت اختیار کرلی۔ اس طرح یہ پورا خاندان وہاں آبسا۔ ان کی وجہ سے اور بھی بہت سے لوگ وہاں چلے گئے اور یہ گاؤں دیکھتے ہی دیکھتے آباد ہوگیا۔ مولانا غلام رسول اس وقت مروجہ تعلیم مکمل کرچکے تھے۔

میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) نے ان لوگوں سے نہایت عزت کا برتاؤ کیا۔ وہاں انھوں نے مسجد تعمیر کی، جس میں دن رات میں پانچ وقت اذان گونجنے لگی اور باقاعدہ جمعہ وجماعت کی ادائیگی کا اہتمام کیا گیا۔ دینی مدرسہ قائم کیا، جس میں درس وتدریس

کے سلسلے کا آغاز ہوا اور تھوڑی مدت میں قلعہ میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) دینی علوم کا ایک بڑا مرکز قرار پا گیا۔ اس طرح مولانا غلام رسول کے بچپن کے اس خواب کی تعبیر سامنے آئی جس میں انھوں نے دیکھا تھا کہ وہ راجا رنجیت سنگھ کے طویلے میں اذان دے رہے ہیں۔ یہ واقعۃً راجا رنجیت سنگھ کا طویلہ تو نہ تھا، البتہ اس کے سکھ جرنیل میہاں سنگھ (قلعہ اسلام) کا آباد کردہ گاؤں اور تعمیر کردہ مضبوط قلعہ تھا۔

اس سے قبل ضلع گجرات کے محکمۂ مال کے اہل کاروں اور مولانا غلام رسول کے رشتے داروں نے ان سے کہا کہ سکندر پوران کے اسلاف کا آباد کردہ گاؤں ہے۔ اس کے خانۂ ملکیت میں اپنا نام لکھوالیں اور وہاں کی زمین کا جو حصہ انھیں ملتا ہے لے لیں، لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ جب ہم نے اس گاؤں کی سکونت ترک کر دی ہے اور یہاں سے چلے گئے ہیں تو یہاں کی زمین جائداد پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ جہاں ہم رہیں گے، اللہ اپنی مہربانی سے ہمیں وہیں دے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرما دیے کہ قلعہ اسلام میں کاروبار اور زمین جائداد کی صورت میں ان کے گزراوقات کا باعزت اور معقول سلسلہ قائم ہو گیا۔

محبت الٰہی کا جذبۂ صادقہ

مولانا غلام رسول کے قلبِ صافی میں محبتِ الٰہی کا انتہا درجے کا جوش اور تعلق باللہ کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا جو انھیں کسی مرشدِ کامل کے دروازے پر حاضری کے لیے مجبور کرتا تھا۔ کسی نے بتایا کہ علاقہ بونیر میں ایک بزرگ اخوند صاحب رہتے ہیں جو متقی اور ولی اللہ شخص ہیں۔ بہت سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان

سے صالحیت کا درس لیتے ہیں۔ مولانا غلام رسول بھی وہاں پہنچے اور ان سے ملاقات کی۔ وہ بزرگ اگرچہ عابد و زاہد تھے، لیکن کا کا شاہ صاحب نے چھوٹی عمر میں زہد و عبادت اور توحید و سنت کے جو اسباق انھیں پڑھائے تھے اور اصحاب تقویٰ کے جن اوصاف سے انھیں مطلع کیا تھا، وہ ان میں نہیں پائے جاتے تھے۔ مولانا دو دن ان کے پاس ٹھہرے، پھر واپس لوٹ آئے۔ راستے میں علاقہ ہزارہ کے ایک گاؤں تربیلا پہنچے تو وہاں کے نمبردار کے گھر قیام کیا۔ نمبردار نے مقصدِ سفر دریافت کیا تو انھوں نے پوری روداد بیان فرما دی۔

سید امیر صاحب ساکن کوٹھا کی خدمت میں

گاؤں کا یہ نمبردار (یا چودھری ۔ ارباب) اخوند سید محمد امیر (ساکن کوٹھا، تحصیل صوابی ضلع مردان) کا مرید تھا۔ اس نے مولانا غلام رسول کو سید محمد امیر صاحب کے متعلق بتایا اور ان کے زہد و تقویٰ اور علم و عمل کے واقعات سنائے تو وہ نہایت متاثر ہوئے اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا عزم کیا۔ رات بہ مشکل وہاں بسر کی اور فجر کی نماز پڑھتے ہی موضع کوٹھا کی طرف روانہ ہوگئے۔ پہاڑی راستہ اور مولانا اس نواح کے اجنبی مسافر۔ بڑی مشکل سے وہاں پہنچے۔ سید امیر صاحب کو دیکھتے ہی دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اسی آن ان سے سلسلۂ بیعت سے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا: میں مولانا اسماعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ کے مرشد سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ سے بیعت ہوں اور انہی سے میں نے فیض پایا ہے۔

یہ الفاظ سنتے ہی مولانا غلام رسول خوش ہوگئے اور طویل و مشکل سفر کی تکان دور

ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ نئی زندگی مل گئی ہے۔ کاکا شاہ صاحب نے نصیحت کرتے ہوئے جس قسم کے اولیاء اللہ کا ذکر فرمایا تھا اور جن اوصاف حسنہ کے لوگوں کی نشان دہی فرمائی تھی، وہ تمام اوصاف سید امیر صاحب ممدوح کی ذات گرامی میں پائے جاتے تھے۔

سید صاحب نے بھی انھیں دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور اٹھ کر سینے سے لگایا۔ فرمایا تیری خوشی کا بھی کوئی حساب نہیں اور میری خوشی کا بھی کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے آج تک تیرے جیسا مشتاقِ سنت شخص نہیں ملا۔ الحمد للہ تجھے اللہ نے بدعتی پیروں اور غلط روصوفیوں کی صحبت سے محفوظ رکھا۔

سید صاحب اپنے ملنے والوں اور ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہونے والوں کو وہی وظائف پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اور کتبِ حدیث میں منقول ہیں۔ نیز انھیں احکامِ شریعت کی پابندی کرنے اور نماز روزے کی ادائیگی کی سختی سے تلقین فرماتے۔

چند روز مولانا ان کی خدمت میں رہے۔ پھر اپنے وطن قلعہ اسلام واپس آ گئے۔ اب انھوں نے سلسلۂ درس بند کر دیا تھا اور ہر وقت ذکرِ الٰہی اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہنے لگے تھے۔ لوگوں کو نیک کام کرنے کی تاکید اور منہیات سے روکنا ان کا شب و روز کا معمول قرار پا گیا تھا۔

خواجہ سلیمان تونسوی سے ملاقات کا شوق

کوٹھا (علاقہ مردان) سے واپس آئے تھوڑے دن ہوئے تھے کہ کسی نے بتایا

تونسہ (ضلع ڈیرہ غازی خاں) میں ایک بزرگ خواجہ سلیمان رہتے ہیں، جن کی نیکی اور صالحیت کا بڑا شہرہ ہے۔ مولانا غلام رسول ان سے ملاقات کے لیے تونسہ کو روانہ ہوگئے۔ یہ بھی ایک طویل اور تکلیف دِہ سفر تھا، لیکن انھیں بزرگوں اور دین دار لوگوں سے ملنے کا اتنا شوق تھا کہ سفر کی طوالت اور اذیت رسانی کا انھیں کوئی احساس نہ ہوتا تھا۔ یہ ایک ایسا پُر خلوص جذبہ تھا جو اس راہ کی تمام مشکلات پر غالب آجاتا تھا۔ چلتے چلتے وہ رات کے وقت ایک گاؤں میں پہنچے، جہاں سے تونسہ چند میل کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کی مسجد میں گئے اور نماز پڑھی۔ مسجد کے امام سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ عالم دین ہیں اور حدیث وفقہ پر عبور رکھتے ہیں۔ انھوں نے کھانا کھلایا اور پوچھا کہ کہاں سے آئے اور کدھر کا قصد ہے؟ گفتگو کرتے ہوئے جب امام صاحب کو پتا چلا کہ یہ بھی عالم دین ہیں تو چند مشکل مسائل دریافت کیے، جن کے انھوں نے جواب دیے۔ جواب سے امام صاحب کو اطمینان ہوگیا تو بڑے خوش ہوئے اور کہا آپ کا تونسہ جانا اچھا نہیں بہتر ہے کہ آپ وہاں نہ جائیں''۔

انھوں نے ہر ممکن طریقے سے مولانا کو وہاں جانے سے روکنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے ان کی بات نہیں مانی اور جانے پر مصر رہے۔ جب وہ ان کو سمجھانے سے عاجز آگئے تو دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور کہا:

''یا اللہ! ''تو مولوی غلام رسول کو اس کی ملاقات کا موقع نہ دے۔''

خلاصہ کلام یہ کہ جب مولانا غلام رسول تونسہ گئے تو خواجہ سلیمان وہاں نہیں تھے، کہیں لمبے دورے پر گئے تھے۔ مولانا واپس اسی گاؤں میں آئے اور امام صاحب کو

سرگزشت سنائی تو انھیں بڑی مسرت ہوئی۔[1]

تونسہ کو دوبارہ روانگی اور خواجہ صاحب سے ملاقات

مولانا کا یہ بھرپور جوانی کا زمانہ تھا اور صحت بہت اچھی تھی۔ بزرگوں سے ملاقات اور حصول فیض کا شوق انھیں ہر اس جگہ لے جاتا، جہاں کسی بزرگ کی موجودگی کا پتا چلتا۔ اسی شوق کی وجہ سے (جیسا کہ ابھی بتایا گیا) وہ تونسے گئے، لیکن وہاں کے پیر خواجہ سلیمان سے ان کی ملاقات نہ ہوئی۔ اب کچھ عرصے کے بعد انھوں نے دوبارہ تونسہ جانے کا فیصلہ فرمایا اور وہاں پہنچ گئے۔ خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی اور ان کی خدمت میں منظوم (فارسی) خط پیش کیا، جو چوالیس (44) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

در یغا زندگانی رفت برباد
زِ جور نفسک امّارہ فریاد

منادی می زند کو س رواروو
کہ زیں دار د سپنجی راہگراشو

نباشد دائما ایں سنبل و گل
نہ شورِ قمری و نے سوزِ بلبل

خزاں افتد دریں باغ و بہاری

---

[1] سوانح حیات مولانا غلام رسول ص44، 45۔

کند ابر فنا کش آب داری
نماند نرگس ونے لالہ زاراں
نہ ایں حسن و جمالِ گلغداراں
کنوں وقت است شواز خواب بیدار
دل اندر یار بند و دست درکار
بسے دور است سامانِ سفر کن
زپا بندیٔ ایں دینا گزر کن
کہ چوں برہم زندایں کاروبارت
بزیرِ خاکِ گور افتد گزارت

مولانا فرماتے ہیں: "ان شعروں سے خواجہ سلیمان بہت خوش ہوئے۔
چند روز خواجہ سلیمان نے مجھے اپنے ہاں ٹھہرایا۔ مجھ پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب تم کو مرید ہونے ضرورت نہیں۔ تم خود لوگوں کو اپنا مرید بنایا کرو۔ بعد رخصت مَیں گھر آیا۔"①

ایک اور بزرگ کی خدمت میں

کچھ دن مولانا غلام رسول اپنے گھر (قلعہ اسلام) قیام فرمارہے۔ پھر اپنے سسرال فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداس پور چلے گئے جو قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستانی پنجاب میں شامل کیا گیا) اس علاقے کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ علاقہ تخت

① سوانح حیات مولانا غلام رسول ص 47۔48

ہزارہ کے موضع ''بچے'' میں ایک باکمال ولی رہتے ہیں جنھیں حافظ صاحب کہا جاتا ہے۔ یہ سن کر وہ فتح گڑھ چوڑیاں سے تخت ہزارہ کو چل پڑے۔ دوسرے سفروں کی طرح یہ سفر بھی پیدل طے کیا، کیوں کہ اس زمانے میں نہ ریل تھی، نہ موٹریں تھیں۔ حافظ صاحب کے پاس پہنچے تو انھوں نے فرمایا کہ آپ کا معاملہ میری رسائی علم سے بہت بلند ہے۔ آپ فلاں بزرگ سے ملیے۔ وہ موضع گڑھی اعواناں میں ملک رحمت خاں کے گھر رہتے ہیں۔ ان بزرگ کے نام حافظ صاحب نے خط بھی دیا۔ وہ اس گاؤں میں ملک رحمت خاں کے گھر پہنچے تو انھوں نے بتایا کہ وہ باہر کھیتوں میں لوگوں کے گدھے چرانے گئے ہیں۔

بات یہ ہے کہ وہاں کے لوگ گدھوں سے بہت کام لیتے تھے اور جب گدھے زیادہ کم زور یا بیمار ہوجاتے تو وہ انھیں چھوڑ دیتے، ان بزرگ کی عادت تھی کہ وہ بیمار اور کم زور گدھوں کا فی سبیل اللہ علاج کرتے اور جب وہ تندرست ہوجاتے تو مالک انھیں محنت مزدوری کے لیے لے جاتے اور بیمار گدھوں کو چھوڑ دیتے، جن کا یہ بزرگ علاج کرتے۔ اس طرح گدھوں کے علاج معالجے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا۔

مولانا ان بزرگ کے پاس کھیتوں میں گئے۔ اس وقت ایک طالب علم مولانا کے ساتھ تھا جو اثنائے سفر میں ان سے علم بیان ومعانی کی کتاب مطول پڑھتا تھا۔ اس بزرگ نے دور سے مولانا کو دیکھ کر آواز دی کہ اپنے ساتھی کو یہیں چھوڑ دیں، اکیلے میرے پاس آئیں۔ مولانا ان کے پاس گئے تو وہ نہایت تپاک سے ملے اور بیٹھنے کے لیے زمین پر چادر بچھائی۔ بڑے احترام سے چند باتیں کیں۔ کہا ایک وقت گوشت

روٹی اور پلاؤ کھاؤ، دوسرے وقت دال روٹی خود بھی کھاؤ، لوگوں کو بھی کھلاؤ۔

مولانا فرماتے ہیں: اس وقت سے میرا شوقِ ذکر الٰہی بھی بڑھ گیا، میری شہرت بھی مختلف علاقوں میں پھیل گئی اور لوگ بہ کثرت میرے پاس آنے لگے۔[1]

یہ بزرگ دراصل ایک مجذوب تھے جنھوں نے مجذوبانہ انداز میں مولانا غلام رسول رحمہ اللہ سے چند باتیں کیں۔

پھر سید محمد امیر (ساکن کوٹھا) کی خدمت میں

اب صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ انھیں کسی کل چین نہ آتا تھا۔ صلحاء کی خدمت میں حاضری اور ان سے گفتگو ان کا مقصدِ حیات قرار پا گیا تھا۔ اس بزرگ کے پاس سے آئے تو سید محمد امیر (ساکن کوٹھا) کے ہاں جانے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ ان کے رشتے دار اور بھائی کہنے لگے تھے کہ اس شخص پر جنون کا غلبہ ہوگیا ہے اور اس کے پاؤں میں چکر آ گیا ہے۔ کوئی کہتا یہ آسیب زدہ ہے۔ کسی کا خیال تھا یہ آبِ حیات کی تلاش میں ہے، لیکن انھیں کسی شخص کی کسی بات کی کوئی پروا نہ تھی۔ ان کی طعنہ زنی اور اس قسم کی باتوں سے ان کے شوقِ ملاقاتِ صالحین میں مزید اضافہ ہوتا تھا۔ بہر حال وہ کوٹھا تشریف لے گئے۔ یہ وہاں ان کی دوسری حاضری تھی۔

انھوں نے سسی پنوں کے رنگ میں ایک پنجابی نظم میں اپنی اس وقت کی حالت بیان کی ہے۔ اس میں اپنے جدِ امجد حافظ نظام الدین خادم کا ذکر بھی کیا ہے جن کا شمار اس دور میں فارسی کے بڑے شعرا میں ہوتا تھا۔ انھوں نے نظامی گنجوی کے تتبع میں

---

[1] سوانح حیات مولانا غلام رسول ص 48-49

مثنوی لکھی۔ اس بنا پر انھیں ''نظامی گنجوی ثانی'' قرار دیا جاتا تھا۔

ان اشعار میں انھوں نے اپنے والد ماجد حافظ رحیم بخش کا تذکرہ بھی کیا ہے اور والد نے بیٹے کے حصولِ علم کے لیے جو کوشش کی، اس کی طرف بھی وہ اشارہ فرماتے ہیں۔

پھر اپنے اساتذہ مولانا غلام محی الدین بگوی اور ان کے برادرِ صغیر مولانا احمد الدین بگوی کے علم و فضل اور عمل و کردار کا ذکر بھی فرماتے ہیں اور ان کے لطف و کرم اور شفقت و ہدایت کی نشان دہی کرتے ہیں۔

صوفیاے کرام سے ملاقات کے شوق کی بھی اپنے انداز میں ان اشعار میں وضاحت فرمائی ہے۔ سید محمد امیر (کوٹھا) کے بابِ صالحیت پر حاضری کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ سید صاحب ممدوح سے وہ بہت متاثر ہیں اور ان سے جو فیض پایا، اسے حاصل زندگی قرار دیتے ہیں۔

اب ذیل میں ان کے وہ پنجابی اشعار ملاحظہ فرمایے جو ان کے صاحب زادۂ گرامی مولانا عبدالقادر نے اپنی کتاب ''سوانح حیات مولانا غلام رسول'' میں درج فرمائے ہیں۔ ان اشعار میں اردو اور فارسی کے الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔

نظام الدین بوہم جدِّ مغفور
فضیلت میں ہوا ہر طرف مشہور
تے سخاوت میں یگانہ
بکسرِ نفس بے مثلِ زمانہ!
خزانہ فیض ی کنجی زباں سی
نظامی گنجوی ثانی بیاں سی
کیا مجھ پر کرم سے اک نظارہ

ہو یا غفلت دا پردہ پارہ پارہ

کیتی میں پر کرم سیتی عنایت

ہوئی تحصیل کرنیدی ہدایت

اوھناں دے بعد حضرت قبلہ گاہی

رحیم بخش میرے تکیہ گاہی

عجیبہ حسن صورت کیا معنے

تعالی اللہ چہ دور اندیش دانا

کیتی اشفاق تے وافر عنایات

بھیجا لاہور میں دے خرچ حاجات

بخدمت مولوی صاحب یگانہ!

جو سن ممتاز فضلائے زمانہ

جو ساکن موضع بگہ شریف است

غلام محی الدین اسم لطیف است

دوجے حضرت میرے ہن احمد الدین

دونوں بھائی مبارک فیض آئین

کیتو نے علم دینی دی ہدایت

میرے پر لطف و شفقت بے نہایت

جو کس منہ نال انھاں نوں صلاحیں

مگر بیٹھا کراں ہر دم دعائیں

ہو یا پھر صوفیاں دا شوق غالب
پھراں اس درددا ہرطرف طالب
غلام ایہ پُر گناہ بے چارہ گم نام
طلب دے دردنے چھوڑا نہ آرام
ہوا آخرنوں آوارہ وطن سے
نہ خویشاں سے خبر نہ خو یشتن سے
چلا جذبہ الٰہی میں گرفتار
حضرت صاحب کوٹھاکے دیدار
اونھاں روزاں میں آہا شوق غالب
پھراں اس درد دا ہر طرف طالب
حکایت عاشقانہ بہت بھاوے
کہانی عشق دی دلنوں سکھاوے
خصوصاً بات سسی دی زیادہ
کرے سوزاں دا دروازہ کشادہ
اسے کارن و چھوڑے دی حکایت
تھلاں دے وچ رلیندی روایت
لکھی اول میں درداں دی کہانی
ہوئی باقی موں سسی بار ثانی

لکھیا میں درد اپنے دافسانہ
سسی پنوں دا قصہ کر بہانہ

حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ سے ملاقات

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کو سید محمد امیر کی خدمت میں کوٹھا گئے ابھی دو دن ہوئے تھے کہ حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ بھی وہاں تشریف لے گئے۔ سید امیر صاحب ممدوح نے ان کو دیکھا تو نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ حضرت عبداللہ صاحب غزنوی رحمہ اللہ بھی ان سے مل کر بے حد مسرور ہوئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ سید امیر صاحب نے حضرت عبداللہ صاحب سے بہ درجہ غایت عزت کا برتاؤ فرمایا اور ان کی روحانیت و صالحیت سے بہت متاثر ہوئے۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سید عبداللہ صاحب نے محض ان کے سلسلۂ سلوک میں داخل ہونے کے لیے اخوند سید امیر صاحب کی بیعت کی تھی ورنہ انھیں بیعت کی ضرورت نہ تھی۔ [1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سید عبداللہ غزنوی حسنات و صالحیت کے بہت اونچے مرتبے پر فائز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا غلام رسول نے حضرت عبداللہ صاحب سے رشتۂ اخوت قائم کیا۔ ایک روز یہ دونوں حضرات سید امیر صاحب کی خدمت میں حاضر تھے کہ انھوں نے مولانا غلام رسول سے مخاطب ہوکر فرمایا: تمھارے اور عبداللہ کے درمیان اخوت کا نور عجیب طرح سے آتا جاتا ہے۔ تم دونوں کو دیکھ کر مجھے بڑا حظ

[1] سوانح مولانا غلام رسول ص 51۔

حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم دونوں کی محبت میں اضافہ فرمائے۔ ①

قلعہ اسلام کو روانگی

چند روز یہ دونوں کوٹھا میں سید صاحب کی خدمت میں رہے۔ پھر قلعہ اسلام کو روانہ ہو گئے۔ دورانِ سفر میں دونوں نے کتبِ حدیث پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ چلتے چلتے گجرات کے قریب پہنچے تو حضرت عبداللہ صاحب نے فرمایا مجھے یہاں ایک مجذوب بزرگ کی خوشبو آ رہی ہے۔ وہ اس لائق ہے کہ اس سے ملاقات کی جائے۔ اب وہ اس بزرگ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اس بزرگ سے پوچھیں گے کہ حدیث کہاں اور کس سے پڑھی جائے۔

اس بزرگ کے پاس اس وقت چند لوگ بیٹھے تھے۔ اس نے ان سے کہا ایسے اوصاف کے دو آدمی آ رہے ہیں جو اپنے عمل و کردار کی بنا پر صحابہ کرام کا نمونہ ہیں۔ ان کے بیٹھنے کے لیے صاف ستھرا کپڑا بچھاؤ اور مجھے بھی پہننے کے لیے اچھا لباس دو۔ یہ دونوں اس بزرگ مجذوب کے قریب پہنچے تو اس نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور اپنے قریب صاف ستھرے کپڑے پر بٹھایا۔ دہلی کی طرف اشارہ کر کے کہا: جنت اس طرف ہے۔

جب یہ دونوں اس بزرگ سے اجازت لے کر رخصت ہونے لگے تو کہا: اس شخص کا لباس دیکھ کر کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا۔ وہ مسکین صورت شخص ہے۔ اس کا نام سید نذیر حسین ہے۔ اس سے ضرور حدیث پڑھنا۔

① سوانح مولانا غلام رسول ص 51۔

بزرگ کے یہ الفاظ ان کے لیے اطمینان کا باعث ہوئے اور پھر یہ دونوں قلعہ اسلام پہنچے۔۔۔ سید عبداللہ صاحب نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معلوم ہوا ہے کہ چند مہینے ٹھہر کر پڑھنے کے لیے جانا۔

کوٹھا سے چلتے وقت اخوند سید امیر صاحب نے مولانا غلام رسول رحمہ اللہ سے فرمایا تھا کہ آپ لاہور کو اپنی قیام گاہ بنائیں اور وہاں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کریں۔ اب یہ دونوں حضرات قلعہ اسلام سے لاہور چلے گئے۔ چند روز وہاں ٹھہرے، پھر امرتسر کا قصد کیا۔ وہاں باغ والی مسجد میں حافظ محمود کے پاس مقیم ہوئے۔ وہاں حافظ صاحب نے حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔

چھٹا باب

حضرت اخوند سید محمد امیر صاحب رحمۃ اللہ
(کوٹھا والے)

گزشتہ صفحات میں مولانا غلام رسول کے مرشد حضرت اخوند سید محمد امیر رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر متعدد مرتبہ آیا ہے۔ ذیل میں ان کے مختصر حالات بیان کیے جاتے ہیں۔

ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد امیر بن محمد سعید بن یار محمد بن عبدالغفور بن مہر بیگ۔ سلسلۂ نسب کے یہ تمام بزرگ علم وصلاح کی بنا پر اپنے علاقے اور عہد میں خاص شہرت کے مالک تھے اور ہر حلقے میں عزت واحترام کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔

ولادت

سید امیر صاحب جو حضرت جی کے عرف سے معروف ہیں۔ 1210ھ (1797ء) کو موضع کوٹھا (تحصیل صوابی مردان) میں پیدا ہوئے، پیدائش ساتویں مہینے میں ہوئی۔ پیدائش کے وقت والدہ وفات پاگئی تھیں۔ ان سے بڑی سات بہنیں تھیں، جنھوں نے اپنے اس چھوٹے بھائی کی پرورش کی۔ نہایت خوب صورت اور صحت مند تھے۔ بہنیں اپنے اس بھائی کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

اساتذہ

سید امیر کے والد محمد سعید اور چچا محمد قابل دونوں عالم اور فقیہ تھے۔ ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کی اور انہی سے علوم عربیہ اور فقہ و اصول کی بعض کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں مندرجہ ذیل حضرات سے استفادہ کیا۔

① مولانا محمد عظیم: یہ ''میاں صاحب گنج والے'' کے عرف سے معروف تھے، اس لیے کہ جامع مسجد گنج کے امام و خطیب تھے اور وہیں ان کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ اپنے علاقے کے مشہور اور بڑے عالم ہونے کی وجہ سے انھیں ''بحر العلوم'' کہا جاتا تھا۔ اچھے مدرس اور نامور خطیب تھے۔

② مولانا حافظ محمد احسن: انھیں ''حافظ دراز پشاوری'' کہا جاتا تھا۔ موضع کوچبان (تحصیل وضلع پشاور) علاقہ خلیل سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے صحیح بخاری کی شرح لکھی۔ علاوہ ازیں قاضی مبارک میر زاہد اور ملا جلال پر حواشی تحریر کیے۔ پشاور کی مسجد مہابت خاں میں درس حدیث دیا کرتے تھے۔ سید محمد امیر (کوٹھا) نے ان سے حدیث پڑھی اور سند لی۔

③ مولانا منصور علی: اپنے عہد کے عالم و فاضل اور ممتاز مدرس تھے۔ سید اخوند امیر نے ان سے بھی بعض درسی کتابیں پڑھیں۔[1]

سید احمد شہید بریلوی کے حلقۂ بیعت میں

سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بغرض جہاد مورخہ 7۔ جمادی الاخری 1241ھ

[1] سوانح حیات حضرت سید محمد امیر ص 137 تا 140۔

(17۔ جنوری 1826ء) کو تقریباً چھ سو مجاہدین کے ساتھ ہندوستان سے صوبہ سرحد کے آزاد علاقے کی طرف ہجرت کی تھی اور اس سلسلے کے تمام معاملات مولانا اسماعیل دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد تھے۔ یہ لوگ سید احمد شہید کے آبائی مسکن رائے بریلی سے روانہ ہوکر بندھیل کھنڈ، گوالیار، ٹونک، اجمیر، صحرائے ماڑواڑ، عمر کوٹ، حیدر آباد (سندھ)، شکار پور، کوئٹہ، قندھار، غزنی اور کابل سے ہوتے ہوئے نومبر 1826ء کے اواخر میں پشاور پہنچے۔ یہ کم وبیش تین ہزار میل کا طویل سفر تھا، جس میں تپتے ہوئے صحرا بھی تھے، جہاں میلوں تک پانی کا ایک قطرہ نہ ملتا تھا۔ بڑے بڑے دریا بھی تھے، دشوار گزار پہاڑ اور برفستان بھی تھے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں نے دس مہینوں میں یہ تکلیف دہ مسافت طے کی۔

اس علاقے کے لوگ بھی مجاہدین میں شامل ہوگئے تھے اور ان کی شمولیت کی وجہ سے مجاہدین کی تعداد ڈیڑھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت رنجیت سنگھ کی سکھ فوج کا جرنیل بدھ سنگھ اس نواح میں موجود تھا۔ اس کی فوج سے مجاہدین کی پہلی جنگ اکوڑہ خٹک کے مقام پر 20۔ جمادی الاولیٰ 1242ھ (20۔ دسمبر 1826ء) کو بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب کو ہوئی، جب کہ مجاہدین میں سے نو سو آدمیوں نے دشمن پر شب خون مارا۔ اس کے بعد جنگوں کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوگیا۔

سید احمد شہید اس علاقے میں پہنچے تو یہاں کے جن حضرات نے ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی، ان میں اخوند سید محمد امیر (کوٹھا والے) کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ بیعتِ اقامتِ شریعت تھی۔ بیعت کے بعد انھیں ان کے قریہ کوٹھا کا قاضی مقرر کردیا گیا تھا۔ 15/شعبان 1244ھ (20۔ فروری 1829ء)

کو ان کے نام باقاعدہ قضانامہ جاری ہوا۔

قضا کی یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی جو اخوند سیدا میر صاحب کے سپرد ہوئی۔ اس سلسلے میں وہ اردگرد کے دیہات وقصبات میں جاتے اور جہاں کوئی امر خلافِ شریعت پاتے اس کا انسداد کرتے۔ اس منصب کے تمام تقاضوں کو انھوں نے احسن طریقے سے پورا کیا۔ تھوڑی مدت میں تمام علاقے کی حالت بدل گئی اور لوگ احکامِ شریعت پر عمل کرنے لگے۔

قلعہ اٹک کی تسخیر کا مسئلہ

سید احمد شہید بریلوی نے صوبہ سرحد کے ایک مقام ''ہنڈ'' میں مجاہدین کا مرکز قائم کیا تھا۔ انہی دنوں قلعہ اٹک کی تسخیر کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ منصوبہ سوات کے اخوند عبدالغفور کے مکان میں خفیہ طور سے مشورہ کرکے بنایا گیا تھا۔ مشورے میں اخوند سیدا میر (کوٹھا والے) اخوند عبدالغفور اور سید احمد شہید موجود تھے۔ طے یہ پایا تھا کہ اٹک میں سید امیر صاحب کے بہت سے مخلص اور قابل اعتماد عقیدت مند رنگ ریز موجود ہیں۔ کچھ لوگ سیڑھیاں اور مضبوط رسّے وغیرہ لے کر ان کے پاس پہنچ جائیں اور وہ ان کی مدد کریں تو قلعے کے اوپر چڑھ کر اس پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ قلعہ اٹک پر قبضے کے بعد مجاہدین کے لیے پنجاب کا رخ کرنا اور وہاں سکھوں سے جنگ کرنا آسان ہو جائے گا۔ لیکن اخوند عبدالغفور نے غلطی سے اس خفیہ منصوبے کی اطلاع خادے خاں کو دے دی، جو سید صاحب اور مجاہدین کا سخت مخالف تھا۔ اس وقت قلعہ اٹک کا انتظام سکھ حکومت کے ایک اہل کار خزانہ مل کے پاس تھا۔ خادے خاں نے یہ

اطلاع پاتے ہی ایک تیز سوار حاکم ہزارہ ہری سنگھ نلوہ کے پاس بھیج دیا۔ اس نے فوراً خزانہ مل کو حکم دیا کہ قلعے کی حفاظت کا انتظام سخت کر دیا جائے اور سید امیر (کوٹھا) کے ارادت مندوں کے گھروں کی تلاشی لی جائے۔ چنانچہ تلاشی لی گئی اور سامان برآمد ہو گیا۔ رنگ ریز گرفتار کر لیے گئے، جنھیں بعد میں موت کی سزا ہوئی۔

اخوند عبدالغفور کو اپنی بے احتیاطی اور غلطی کے الم ناک نتیجے کا علم ہوا تو اسے اس درجہ ندامت ہوئی کہ اپنا مسکن چھوڑ کر کسی نامعلوم جگہ پر چلا گیا۔ پھر کئی سال بعد اس کا سراغ ملا۔ اسی وجہ سے سید امیر صاحب سے اس کی مخالفت بلکہ عداوت ہوئی۔ انجام کار سید امیر صاحب ممدوح پر "وہابیت" کا الزام لگا کر انھیں بہت سی دقتوں میں الجھائے رکھا۔[1]

اب سوال یہ ہے کہ خادے خاں سید احمد شہید اور مجاہدین کا مخالف کیوں ہوا؟

خادے خاں علاقہ سرحد کا ایک غیور و جسور رئیس تھا۔ اس نے سید صاحب سے اظہارِ عقیدت میں سبقت کا شرف حاصل کیا۔ انھیں مہمان بنا کر اپنے ہاں لے گیا اور وہیں امامتِ جہاد کی بیعت کی، لیکن افسوس ہے کہ سید صاحب کی مخالفت میں بھی پہل اسی نے کی۔ وہ مقامی رسوم کو اسلامی احکام پر ترجیح دیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ضدی اور خود پسند شخص تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ موضع پنجتار کے فتح خاں اور موضع زیدہ کے اشرف خاں اپنے اپنے علاقے کے رئیس تھے، جو سید صاحب کے عقیدت مند تھے اور سید صاحب بھی ان دونوں کو [illegible] تھے، لیکن خادے خاں ان دونوں کو

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا غلام رسول مہر [illegible] سید احمد شہید حصہ دوم ص 83 تا 87۔ نیز دیکھیے حالات زندگی سید امیر صاحب ص 22 تا 223 [illegible]

اپنے حریف سمجھتا اور ان کی مخالفت کرتا تھا، اس بنا پر خادے خاں کے دل میں سید صاحب کے متعلق غصے کے آثار ابھر آئے اور ان سے برگشتگی پیدا ہوگئی جو برابر بڑھتی گئی۔ قبائلی زندگی میں یہ سلسلے چلتے رہتے ہیں۔

سید امیر صاحب کی سکھوں سے معرکہ آرائیاں

اخوند سید امیر صاحب بڑے جری اور شجاع بزرگ تھے۔ انھوں نے سید احمد شہید کے سلسلۂ بیعت میں شمولیت کے بعد جہاد میں سید صاحب کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ان کی شہادت کے بعد بھی سکھوں سے جہادی معرکہ آرائیاں جاری رکھیں۔ پھر ملک میں انگریزی حکومت کا دور آیا تو ان کے خلاف بھی وہ سرگرم عمل رہے۔ انھوں نے ہمیشہ غلط طاقتوں سے پنجہ آزمائی کی اور راہِ حق پر قدم زنی کو فریضۂ حیات قرار دیے رکھا۔ ان کا حلقۂ بیعت بہت وسیع تھا اور ان کے مبایعین و متعلقین ان کا ہر حکم مانتے تھے، اسی وجہ سے اشاعتِ دین اور تبلیغِ حق کے باب میں ان سے انھوں نے بہت کام لیا۔

قید و بند

اخوند سید امیر صاحب چوں کہ انگریزوں کے مخالف تھے اور اپنے عقیدت مندوں کو بھی ان کی مخالفت پر اکساتے تھے، اس لیے انگریزی حکومت نے گرفتار کر کے انھیں مردان جیل میں بند کر دیا۔ وہ 26۔ شوال 1277ھ کو گرفتار کیے گئے تھے، 29۔ محرم 1278ھ کو انھیں رہا کیا گیا۔ اس طرح انگریزی حکومت نے تین مہینے اس رفیع المنزلت شخصیت کو جیل میں رکھا۔ وہ اپنے عہد کے صالح ترین بزرگ تھے اور راہِ حق

میں ہر مصیبت برداشت کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔[1]

چند دعاؤں کی تلقین

سید امیر صاحب کی پسندیدہ دعائیں جن کی وہ اپنے عقیدت مندوں اور مریدوں کو تلقین کرتے تھے، مندرجہ ذیل ہیں۔ نہایت مختصر اور بے حد آسان فرماتے سفر یا حضر میں کوئی تکلیف یا سختی پیش آئے تو یہ آیۂ مبارکہ پڑھنی چاہیے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

''نیز یہ دعا بھی پڑھنی چاہیے۔''

اللھم اجرنی فی مصیبتی واخلفنی خیرا منھا۔

یہ دعا پڑھو گے تو اللہ تعالیٰ مصیبت کو راحت سے بدل دے گا۔

فرمایا: یہ دعا بھی اللہ تعالیٰ نے میرے دل کو نصیب فرمائی ہے۔

ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما۔[2]

اخلاق و عادات

اخوند سید امیر صاحب بلند اخلاق اور عالی کردار بزرگ تھے۔ بلا ضرورت کوئی بات نہ کرتے۔ دینوی قسم کی باتیں کرنے سے احتراز فرماتے۔ اشارتاً یا کنایتاً کسی کی غیبت نہ کرتے۔ کسی پر طعنہ زن نہ ہوتے، کسی کو بد دعا نہ دیتے۔ عام مجلس میں گفتگو اللہ کے نام سے شروع کرتے اور اللہ کے نام پر ہی ختم کرتے۔

[1] سوانح سید میر صاحب ص 274۔ [2] سوانح سید میر صاحب 431۔

اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تلقین فرماتے۔ مجلس میں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ سلم) کے احکام بیان فرماتے۔ عام گفتگو میں مناسب مواقع پر قرآن کی آیات اور احادیث پڑھتے اور بزرگوں کے اقوال لوگوں کو سناتے۔ پیدل چلتے تو تیز چلتے۔

مسجد میں داخل ہوتے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد ادا فرماتے۔ عام طور پر وضو رہتے۔ مسجد میں دنیوی باتیں نہ کرتے۔ ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔ مسجد میں جا کر تلاوت قرآن کرتے یا وعظ فرماتے۔

مہمان کی خدمت کرتے اور اس سے حسب حال بات کرتے۔ اسے خندہ پیشانی سے ملتے۔ مہمان رخصت ہونے لگتا تو کھڑے ہو کر اسے رخصت کرتے اور چند قدم اس کے ساتھ چلتے۔

غریب کی مدد کرتے، چھوٹے پر شفقت فرماتے، بڑوں کا احترام کرتے، بچوں کی دلداری کرتے، انھیں دعا دیتے، محبت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے، ان کے ساتھ نرمی سے پیش آتے اور انھیں نصیحت کرتے۔ لوگ ملنے کے لیے آتے تو ان سے مصافحہ اور معانقہ کرتے، مجلس میں ان کو جگہ دیتے اور انھیں پورے احترام سے بٹھاتے۔ مریضوں کی بیمار پرسی کرتے، ان کی صحت کے لیے دعا کرتے۔ جنازے میں شرکت کرتے اور قبروں کی زیارت کو جاتے۔ راستے میں کسی کے ساتھ چلتے وقت اس کے آگے چلنا پسند نہ کرتے، مجلس میں بلا عذر ٹیک لگا کر نہ بیٹھتے۔ باہر سے تشریف لاتے تو لوگوں کو اپنے لیے کھڑے ہونے سے روکتے۔ غرض وہ اخلاقِ حسنہ کا چلتا پھرتا پیکر تھے۔ نہایت متواضع اور منکسر۔ ہر چھوٹے بڑے کے خیر خواہ اور ہر شخص سے نرمی کا

برتاؤ کرنے والے۔[1]

اولاد

ہمارے ملک کے مشہور مصنف و محقق مولانا غلام رسول مہر کی تصنیف ''جماعت مجاہدین'' ستمبر 1955ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے صفحہ 283 میں انھوں نے ''اخوند سید امیر صاحب'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا ہے کہ ان کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اس سے 34 برس بعد میرے سلسلۂ فقہائے ہند کی (تیرھویں صدی ہجری) کی تیسری جلد 1989ء میں شائع ہوئی۔ میں نے اپنی اس کتاب میں مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ اسلام) سے متعلق طویل مضمون لکھا جو کتاب کے صفحہ 46 سے لے کر صفحہ 105 تک ساٹھ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ میں نے مولانا مہر کے تتبع میں کتاب کے صفحہ 56 (حاشیے) میں لکھ دیا کہ اخوند سید صاحب کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ اس پر سید صاحب ممدوح کے اخلاف میں سے ایک صاحب نے مجھے خط لکھا کہ تمھاری یہ بات صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید امیر صاحب کی نرینہ اولاد تھی، جس کا سلسلۂ نسب دور تک پھیلا ہوا ہے۔ میں نے وہ خط سنبھال کر رکھا تھا۔ خیال یہ تھا کہ سید امیر صاحب کے متعلق کسی وقت مضمون لکھوں گا تو اس میں یہ پورا خط شائع کردیا جائے گا۔ لیکن افسوس ہے، اب وہ خط مجھے مل نہیں رہا۔

اس وقت میرے سامنے سید امیر صاحب کی سوانح عمری ہے جو صاحب زادہ محمد اشرف کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب 488 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب جنوری 1998ء

[1] ان کے اخلاق و کردار اور لوگوں سے میل جول کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سوانح حضرت امیر صاحب از صفحہ 159 تا 172۔

میں صاحب زادہ فاؤنڈیشن کوٹھا، ضلع مردان کی طرف سے چھپی ہے۔ مجھے یہ کتاب مولانا غلام رسول قلعوی کے پڑپوتے ملک عصمت اللہ قلعوی نے اکتوبر 1999ء میں عنایت کی تھی۔ کتاب کے مختلف مقامات میں میری کتاب ''فقہائے ہند'' کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے صفحہ 103 سے اخوند سید امیر صاحب کی اولاد کا تذکرہ شروع ہوتا ہے جو صفحہ 136 تک چلا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے وضاحت کی ہے کہ امیر صاحب کی تین بیٹیاں تھیں اور سات بیٹے۔ بیٹوں کا ذکر مختصر الفاظ میں یہ ہے۔

① سید لطیف: پیدائش 1242ھ۔۔۔وفات 1310ھ

② سید محمد اسرائیل: پیدائش 1250ھ۔۔۔وفات 1307ھ

③ سید محمود: پیدائش 1253ھ۔۔۔وفات 1305ھ

④ حافظ سید احمد: پیدائش 1256ھ۔۔۔وفات 1319ھ

ان چاروں صاحب زادگان کی اولاد، پھر آگے ان کی اولاد کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کس کی شادی کہاں ہوئی۔

تینوں بیٹیوں کی شادیوں اور اولاد کا تذکرہ بھی لائق مصنف صاحب زادہ محمد اشرف نے کر دیا ہے۔ حضرت اخوند سید امیر صاحبؒ کے سات بیٹوں میں سے تین لاولد فوت ہوئے، وہ تھے: سید ابدال، سید عبداللہ اور سید عبدالوہاب۔

کتاب کے مصنف نام دار نے اولاد کے تذکرے سے پہلے سید صاحب ممدوح کے اعزہ و اقارب کی تفصیل بھی مناسب الفاظ میں بیان کر دی ہے، جو صفحہ 99 سے شروع ہوتی ہے۔

وفات

اخوند سید امیر صاحب کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ حضرت ممدوح کے ایک مرید اور خادمِ خاص عماد الدین تھے جو سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہتے تھے وہ ان کے مشیر بھی تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ 1294ھ کے ماہ شوال تک حضرت سید صاحب بالکل تندرست تھے۔ مہمانوں اور مریدوں سے ملتے، ان سے گفتگو کرتے اور انھیں اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کا درس دیتے، پند و نصیحت فرماتے۔ خصائل کریمانہ پر کار بند رہنے اور شریعت محمدی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے۔ بہت اچھی طرح اور بے حد خوش خلقی سے آنے جانے والوں سے ملتے تھے۔ لیکن ماہ شوال میں جسمانی کمزوری کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ تاہم اٹھنے بیٹھنے اور کہیں آمد و رفت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ عبادت کے معمولات بھی پہلے کی طرح جاری رہے اور وعظ و تلقین کا سلسلہ بھی پہلے کا سا رہا۔ کوئی تکلیف لوگوں پر ظاہر نہ ہونے دیتے۔ ہر کام اسی طرح انجام دیتے جس طرح ہمیشہ سے انجام دے رہے تھے۔

بالآخر تکلیف بڑھنے لگی اور نقاہت میں اضافہ ہونے لگا۔ چلنے پھرنے کی طاقت کم ہوگئی، وضو کے بجائے مجبوراً تیمّم کرنے لگے۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا بھی مشکل ہوگیا۔ پھر ایک دن آیا کہ اپنے فرزند گرامی محمد اسرائیل کو بلایا اور ان سے چند باتیں کیں۔ بعد ازاں سب کو یاد فرمایا اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ تین مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھا۔ پھر محمد رسول اللہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔ آگے کچھ نہ کہہ سکے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو ہاتھ کے اشارے سے طلب فرماتے۔ یہ جمعرات کا دن تھا۔ جمعۃ المبارک کی صبح کو بھی یہی کیفیت رہی، نماز جمعہ پڑھ لی گئی۔ اب نزع کی حالت طاری

تھی۔ لوگوں کا ہجوم لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا۔ ان کے فرزند گرامی حافظ احمد نے سورہ یٰسین پڑھی۔ کھلا بٹ کے حاجی سید ابوذر نے بھی سورہ یٰسین کی تلاوت کی۔ ایک اور حافظ قرآن نے سورہ یٰسین کی تلاوت شروع کی۔ آدھی سورت پڑھی ہوگی کہ نماز جمعہ کے بعد حضرت کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ 1294ھ کے ماہِ ذی الحجہ کی آخری تاریخ تھی۔

یکم محرم 1295ھ (6۔ جنوری 1878ء) کو بروز ہفتہ اس مردِ تقویٰ شعار کی نماز جنازہ پڑھی گئی، جس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اور ایک مجمع کثیر کی موجودگی میں انھیں دفن کردیا گیا۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ

حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے ایک مخلص ترین اور مجسمۂ صالحیت بزرگ ساتھی حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ تھے، جن سے ان کی اولیں ملاقات (جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا) کوٹھا میں محترم المقام اخوند سید امیر صاحب کے آستانۂ عالیہ میں ہوئی تھی۔ دونوں بزرگ سید امیر کے حلقہ بیعت میں شامل تھے۔ دونوں کی روحانی منزلت سے سید امیر صاحب بے حد خوش تھے اور دونوں کے درمیان ایسی پُرخلوص رفاقت قائم ہوئی کہ زندگی بھر قائم رہی۔ حضرت سید عبداللہ غزنوی کو عبداللہ نام بہت پسند تھا، اس لیے کہ اس میں اللہ کی الوہیت کا اقرار اور بندے کی عبودیت کا اظہار پایا جاتا ہے۔ ان کا اپنا اسم گرامی محمد اعظم تھا، انھوں نے اسی بنا پر اپنا نام بدل کر عبداللہ رکھ لیا تھا۔ خود اپنے ایک بیٹے کا نام بھی عبداللہ رکھا اور وہ مولانا غلام رسول کو بھی عبداللہ کے تسمیہ سے پکارا کرتے تھے۔ مولانا غلام رسول نے حضرت عبداللہ صاحب سے حصول فیض کیا تھا۔

ولادت اور سلسلۂ نسب

حضرت سید عبداللہ 1230ھ (1811ء) کو افغانستان کے ضلع غزنی کے ایک مقام قلعہ بہادر خیل میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن محمد بن محمد بن محمد شریف عمر زئی غزنوی۔ اپنے عہد کے شیخ و امام اور محدث و فقیہ تھے۔ زہد و عبادت، ریاضت و تصوف اور جہاد فی سبیل اللہ میں انفرادیت کے مقام پر فائز تھے۔ سخاوت، خدا ترسی، حسن اخلاق، ہمدردئ خلائق اور میل جول میں یگانۂ روزگار تھے۔ انکسار و تواضع اور شیریں بیانی ان کا خاص وصف تھا۔ وعظ و تبلیغ اور اللہ کے دین کی نشر و اشاعت میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔

تحصیل علم

سید عبداللہ غزنوی بچپن ہی میں تحصیل علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ اس زمانے کے افغانستان میں جو علوم طلبا کو پڑھائے جاتے تھے، وہ غزنی کے اصحابِ علم سے پڑھے۔ نہایت ذہین اور بہ درجہ غایت تیز فہم تھے۔ کتبِ درسیہ کے مشکل سے مشکل مسائل بڑی آسانی سے ان کے ذہن کی گرفت میں آجاتے تھے۔ آغاز عمر ہی سے قرآن و حدیث سے شغف تھا۔ پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل کو بھی ضروری قرار دیتے تھے۔ علومِ مروجہ کے تمام گوشوں پر گہری نظر تھی۔ اس باب میں غزنی کا کوئی عالم ان کا حریف نہ تھا۔ کسی مسئلے کو سمجھنے میں مشکل پیش آتی تو اہل علم ان کی طرف رجوع کرتے اور مسئلہ حل ہو جاتا۔

ملا حبیب اللہ قندھاری کی خدمت میں

اس دور کے افغانی علماء میں ملا حبیب اللہ قندھاری کی بڑی شہرت تھی۔ علم کے ساتھ ساتھ عملی اعتبار سے بھی ان کا مقام بڑا بلند تھا۔ تصوف وسلوک میں بھی وہ مرجع عوام وخواص تھے۔ قندھار میں ملا حبیب اللہ کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ سید عبداللہ غزنوی کو ان کے مرتبۂ علمی کا پتا چلا تو وہ غزنی سے روانہ ہوئے اور راستے کے نشیب وفراز کی مشکلات طے کرتے ہوئے قندھار پہنچے اور ملا صاحب موصوف کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا۔ کچھ عرصہ ان کے قصرِ فضیلت میں گزارا، پھر واپس اپنے گھر چلے گئے۔

کچھ مدت بعد پھر قندھار کا عزم فرمایا اور ملا حبیب اللہ کے بابِ عالی پر آبیٹھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے اس مرشد اور استاذ سے خوب استفادہ کیا۔ ملا صاحب ممدوح اپنے اس شاگرد اور مرید کی ذہنی صلاحیت اور روحانی رفعت کے بہت مداح تھے۔ وہ ان کی قوت فہم کی اپنے حلقے کے سب اصحاب علم کے سامنے تعریف کرتے اور فرماتے۔

مسائلِ دینیه راچناں که ایں شخص می فهمد من حودنمی فهمم

”دینی مسائل کو جس طرح یہ شخص سمجھتا ہے، میں نہیں سمجھتا۔“

تھوڑے عرصے بعد ملا صاحب نے سید عبداللہ صاحب کو غزنی سے قندھار کا مشکل سفر کرنے سے روک دیا اور فرمایا اگر آپ کو کسی مسئلے کی سمجھ میں کبھی کوئی مشکل پیش آئی تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا اور تمام عقدے حل ہو جائیں گے، چنانچہ سید صاحب فرماتے ہیں۔

رب جل شانہ موافق گفتۂ شیخ بامن معاملہ کردہ است

''میرے پروردگار نے میرے ساتھ وہی معاملہ کیا جو شیخ نے فرمایا۔''[1]

ملا صاحب ممدوح کے ایک مرید اور شاگرد نے ''ملفوظاتِ ملا حبیب اللہ قندھاری'' کے نام سے ان کے ملفوظات جمع کر دیے ہیں۔ ان میں ملا صاحب ممدوح نے مولانا سید عبداللہ غزنوی کا ذکر کیا ہے اور ان کے زہد و اتقا اور ورع و عبادت کی تعریف فرمائی ہے۔[1]

توحید کے متعلق ارشادات

مسئلہ توحید کے متعلق حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر اسلاف کے نقطۂ نظر کے عین مطابق ہے۔ فرماتے ہیں:

- اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رجوع کرنا شرک فی العبادت ہے۔ کسی سے استعانت کرنا بھی شرک ہے۔ تمام معاملات میں صرف اللہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔
- بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کی قبروں پر اس نیت سے حاضر ہونا کہ ان کی برکت اور توجہ سے کوئی مقصد حل ہو جائے، توحید کے خلاف اور کلمۂ شہادت کے منافی ہے۔
- کوئی شخص اگر یہ خیال کرتا ہے کہ میں صلحاے امت کی قبروں پر کچھ مانگنے اور طلب کرنے کے لیے نہیں، بلکہ حصول برکت کے لیے جاتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ وہاں میری دعا جلد قبول ہوگی تو یہ بھی شریعت کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے

---

[1] سوانح عمری حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی (از مولانا عبدالجبار غزنوی) ص 9۔ [2] ملا حبیب اللہ قندھاری 1213ھ کو پیدا اور ماہ رمضان 1265ھ کو فوت ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) کے افغانستان کے مشاہیر علما میں شمار کیے جاتے تھے۔

عبادت کے لیے مسجد مقرر کی ہے، قبروں کو مقام عبادت قرار نہیں دیا، جیسا کہ اغاثۃ اللہفان میں امام ابن قیم رحمہ اللہ نے وضاحت فرمائی ہے۔

⊙ اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں فضل وکرم سے تمام اعمال ذمیمہ میرے قلب اور جسم سے خارج فرما دیے ہیں اور ماسوی اللہ کو میرے دل سے باہر نکال پھینکا ہے۔ مجھ پر اس نے یہ حقیقت منکشف فرما دی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی مربی نہیں۔ ہر شے اللہ کے قبضے اور اختیار میں ہے۔

جذبۂ احیائے سنت

ابتدائی عمر ہی سے حضرت عبداللہ غزنوی کے قلبِ بابرکت میں احیائے سنت اور اتباعِ شریعتِ مطہرہ کا جذبۂ صادقہ پایا جاتا تھا۔ سنتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف وہ کوئی عمل برداشت نہ کرتے تھے۔ اس وقت افغانستان کی جو دینی حالت تھی، وہ ان کے نزدیک نہایت تکلیف دہ تھی۔ عوام اور خواص بدعات کے خوگر اور غیر شرعی رسوم کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ علما و مشائخ کی حالت بھی یکسر بدلی ہوئی تھی۔ بدعات کو دین اور غلط رسوم کو اسلام قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے لیے اس موقعے پر خاموش رہنا مشکل تھا۔ حالات موافق نہ تھے، لیکن وہ اللہ کا نام لے میدانِ عمل میں اترے۔ اشاعت سنت اور تبلیغ قرآن و حدیث پر کمرِ ہمت باندھی اور بدعات کی تردید اور مشرکانہ رسوم و معاملات کی مخالفت کرنے لگے۔ بعض علمائے کرام اس مردِ مجاہد کی سرگرمیوں سے بہت متاثر ہوئے اور بعض شدید مخالفت پر اتر آئے۔

مخالفت کرنے والے زیادہ تر علما کا تعلق اس دور کی افغان حکومت سے تھا۔ انھوں نے ان کے خلاف حکمرانوں کے کان بھرنا شروع کر دیے اور بات بہت آگے نکل گئی۔ مخالفین نے ان کے خلاف باقاعدہ جنگ وجدال اور لڑائی کا منصوبہ بنایا۔ لیکن حضرت سید صاحب کے عقیدت مندوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ وہ ایسے نازک موقعے پر اپنے استاذ و مرشد کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے، انھوں نے لڑائی کرنے والوں کے ساتھ لڑائی کا فیصلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات آگے نہ بڑھی اور مخالفین نے لڑائی جھگڑے کا معاملہ ختم کر دیا۔

اب ان علمائے سوء نے پینترا بدلا اور اکٹھے ہو کر افغانستان کے دارالحکومت کابل پہنچے اور بعض وزرا و امرا کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی اور ان کی وساطت سے والیٔ ملک امیر دوست محمد خاں تک رسائی حاصل کی۔ لیکن متعدد ارکان حکومت حضرت سید صاحب کے معتقد تھے، جنھوں نے والیٔ افغانستان کو کوئی سزا نہ دینے کا مشورہ دیا۔

اندازہ فرمایئے اس وقت توحید کا نعرہ بلند کرنا کتنا مشکل تھا اور اللہ کی وحدانیت کا اعلان ایک صحیح موحد کے لیے کس قدر تکلیف کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ مشرکین مکہ بھی نبی صلی اللہ وعلیہ وسلم کی اسی لیے مخالفت کرتے تھے کہ آپ صرف اللہ کی عبادت یعنی توحید پر عمل کرنے کا اعلان فرماتے اور اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا سمجھنے سے روکتے تھے۔

بہر حال علمائے سوء نے امیر دوست محمد سے سیاسی زبان میں بات کی، جسے وہ آسانی سے سمجھ سکتا اور اس سے متاثر ہو سکتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس شخص کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔ یہ آپ کی سلطنت ختم کرنے اور آپ کو تختِ حکمرانی سے

الگ کرنے کا خواہاں ہے۔ اگر اسے ایک سال کی بھی مہلت دی گئی اور اسے آزادی سے ملک میں تقریر و تبلیغ کا موقع دیا گیا تو نظامِ حکومت مختل ہو جائے گا۔ حکومت کے جو وزرا و امرا اس کے دائرۂ عقیدت میں داخل ہیں، وہ اس کا ساتھ دیں گے اور اس سے کاروبارِ حکومت میں خلل واقع ہوگا اور معاملات حکمرانی بگڑ جائیں گے...... یہ بات آسانی سے والیٔ افغانستان دوست محمد خاں کے ذہن میں بیٹھ گئی اور وہ انھیں سزا دینے پر اتر آیا۔

یہ ایک طویل اور دردناک داستان ہے، جس کے بیان کا یہ محل نہیں۔ میں نے اس کی تفصیل اپنے سلسلۂ فقہاے ہند کی ایک جلد میں تحریر کی ہے جو تیرھویں صدی ہجری کے علما و فضلا سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی کے حالات پر مشتمل یہ مضمون کتاب کے صفحہ 147 سے شروع ہوکر 219 تک چلا گیا ہے۔ اسّی (80) صفحات سے زائد کے اس مضمون میں حضرت عبداللہ غزنوی اور ان کے خاندان سے متعلق بہت سے واقعات معرضِ کتابت میں آگئے ہیں۔ یہ کتاب ایک زمانے میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے نصاب میں بھی شامل رہی ہے۔

مولانا سید عبداللہ غزنوی نے افغانستان کے چار بادشاہوں کا زمانہ پایا، جنھوں نے ان کو شدید اذیتوں میں مبتلا کیا۔ ان کے نام یہ ہیں۔

① امیر دوست محمد خاں　② امیر شیر علی خاں

③ امیر محمد افضل خاں　④ امیر محمد اعظم خاں۔

امیر دوست محمد خاں افغانستان کا پہلا حکمران تھا، جس نے کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں مولانا سید عبداللہ غزنوی کو ہدفِ ستم بنایا۔ پھر ایک وقت آیا کہ خود اس کا شاہی

خاندان ذہنی، جسمانی اور مالی اذیتوں کا شکار ہوا اور اس خاندان کے بہت سے لوگ پشاور، پنجاب اور ہندوستان کے علاقوں میں انگریزی حکومت کی قید میں آئے اور انگریز کا تختۂ مشق بنے۔

عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ تبلیغ توحید کے سلسلے میں مولانا سید عبداللہ غزنوی کو کوڑے مارے گئے اور انھیں سزائیں دی گئیں۔ اپنے تین بیٹوں (مولانا محمد، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالجبار غزنوی) سمیت کابل کی جیل میں قید رہے۔ سنگ دل حاکموں نے جیل میں ان کے خرچ کے لیے ایک حبہ بھی مقرر نہ کیا۔ نہ کسی حاکم نے کبھی ان کی کوئی خبر لی۔ شہر کے لوگوں کے دلوں میں اللہ نے یہ بات ڈالی کہ یہ لوگ جیل میں بھوک پیاس اور سخت پریشانی کی حالت میں ہیں، چنانچہ باشندگانِ شہر ان کی خدمت کرنے لگے۔ وہ قسم قسم کے پھل اور نوع بنوع کھانے ان کے لیے جیل میں پہنچاتے تھے۔ وہ مظلوم اور ستم رسیدہ قیدی خود بتاتے ہیں کہ جیل میں اس قدر فراخی اور کثرت سے کھانے کی مختلف چیزیں آتی تھیں کہ اتنی کبھی ہم نے اپنے گھر میں بھی نہ دیکھی تھیں۔

حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی فرماتے ہیں کہ حکومتِ افغانستان اور ملک کے علمائے سوء کی طرف سے ہم مسلسل پندرہ سال اذیتیں برداشت کرتے رہے۔[1]

آخر ایک وقت آیا کہ جیل سے نکال کر ان کو اور اس خاندان کے تمام افراد کو پشاور کی طرف دھکیل دیا گیا۔ سخت گرمی اور تکلیف کی حالت میں انھوں نے یہ سفر طے کیا۔ پشاور میں کچھ دن گزارنے کے بعد مظلومین کا یہ قافلہ لاہور پہنچا۔ پھر امرتسر کے قریب بستی خیر الدین میں کچھ عرصہ گزارا۔ بعد ازاں امرتسر کو اپنا مسکن بنایا۔ امرتسر کے جس

[1] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی ص21۔

محلے میں انھوں نے قیام کیا وہ محلّہ غزنویہ کہلایا، جس مسجد میں نماز پڑھنے لگے، وہ مسجد غزنویہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ شائقین علوم دینیہ کے لیے جس مدرسے کی بنیاد رکھی، اس نے مدرسہ غزنویہ کے نام سے شہرت پائی۔

حضرت مولانا عبداللہ غزنوی اپنے عہد کے عظیم المرتبت عالم اور رفیع المنزلت بزرگ تھے۔ مستجاب الدعوات، انتہائی رقیق القلب۔ خاشع اور خاضع۔ مولانا غلام رسول سے وہ نہایت مخلصانہ مراسم رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ دہلی میں حضرت سید میاں نذیر حسین سے حدیث کا درس لیا۔

امرتسر آ کر اس خاندان کے اصحاب علم نے تصنیفی، تدریسی، تبلیغی، سیاسی ہر قسم کی خدمات سرانجام دیں اور اپنی خدماتِ گوناگوں کی وجہ سے برصغیر میں بے حد شہرت پائی۔

حضرت مولانا عبداللہ صاحب غزنوی کا انتقال 15۔ ربیع الاول 1298ھ (15۔ فروری 1881ء) کو امرتسر میں منگل کے روز آدھی رات کے وقت ہوا۔ بدھ کے روز زوالِ آفتاب کے بعد نماز ظہر سے قبل دفن کیے گئے۔ بے شمار لوگوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔

اللھم اغفرلہ و نورقبرہ وادخلہ جنت الفردوس۔

لاہور میں وعظ وتذکیر کا حکم

حضرت عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول کوٹھا سے رخصت ہونے لگے تو اخوند سید امیر صاحب نے مولانا غلام رسول کو حکم دیا کہ آپ لاہور جا کر وعظ و تذکیر کا سلسلہ شروع کریں۔ چنانچہ یہ دونوں بزرگ وہاں سے چلے، پہلے قلعہ اسلام پہنچے۔ وہاں سے لاہور آئے۔ پھر امرتسر گئے۔ بعد ازاں مولانا غلام رسول نے حضرت اخوند محمد امیر صاحب کے حکم کے مطابق لاہور آنے اور وہاں مجالس وعظ وارشاد منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے انھوں نے کشمیری بازار کے قریب تکیہ سادھواں کی ایک مسجد میں امامت شروع کی۔ اس طرح یہ مسجد ان کا مرکزِ قیام قرار پائی۔

وہ بہت اچھے واعظ تھے اور نہایت شستگی اور شائستگی سے قرآن وحدیث اور اقوال صحابہ و فرامین اسلاف کی روشنی میں اپنی بات لوگوں کو سمجھاتے تھے، اس لیے جلد ہی لاہور اور اس کے قرب وجوار میں ان کے مواعظِ حسنہ کی شہرت پھیل گئی۔ ان کے وعظ میں ہر مذہب وملت کے لوگ آتے اور نہایت توجہ سے ان کے ارشادات سنتے اور ان سے مستفید ہوتے۔ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ مولانا غلام رسول نے جو طرزِ بیان

اختیار کیا ہے اور جس انداز میں وہ احکامِ اسلام بیان کرتے ہیں، اس سے ہر نقطۂ نظر کے لوگ خوش ہوتے ہیں۔

لاہور جس طرح اب علوم وفنون کا مرکز ہے، اس وقت بھی اسے یہی حیثیت حاصل تھی۔ بے شک موجودہ دور کے لاہور کی نسبت سے ڈیڑھ سو برس قبل کا لاہور حجم میں بہت کم تھا، لیکن مختلف علوم وفنون کا گہوارہ یہ اس وقت بھی تھا اور پنجاب کا دارالحکومت تھا۔ اس دور کا حکمران طبقہ یہیں رہتا تھا، تمام محکموں کے دفاتر یہیں تھے اور ہر قسم کے دفتری احکام یہیں سے جاری کیے جاتے تھے، اسی لیے اسے ''تختِ لاہور'' کہا جاتا تھا۔ ہندو، سکھ، مسلمان، اچھوت، عیسائی، پارسی وغیرہ تمام مذہبوں کے لوگ یہاں آباد تھے۔ پھر حکومت کے چھوٹے بڑے افسر بھی اس شہر میں مقیم تھے جو اپنے روزمرہ کے فرائض منصبی سرانجام دیتے تھے۔ اس لیے اس شہر میں ایسے واعظ وخطیب کی ضرورت تھی جو پُر تاثیر الفاظ اور شیریں زبان میں لوگوں کی نفسیات کے مطابق دلائل کے ساتھ بات کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت مولانا غلام رسول کو عطا فرمائی تھی، لہذا ان کے دوراندیش مرشد حضرت سیدا میر صاحبؒ نے ان کو لاہور رہ کر وعظ وارشاد کا سلسلہ شروع کرنے کا حکم دیا۔

مخالفت اور رقابت

مولانا غلام رسول کے حسنِ بیان اور اثرِ وعظ کا چرچا تمام شہر میں پھیل گیا تھا اور سامعین نہایت مسرت کے ساتھ لوگوں سے ان کی خوش بیانی کا تذکرہ کرتے تھے، اس سے شہر کے پرانے واعظوں اور عالموں کو ذہنی کوفت ہوتی تھی اور وہ مولانا کی مخالفت

کرنے لگے تھے، یا یوں کہیے کہ ان کے دلوں میں حسد اور رقابت کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ بسا اوقات بعض علما یا ان کے شاگرد یہ فیصلہ کر کے ان کے وعظ میں شامل ہوتے کہ ان کی کسی بات کو محلِ اعتراض ٹھہرا کر دورانِ وعظ ان سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا جائے گا، لیکن مولانا ممدوح اس انداز سے مسائل شرعیہ بیان فرماتے کہ کسی کو اعتراض کا موقع نہ ملتا بلکہ وہ ان کے طرزِ کلام سے متاثر ہوتے اور جو کچھ سوچ کر آتے تھے، سب ختم ہو جاتا۔

بعض مقامی علما اور مدرسین اپنے طالب علموں کو کچھ مشکل فنی مسائل کی وضاحت کے لیے ان کے پاس بھیج دیتے اور بتاتے کہ اگر وہ اس مسئلے کا یہ جواب دیں تو تم ان پر یہ اعتراض کرو، اور یہ جواب دیں تو یہ اعتراض کرو، لیکن مولانا ان کی بات سن کر مسئلۂ مسئولہ کی ایسی وضاحت کرتے کہ معترضین مطمئن ہو جاتے اور ان کے اعتراض کی پوری عمارت متزلزل ہو جاتی۔ یہ اللہ کی انھیں خاص عطا تھی کہ آغاز کلام سے لے کر آخرِ کلام تک ایسا طریق اختیار فرماتے کہ پوری گفتگو میں کسی نوع کا کوئی جھول نہ رہتا اور کہیں کوئی الجھن پیدا نہ ہوتی۔ جو بات کی صفائی سے کی اور بادلیل کی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، منطق، فلسفہ، معانی، صرف، نحو تمام علوم سے اللہ نے ان کو نوازا تھا۔ پھر ہر علم کے ہر پہلو کی وضاحت کا ڈھنگ بھی انھیں ودیعت فرمایا گیا۔ اس لیے وہ ہر مجلس میں کامیاب رہتے اور ہر محفلِ تقریر میں لوگ ان سے متاثر ہوتے۔

ایک عالمِ دین کا قصہ

اس وقت لاہور میں ایک عالم دین مولوی غلام محمد کی بڑی شہرت تھی۔ بیان کیا جاتا

ہے کہ وہ بہت بڑے مناظر اور لسان تھے۔ سونے کے کنگن پہنتے اور بڑی بڑی موچھیں رکھتے تھے۔ بہت سے علمانے ان کو اس سے روکنے کی کوشش کی اور بتایا کہ شریعت کی رو سے مردوں کو سونا پہننا جائز نہیں اور اس طرح مونچھیں بڑھانا بھی خلافِ شرع ہے۔ لیکن وہ بحث وتکرار میں اتنے تیز تھے کہ کوئی ان کا مقابلہ نہ کر پاتا۔ ان کا اعلان تھا کہ کوئی شخص ان دونوں چیزوں کی حرمت ثابت کر دے تو وہ فوراً اس سے تائب ہو جائیں گے۔ سونے کے کنگن بھی اتار دیں گے اور مونچھیں بھی کٹوا دیں گے۔ اتفاقاً وہ ایک دن مولانا غلام رسول کے وعظ میں آ گئے۔ مولانا کی ان پر نظر پڑی تو اسی موضوع پر وعظ ہونے لگا۔ مولانا غلام محمد جو کسی کے قابو میں نہ آتے تھے، مولانا کے وعظ سے اتنے متاثر ہوئے کہ مجمع عام میں سب کے سامنے سونے کے کنگن کلائیوں سے اتار دیے اور کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا کوئی حجام اس مجلس میں موجود ہے تو مولانا غلام رسول کے فرمان کے مطابق میری بڑھی ہوئی مونچھیں کاٹ دے۔ ان کی آواز سن کر خود مولانا نے ان کی مونچھیں کاٹیں۔

مولانا ممدوح کے وعظ میں غیر مسلم بھی شامل ہونے لگے تھے۔ پہلے تو یوں ہی سامعین کے طور پر آتے تھے، پھر ان کا وعظ اپنا اثر دکھانے لگا۔ غیر مسلم دورانِ وعظ ہی میں قبولِ اسلام کا اعلان کر دیتے

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا مولانا غلام رسول رحمہ اللہ نے اپنے مرشد اخوند محمد امیر صاحب کے حکم سے لاہور میں وعظ وارشاد کا سلسلہ شروع کیا تھا، لیکن ابتدا میں انھیں اس شہر میں بعض علما اور عوام کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ یہ مخالفت کوئی تعجب انگیز بات نہ تھی۔ تقریباً ہر مصلح اور مبلغ حق کو مخالفت کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اللہ

کے برگزیدہ انبیا علیہم السلام کی مخالفت کی گئی۔ خود ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سے لوگوں نے بے حد مخالفت کی۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سننے سے انکار کرتے رہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ حق بلند کرنے کی سعی مسلسل جاری رکھی اور بالآخر اللہ نے کامیابی عطا فرمائی۔

مولانا غلام رسولؒ کی بھی لاہور میں مخالفت ہوئی۔ لیکن انھوں نے مخالفین کی کوئی پروا نہیں کی اور سلسلۂ تبلیغ ہر حالت میں جاری رکھا۔ ان کے مخالفوں میں ان کے جد امجد حافظ نظام الدین خادم مرحوم کے ایک شاگرد بھی شامل تھے، جو اس لیے ان کی مخالفت کرتے تھے کہ انھوں نے ان کے بیٹے کو ارتکابِ معصیت سے روکا تھا۔ بعض دیگر لوگوں نے بھی مولانا کے خلاف محاذ قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مولانا دین کے صاحب عزم مبلغ تھے، اس لیے وہ مخالفت کے باوجود قدم آگے بڑھاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابتدا میں جو رکاوٹیں پیدا ہوئی تھیں، آہستہ آہستہ ختم ہو گئیں۔

ایک بزرگ کی دعا

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ ایک دن چینیاں والی مسجد میں وعظ کے لیے تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک عمر رسیدہ بزرگ ملے۔ انھوں نے آب دیدہ ہو کر مولانا سے کہا: ''اے ہمارے نوجواں ہادی! تو راہِ حق دکھانے کے لیے کوشاں ہے، لیکن افسوس ہے لوگ سنگ دل ہیں، وہ تیری بات نہیں سنتے۔ اگر سنتے ہیں تو اس پر عمل نہیں کرتے۔''

مولانا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''ہر کام بہ تدریج ہوتا ہے۔ صدیوں کی خرابیاں دور کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔''

بزرگ نے کہا: ''نوجوان! تو کامیاب ہوگا۔''

پھر اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر مولانا کو دعا دی۔ ''اے نوجوان! خداوند کریم تیری عمر میں برکت دے اور تجھے تیرے نیک ارادوں میں کامیاب کرے۔''

ایک راہ گیر نے یہ الفاظ سن کر بلند آواز سے کہا: ''آمین''۔

یہ دعا قبول ہوئی اور صرف دو گھنٹے کے بعد اس کا اثر ظاہر ہوگیا۔ مولانا پُر جوش لہجے میں اللہ کی توحید بیان فرمارہے تھے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اللہ کی وحدانیت ثابت کررہے تھے کہ دورانِ وعظ میں سامعین میں سے تقریباً دوسو آدمیوں نے بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھا، شرک و بدعت سے تائب ہوئے اور عہد کیا کہ آئندہ اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا اور مشکل کشا نہیں قرار دیں گے۔ تائب ہونے والے اس گروہ میں مختلف مذاہب کے لوگ تھے۔ کچھ ہندو، کچھ انگریز۔ لیکن سکھ زیادہ تعداد میں تھے۔ [1]

وعظ کا فوری اثر

ایک دفعہ مولانا ایک گاؤں موضع ''گل والا'' کو جارہے تھے۔ راستے میں ایک گاؤں بجوِل آتا ہے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور ڈھول بج رہا ہے۔ مولانا نے ایک شخص سے پوچھا: اتنے لوگ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟

اس نے جواب دیا: اس گاؤں کے نمبردار کا بیٹا چیچک کی بیماری میں مبتلا ہے اور بڑی تکلیف میں ہے۔ لوگ ماتارانی کی پوجا کررہے ہیں تاکہ چیچک کی بیماری رفع ہو۔

[1] سوانح مولانا غلام رسول ص 59۔

مولانا اس ہجوم میں گئے اور وعظ کہنا شروع کر دیا۔ وعظ کا لوگوں پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے اسی وقت ماتا رانی کا بت توڑ دیا اور آئندہ کے لیے اس قسم کے شرکیہ کاموں سے توبہ کی۔[1]

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ بلا شبہ بہت بڑے واعظ تھے اور ان کے وعظ میں بہت اثر تھا۔ وہ جب لاہور گئے اور وہاں وعظ و ارشاد کا آغاز کیا تو لوگوں نے ان کی باتیں زیادہ توجہ سے نہیں سنیں، لیکن آہستہ آہستہ وہ لوگوں کا مرکزِ توجہ ہو گئے اور اس شہر میں ان کے مواعظ کی دھوم مچ گئی۔ بے شمار لوگوں نے بدعات ترک کر کے کتاب وسنت کی پیروی کو اپنا شعار بنایا۔ قبر پرستی سے تائب ہوئے اور توحید الٰہی کی سیدھی راہ پر چلنے لگے۔ مزارات پر حاضری، نذر و نیاز، استمداد از غیر اللہ وغیرہ بہت سے امور مولانا کے وعظوں سے متاثر ہو کر لوگوں نے چھوڑے۔ بے تعداد غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ جن لوگوں نے اسلام کی صراط مستقیم کو اپنایا، ان میں انگریز، ہندو، عیسائی، سکھ سب مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ لاہور کے لوگ مولانا کو نہ صرف بہت بڑا واعظ اور خطیب سمجھتے تھے بلکہ انھیں اولیاء اللہ میں سے شمار کرتے تھے، اور وہ واقعی اولیاء اللہ میں سے تھے۔

[1] سوانح مولانا غلام رسول ص 61۔

لاہور میں مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے مراکزِ وعظ

پچھلے باب کے شروع میں بتایا جاچکا ہے کہ حضرت مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے مرشد جناب محترم اخوند محمد امیر صاحب رحمہ اللہ نے ہدایت کی تھی کہ وہ لاہور جا کر لوگوں کو وعظ و تبلیغ کریں۔ چنانچہ وہ لاہور تشریف لائے اور سلسلۂ وعظ شروع کیا۔[1]

انھوں نے لاہور شہر اور اس کے قرب وجوار کے مختلف مقامات میں وعظ کیے اور اپنے اندازِ خاص سے کتاب وسنت کے احکام سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ بے شمار مسلمانوں نے ان کے مواعظ سے متاثر ہو کر بدعات و محدثات سے توبہ کی اور خالص کتاب وسنت کو مشعلِ راہ بنایا، اور لا تعداد غیر مسلم ان کے وعظ سن کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

مولانا مرحوم نے تین حکومتوں کا زمانہ پایا۔

(۱) مسلمانوں (یعنی مغلوں) کی حکومت کا آخری زمانہ۔

[1] سوانح حیات حضرت مولانا غلام رسول صفحہ 53۔

② پنجاب میں سکھوں کی حکومت کا زمانہ۔

③ انگریزی حکومت کا زمانہ۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ نے لاہور کے بہت سے مقامات پر وعظ کیے اور بہت سی مسجدوں میں جا کر اللہ کی وحدانیت بیان کی، لیکن لاہور کی تین مسجدیں بالخصوص ان کی جائے قیام اور مراکز وعظ رہیں۔ وہ تھیں مسجد تکیہ سادھواں، مسجد چینیاں والی اور مسجد نیلا گنبد۔

سب سے پہلے وہ مسجد تکیہ سادھواں میں آئے اور اس میں امامت کرانے لگے۔①

یہ مسجد چوک رنگ محل سے آگے محلّہ چابک سواراں میں ہے۔ اسے ''مسجد تکیہ سادھواں'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ سکھوں کے عہد حکومت میں کشمیر کی مسلمان سادھو برادری کے لوگ لاہور آ گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے افراد کوچہ چابک سواراں کے قریب خالی جگہ میں آباد ہوئے، اور پھر یہ محلّہ انھی کے نام سے موسوم ہو گیا۔ ان میں ایک شخص نور محمد کشمیری سادھو تھا۔ اس نے 1266ھ (1850ء) میں اس محلے میں اپنی سادھو برادری کی مالی اعانت سے مسجد تعمیر کرائی، جو مسجد تکیہ سادھواں کے نام سے موسوم ہوئی۔ کشمیر کی سادھو برادری کے یہ تجارت پیشہ لوگ تھے۔ کشمیر سے آنے والے افراد اس مسجد میں قیام کرتے تھے۔ ان کے لیے یہ مسجد ہوٹل اور سرائے کا کام دیتی تھی۔ اس مسجد میں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ ''ایک دفعہ میں نے یہاں مولانا محمد انور شاہ صاحب سابق صدر مدرس دیوبند کا وعظ بھی سنا۔''②

① سوانح حیات حضرت مولانا غلام رسول صفحہ 53۔ ② تاریخی مساجد لاہور صفحہ 113۔

مولانا غلام رسول نے لاہور آکر پہلے اسی مسجد کو اپنا مرکز تبلیغ بنایا اور یہاں امامت کا سلسلہ شروع کیا۔ ①

دوسری مسجد چینیاں والی تھی، جس میں مولانا ممدوح کی سب سے زیادہ آمدورفت رہی۔ یہ مسجد بھی چوک رنگ محل سے تھوڑا سا آگے محلّہ چابک سواراں میں ہے۔ اس کے بانی سرفراز خاں (یا افراز خاں) تھے جو مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے مصاحب تھے۔ یہ مسجد انھوں نے 1082ھ میں تعمیر کرائی۔ اسے چینیاں والی مسجد اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی اندرونی دیواروں اور چھت پر قسم قسم کے رنگوں کے گل بوٹے نہایت خوب صورتی سے بنائے گئے تھے اور اعلیٰ درجے کی کاشی کاری کی گئی تھی۔ کاشی کاری کے نقوش کے ساتھ نسخ اور نستعلیق خط میں چھت اور دیواروں کو کتبات سے آراستہ کیا گیا تھا۔

یہ مسجد اس عہد کی تعمیرات کا بہترین نمونہ تھی۔ اس کے دروازے پر یہ شعر لکھا گیا تھا۔

طرفہ معمار خرد تاریخ سال۔ گفت زیبا مسجد از فراز خاں 1082ھ

اس سے 1082ھ برآمد ہوتا ہے۔

اس کے دروازے پر نہایت عمدہ پتھر کی سلیں لگی ہوئی تھیں اور اس کی دہلیز انتہائی شان دار سنگ مرمر کی تھی۔ مغل حکومت کے زوال کے بعد پنجاب میں سکھ راج قائم ہوا تو لاہور کے ایک حکمران گوجر سنگھ نے اس کے دروازے کی پتھر کی سلیں

① یہاں یہ یاد رہے کہ ہمارے ہاں ''سادھو'' کا لفظ عام طور پر ہندوؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ کشمیر کی ایک برادری تھی، جسے سادھو کہا جاتا تھا۔

اکھڑ وادیں۔ دوسرے حکمران سوبھا سنگھ نے اس کی سنگ مرمر کی دہلیز ختم کرادی۔ اس طرح مسجد کا حسن بگاڑنے کی پوری کوشش کی گئی۔ اس کے اردگرد قبریں تھیں، وہ بھی صاف ہوگئیں۔ مسجد کے موجودہ دروازے اور عمارت کے نیچے اس کی تقریباً دو منزلیں دبی ہوئی ہیں۔ مسجد کی کئی دکانیں تھیں، جن کے نشانات مٹ چکے ہیں۔

مسجد کی بڑی بڑی اینٹوں پر فارسی کے کتنے ہی شعر خوب صورتی سے لکھے ہوئے تھے۔ کاشی کاری کے ان تمام نقوش کا خاتمہ ہو چکا ہے۔[1]

اب چینیاں والی مسجد کے چند خطبا و ائمہ کے بارے میں سنیے!

1747ء میں مغل حکمران محمد شاہ نے وفات پائی تو احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر حملہ کیا۔ دہلی کی مغل حکومت کی طرف سے لاہور کا ناظم اس وقت معین الملک عرف میر منو تھا۔ طویل جدوجہد کے بعد احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر قبضہ کرلیا۔ اسی اثنا میں عید آگئی۔ احمد شاہ ابدالی کے حکم سے عید کی نماز کا انتظام مسجد وزیر خاں میں کیا گیا اور امراو وزرا سمیت بہت بڑی تعداد میں لوگ مسجد وزیرؒ خاں میں عید کی نماز پڑھنے آئے۔ فاتح لاہور احمد شاہ ابدالی بھی مسجد میں موجود تھا۔ مسجد وزیر خاں کے امام وخطیب ایک بزرگ مولانا محمد صدیق تھے جو اپنے عہد کے معروف عالم تھے۔ ان کے والد مولانا محمد حنیف بھی اس مسجد کے منصب خطابت پر متمکن رہے تھے۔ چینیاں والی مسجد کے خطیب و امام اس وقت مولانا شہر یار تھے، جن کے علم وعمل کا بڑا شہرہ تھا۔ اس مسجد میں ان کا مدرسہ بھی جاری تھا، جس میں خاصی تعداد میں طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا محمد صدیق بھی ان کے شاگرد تھے، جنھوں نے

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخی مساجد لاہور (از ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی) صفحہ 88 تا 92

چینیاں والی مسجد میں ان سے تحصیل علم کی تھی۔ عام اعلان کی وجہ سے مولانا شہریار بھی عید کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد وزیر خاں میں تشریف لے گئے تھے۔

نماز ختم ہوئی تو مولانا محمد صدیق خطبے کے لیے منبر پر تشریف لائے اور خطبہ شروع کیا۔ خطبے کے دوران انھوں نے احمد شاہ ابدالی کی طرف اشارہ کر کے اسے ''سلطان العادل'' کے لقب سے پکارا۔

اس وقت مولانا شہریار خطیب سے کچھ دور بیٹھے تھے۔ اہل لاہور کے نزدیک وہ بے حد قدر و منزلت رکھتے تھے۔ چینیاں والی مسجد کی خطابت اس وقت بہت بڑا منصب تھا، جس پر وہ فائز تھے۔ ان کے شاگرد اور عقیدت مند بھی بہت بڑی تعداد میں تھے۔

جب خطبہ ختم ہوا اور مولانا شہریار اپنی جگہ سے اٹھے تو کسی نے انھیں بتایا کہ آپ کے شاگردِ رشید نے محض خوشامد سے احمد شاہ ابدالی کو ''سلطان العادل'' کہا ہے، حالاں کہ اس کے بے پناہ مظالم سے تمام ملک چیخ اٹھا ہے۔ خود باشندگانِ لاہور پر اس کی ستم رانیوں کا سلسلہ بڑا دراز ہے۔

مولانا شہریار خطیب کے قریب پہنچے، احمد شاہ ابدالی بھی وہیں کھڑا تھا۔ مولانا محمد صدیق نے احتراماً استاد کے ہاتھ چومے اور انتہائی تکریم بجا لائے۔

احمد شاہ نے پوچھا: یہ کون بزرگ ہیں؟

مولانا محمد صدیق نے کہا: یہ میرے استاد مولانا شہریار ہیں۔

احمد شاہ ابدالی ان کی شہرت سے آگاہ تھا۔ وہ آداب بجا لایا اور مولانا شہریار کو سلام کیا۔ قدم بوسی کرنا چاہی تو مولانا شہریار نے روک دیا اور فرمایا: ''یہ شریعت کے خلاف ہے۔ اس قسم کی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔''

اب مولانا شہریار اپنے شاگرد مولانا محمد صدیق سے مخاطب ہوئے اور کہا: بیٹا تم خوب جانتے ہو کہ ان افغانوں نے اہل شہر کو انتہائی پریشان کیا اور ہر قسم کے ظلم کا نشانہ بنایا۔ یاد رکھو اسلام ایسے بادشاہ کو عادل کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ ظالم لوگ ہیں......اس قسم کی باتیں مولانا نے اور بھی کیں۔

تمام حاضرین مولانا شہریار کے ان الفاظ سے کانپ اٹھے۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ ابدالی کی طرف سے مزید ستم رانی کا سلسلہ نہ شروع ہو جائے۔ احمد شاہ ابدالی نے مولانا کو چپ کرانا چاہا، لیکن انھوں نے پروانہ کی اور اپنی بات مکمل کر کے رہے۔

آخر بادشاہ نے کہا: حضرت مولانا! آپ کس کے بارے میں اور کس کے سامنے یہ باتیں کر رہے ہیں؟

مولانا شہریار نے جواب دیا: میں خوب جانتا ہوں کہ میرا مخاطب کون ہے اور میں کس کے سامنے یہ باتیں کر رہا ہوں۔

احمد شاہ ابدالی نے کہا: اس گفتگو کا انجام بھی آپ کو معلوم ہے؟

فرمایا: ہاں! شہادت یا جلا وطنی۔ میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔

احمد شاہ ابدالی نے مولانا شہریار کو جلاوطنی کا حکم دیا اور وہ موضع ٹانڈہ ضلع ہوشیار پور چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

بے شک احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان بالخصوص پنجاب کے باشندوں پر بڑے مظالم ڈھائے۔ اس نے 1747ء سے 1769ء تک اس ملک پر نو حملے کیے اور اسے بے حد نقصان پہنچایا۔ ایک مرتبہ تو اس کی افغان فوج اس قدر بدتمیزی پر اتر آئی تھی کہ پنجاب کے بعض علاقوں کی بہو بیٹیوں کی عزت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اپنی عزت

بچانے کے لیے وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنتیں، ہاتھوں میں بوڑھی عورتوں کی طرح لکڑیاں پکڑتیں، کبڑیاں ہو کر ان کے سہارے سے گھروں سے نکلتیں اور آبادی سے دور کھیتوں میں چلی جاتیں۔ وارث شاہ نے اپنی کتاب ''ہیر وارث شاہ'' میں اس صورتِ حال کو اس طرح بیان کیا ہے۔

وارث شاہ کڑی نہ پنڈوچ رہی کائی
فوجاں ہند تے ترک نے چاھڑیاں نے

لفظ ''ترک'' اس وقت مسلمان حکمران کے لیے بولا جاتا تھا۔ یعنی اس بادشاہ نے ہندوستان پر ایسا حملہ کیا ہے اور اس بے دردی سے کیا ہے کہ لڑکیاں اپنی عزت بچانے کے لیے دیہات سے نکل کر کھیتوں میں جا چھپی ہیں۔

لیکن پونے تین سو سال قبل کے پنجاب اور ہندوستان پر ابدالی کے حملوں کے متعلق زیادہ تعجب کرنے کی ضرورت نہیں۔ کمزوروں کے ساتھ طاقت وروں کا رویہ ہمیشہ یہی رہا ہے اور یہی رہے گا۔ کیا اب ہمارا اپنا ملک امریکہ کی زد میں نہیں؟ کیا خود احمد شاہ ابدالی کے ملک افغانستان کے امریکہ نے پرخچے نہیں اڑا دیے؟

بہرکیف چینیاں والی مسجد کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے ہر خطیب نے حکومت پر کھل کر تنقید کی اور اس کی غلطیوں سے اسے آگاہ کیا، جس کے نتیجے میں انھیں کسی نہ کسی انداز سے مستوجب سزا قرار دیا گیا۔

مولانا غلام رسول قلعوی اس مسجد کو مرکز بنا کر لاہور میں دین کی تبلیغ کرتے رہے اور حکومت کی طرف سے انھیں جو سزا دی گئی، اس کی تفصیل اس کتاب کے آئندہ صفحات میں قارئین کرام کے مطالعہ میں آئے گی۔

1910ء میں اس کے منصبِ خطابت پر حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی متمکن ہوئے۔

اس خاندان کے ساتھ افغانستان کی ظالم حکومت اور خود مولانا عبدالواحد غزنوی کے ساتھ ہندوستان کی انگریزی حکومت نے جو برتاؤ کیا، وہ بھی حکومتوں کی ظالمانہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ مولانا مرحوم سرحد پار کی جماعتِ مجاہدین کے (جو انگریزوں سے برسرپیکار رہتی تھی) معاون تھے، اور اس کی وجہ سے حکومت انھیں پریشان کرتی تھی۔

مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد 1930ء میں اس کی زمام خطابت حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے سپرد ہوئی۔ وہ آزادیٔ ملک کے لیے کم وبیش دس سال ملک کی مختلف جیلوں میں قید رہے۔

اس کے ایک خطیب علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ تھے۔ ان کی صدائے حق اتنی بلند اور زوردار تھی کہ حکومت کے ایوان اس سے لرزتے تھے اور پھر اس کی پاداش میں ان کے ساتھ جو بیتی، وہ تاریخ حق گوئی کے نتیجے میں ستم رانیوں کا ایک بہت بڑا باب ہے۔

آج کل ہمارے عزیز دوست جناب رانا شفیق پسروری اس کے منصبِ خطابت پر فائز ہیں، جو بلند آہنگ خطیب ہیں۔ پنجاب اور مرکز کی حکومتوں نے عوام کے ساتھ جو رویہ اختیار کر رکھا ہے، اس سے وہ اچھی طرح باخبر ہیں۔ اس ضمن میں اپنے پیش رو خطبا کے اسلوبِ خطابت کا بھی انھیں خوب علم ہے۔ ان خطباء کی روایاتِ صدق گوئی کو پیشِ نگاہ رکھنا ان کے فرائض میں شامل ہے۔ انھیں بلا امتیاز ان دونوں حکومتوں کو ہدفِ تنقید ٹھہرانا چاہیے۔ ان دونوں حکومتوں نے عوام کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔

پنجاب کی حکومت دکان داروں سے ان کی دکانوں پر لٹکتے ہوئے نرخ ناموں پر ...

نہیں کرا سکتی اور مرکز کی کمزور ترین حکومت کو جو اتحادی پارٹی چاہے آگے لگا لیتی ہے۔

یہاں ایک بہ درجہ غایت اہم بات اور سنیے جو ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے تحریر کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''مسجد چینیاں والی میں مولانا سید عبدالواحد غزنوی بن مولانا سید عبداللہ غزنوی امرتسر سے تشریف لائے جو آخر عمر تک امامت کراتے رہے، جیسا خشوع وخضوع ان کی جماعت میں دیکھا، وہ کسی اور جگہ نہیں ملا۔''

ڈاکٹر صاحب کے اس سے اگلے الفاظ خاص طور سے لائق ملاحظہ ہیں:

''مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ کی موجودگی میں اس مسجد میں حافظ محمد حسین نابینا مؤذن تھے جو ضلع گوجراں والا کے قلعہ اسلام کے رہنے والے تھے۔ ان کو تمام صحاح ستہ اور قرآن کریم زبانی یاد تھے۔ راقم کو بھی فخر ہے کہ ان سے یہ علوم دینی سیکھے۔''[1]

قرآن مجید تو لا تعداد لوگوں کو یاد ہے۔ نبی ﷺ کی بہت سی احادیث بھی بے شمار لوگوں کو یاد ہوں گی، لیکن پوری صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ (یا موطا امام مالک) گزشتہ دور کے برصغیر کے کسی عالم کو (غالباً) یاد نہ ہوں گی، لیکن چینیاں والی مسجد کے نابینا مؤذن اور حضرت مولانا غلام رسول قلعوی کے گاؤں کے حافظ محمد حسین رحمہ اللہ کو یہ سعادت حاصل ہے کہ وہ حدیث کی ان بڑی بڑی چھ کتبِ مقدسہ کے حافظ تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ حافظ صاحب موصوف حضرت مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے خاندان کے فرد تھے یا کوئی اور بزرگ تھے۔ یہ بھی علم

[1] تاریخی مساجد لاہور صفحہ 90

نہیں کہ ان کے اخلاف میں سے کوئی صاحب اس وقت دنیا میں موجود ہیں یا نہیں۔

یہاں ایک ذاتی واقعہ عرض کرنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ میں 1958ء اور اس سے کچھ عرصہ بعد تک چینیاں والی مسجد کے قریب کرائے کے مکان میں رہا۔ اس وقت میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں فرائض ادارت انجام دیتا تھا۔ نماز عشا کے قریب گھر پہنچتا۔ عشا اور فجر کی دو نمازیں مسجد چینیاں والی میں پڑھتا تھا۔ میں بہت گناہ گار ہوں، لیکن اس مسجد میں جاتا تو اس طرح اس کی گرفت میں آجاتا کہ جی وہاں سے نکلنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ بغیر کسی مطلب کے دیر تک وہیں بیٹھا مسجد کی چھت، اس کے صحن اور اس کی دیواروں کو دیکھتا رہتا۔ وہاں بیٹھنے سے دل کو سکون حاصل ہوتا تھا۔

اس کا ذکر ایک دن حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ اور پھر مولانا سید محمد داود غزنوی رحمہ اللہ سے کیا تو دونوں بزرگوں نے تقریباً ایک سا جواب دیا۔ وہ جواب یہ تھا کہ جہاں کبھی صالح لوگ رہے ہوں، تصوف کے نقطہ نظر کے مطابق وہ وہاں اپنے اثرات (یا آثار) چھوڑ جاتے ہیں، جو قدرتی طور پر وہاں آنے والے ان لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں جو تصوف سے تھوڑا بہت تعلق رکھتے ہوں۔ ان حضرات کی یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی۔ میں تصوف سے تعلق رکھنے کا دعوے دار تو ہرگز نہیں ہوں، لیکن صوفیائے کرام سے محبت اور ان کی تعظیم بہر حال کرتا ہوں۔ بے شک اس مسجد میں بہت سے صالح اور کتاب وسنت کے عامل حضرات رہے ہیں، جنھوں نے اللہ کے دین کی بے حد خدمت کی، وہاں جا کر وہ یاد بھی آتے ہیں۔ رحمہم اللہ

لاہور میں مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ کا تیسرا اہم مرکز تبلیغ اور مقام وعظ مسجد نیلا گنبد قرار پائی جو انارکلی بازار سے متصل لاہور کی مشہور اور قدیم مسجد ہے۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے نزدیک یہ مسجد لاہور کی ابتدائی مغل عہد کی عمارات میں شامل ہے۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس مسجد کو انھوں نے فوجی بارکوں کے طور پر استعمال کیا اور اس میں بارود بھرا۔ انگریزی حکومت کے ابتدائی عہد میں اس مسجد کو میس (MESS) کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ یعنی اس میں فوجیوں کے کھانا کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ 1857ء میں اسے انگریزوں نے مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ سکھوں اور انگریزوں نے اس میں بہت اکھاڑ پچھاڑ کی اور اسے بڑا نقصان پہنچایا۔ 1857ء کے بعد یہ مسجد مسلمانوں کے قبضے میں آئی تو انارکلی کے مسلمان تاجروں نے اسے مرمت کرایا اور اس کی حالت بہتر ہوئی۔ [1]

نور احمد چشتی ''تحقیقات چشتی'' میں مسجد نیلا گنبد کے متعلق لکھتے ہیں:

''بہ عہدِ سکھاں اس مسجد میں توپ خانہ کا اسباب رہتا تھا، ابتدائے عمل داری سرکار انگریزی میں چھاونی میاں میر نہ تھی۔ یہی انارکلی مقام چھاونی تھا۔ جب چھاونی میاں میر مقرر ہوئی تو منشی نجم الدین ٹھیکے دار ڈبل روٹی نے یہ مسجد واگزار کرا کر مرمت و سفیدی کرائی۔ کچھ دن یہ مسجد بہ سبب وعظ کرنے مولوی غلام رسول ساکن قلعہ اسلام اور بہ سرپرستی منشی نجم الدین ٹھیکے دار ڈبل روٹی کے یہ مسجد وہابیوں کی مشہور ہوگئی تھی۔'' [2]

مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ تو اہل حدیث (وہابی) تھے ہی جو اس مسجد میں وعظ کیا کرتے تھے، نور احمد چشتی کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ منشی نجم الدین ٹھیکے دار ڈبل روٹی بھی وہابی (اہل حدیث) تھے، جنھوں نے یہ مسجد واگزار اور مرمت کرائی۔ مولانا

....

① تاریخی مساجد لاہور صفحہ 31، 32 بحوالہ تاریخ لاہور (سید محمد لطیف) صفحہ 192۔ ② تحقیقات چشتی صفحہ 967۔

غلام رسول اور منشی نجم الدین کی وجہ سے یہ وہابیوں کی مسجد مشہور ہوئی۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لاہور میں مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے تین مراکزِ وعظ وتبلیغ کا ذکر تو مختلف کتابوں میں موجود ہے، جن کا ہمیں علم ہوسکا ہے۔ وہ ہیں مسجد تکیہ سادھواں، مسجد چینیاں والی اور مسجد نیلا گنبد۔ ان مقامات کے علاوہ معلوم نہیں ان کا سلسلۂ وعظ ونصیحت کہاں کہاں جاری رہا ہوگا۔ ظاہر ہے مسجدوں کے علاوہ لاہور کے دیگر اہم مقامات میں بھی انھوں نے وعظ کیے ہوں گے، جہاں مسلمانوں کے علاوہ راہ چلتے غیر مسلم بھی ان کے وعظوں میں شریک ہوتے اور ان کے ارشادات سن کر اسلام قبول کرتے تھے۔ اندازہ فرمایے، وہ کس قدر بلند مرتبت واعظ اور خوش نوا خطیب تھے کہ غیر مسلم ان کی باتیں سن کر مسلمان ہو جاتے اور مسلمان بدعات اور غیر اسلامی رسوم سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے تھے۔

مسجد نیلا گنبد میں مولانا غلام رسول کے وعظ کا پتا مجھے ماہنامہ ''احوال'' (لاہور) کے شمارہ اپریل، مئی 2010ء کے ایک مضمون سے چلا جو ''مسجد نیلا گنبد'' کے عنوان سے نور احمد چشتی کا تحریر کردہ ہے۔ اس کی فوٹو کاپی مجھے رانا شفیق پسروری صاحب نے عنایت کی، جس پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مضمون نگار کا نام (نور احمد چشتی) اور عبارت پڑھ کر مجھے خیال ہوا کہ یہ ''تحقیقات چشتی'' کے مصنف ہیں۔ چنانچہ میں نے اسی وقت اردو بازار سے قیمتاً یہ کتاب منگوائی تاکہ اس اہم بات کا حوالہ رسالے کے بجائے اصل کتاب سے دیا جائے۔ تقریباً ایک ہزار صفحات کی یہ کتاب لاہور سے متعلق بہت سی پرانی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تحصیل علم حدیث کے لیے دہلی کو روانگی

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ نے لاہور میں تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کیا تو کچھ عرصہ اس شہر میں ان کا قیام رہا۔ اس اثنا میں (جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا) وہ لاہور کے علاوہ بھی مختلف مقامات میں وعظ و نصیحت کے لیے تشریف لے جاتے رہے۔ ان کے وعظوں سے بہت سے غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور بے شمار مسلمانوں نے بدعات ومحدثات کو ترک کیا اور کتاب وسنت کی پیروی کو معمولِ حیات ٹھہرایا۔

پھر ایک وقت آیا کہ انھوں نے لاہور کی سکونت ترک کر کے دہلی جانے اور وہاں حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ سے علم حدیث پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ لاہور سے امرتسر پہنچے اور حافظ محمود کے پاس باغ والی مسجد میں قیام پذیر ہوئے۔ حافظ صاحب ممدوح حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ سے بیعت تھے اور نہایت صاحبِ تقویٰ بزرگ تھے۔ ان کا مقام صالحیت اتنا بلند تھا کہ حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ اپنے اس مرید کو مختلف اوقات میں اوراد و وظائف کی تلقین فرمانے کے لیے خود ان کے پاس امرتسر تشریف لائے۔

امرتسر میں کئی روز مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کا قیام رہا اور وہاں وہ وعظ و تذکیر کرتے

رہے۔ ان کی عادت تھی کہ جہاں جاتے، وعظ میں مصروف ہو جاتے۔ وہاں کے لوگ بھی ان کا وعظ سننے کے لیے بے تاب رہتے۔ اللہ نے ان کو وعظ و تقریر کا جو ملکہ عطا فرمایا تھا، وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہوگا۔

امرتسر سے دہلی کا سفر

حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ بھی غزنی سے امرتسر آ گئے تھے۔ اب مولانا غلام رسول رحمہ اللہ اور حضرت سید عبداللہ صاحب رحمہ اللہ دونوں امرتسر سے یکّے پر سوار ہو کر دہلی کو روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں سفر کا یہ معاملہ تھا کہ وہ آٹھ روز میں دہلی پہنچے اور حضرت میاں سید نذیر حسین کے مدرسے میں قیام پذیر ہوئے۔ یہ 1857ء کی جنگ آزادی سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے۔ اس وقت آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر دہلی کے تختِ حکومت پر متمکن تھا۔ دونوں بزرگوں نے حضرت میاں صاحب سے صحیح بخاری پڑھنا شروع کی۔ میاں صاحب بہت سادہ مزاج تھے۔ اپنے کام خود ہی کرتے بلکہ لوگوں کے کام کے لیے بھی ہر وقت تیار رہتے، اس لیے علما و طلبا اور عوام و خواص میں انھیں نہایت تکریم سے دیکھا جاتا تھا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ دہلی میں مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کے وعظ کی شہرت صوبہ پنجاب سے نکل کر دہلی بھی پہنچ گئی تھی اور لوگوں کو اس کی اثر انگیزی کا پتا چل گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دہلی جا کر میاں صاحب کے مدرسے میں داخل ہوئے تو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور مختلف محلوں کے باشندوں کی طرف سے وعظ کی درخواستیں شروع

ہو گئیں۔ مولانا چوں کہ صحیح معنوں میں اسلام کے مبلغ اور توحید کے داعی تھے اور چاہتے تھے کہ حق کی آواز زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے اور وہ کتاب و سنت پر عمل پیرا ہوں، اس لیے انھوں نے ہر اس مقام پر جانے کا عزم فرمایا، جہاں انھیں بلایا جاتا۔ وہ بہت خوشی سے جاتے اور لوگوں کو دینِ حق کے احکام سناتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اچھی خاصی تعداد میں لوگوں نے ان کی تبلیغ سے اسلام قبول کیا اور بے شمار گھرانوں نے بدعات کے ارتکاب سے توبہ کی۔

لال قلعہ سے دعوتِ وعظ

صدقِ دل سے صدائے حق بلند کی جائے تو اس کے اثرات دور دور تک پھیل جاتے ہیں اور داعی کی مخلصانہ آواز کو اللہ تعالیٰ پذیرائی بخشتا ہے۔ دہلی جا کر مولانا موصوف کا شہرۂ وعظ لال قلعے کے مکینوں تک پہنچا اور مغل شہزادوں نے حضرت میاں صاحب سے التجا کی کہ وہ پنجاب سے آنے والے اپنے واعظ شاگرد کو وعظ کے لیے لال قلعے بھیجیں۔ قلعے کے شہزادے اور شہزادیاں اور یہاں کے تمام خدام و ملازمین ان کا وعظ سننے کے متمنی ہیں۔ حضرت میاں صاحب نے ان کی اس تمنا کا اظہار مولانا ممدوح سے کیا تو وہ مان گئے اور وعظ کہنے کے لیے قلعہ معلّٰی پہنچے۔ ان کے استاذ عالی منزلت حضرت میاں صاحب بھی ساتھ تشریف لے گئے۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ دہلی میں مولانا کی شہرت کے باعث ان کے حاسد بھی پیدا ہو گئے تھے اور مداح بھی کثیر تعداد میں تھے۔ سب لوگ لال قلعے کے اس وعظ میں شریک ہوئے۔ بہت موثر وعظ تھا۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کا وعظ میں تلاوت قرآن کا انداز، احادیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

پڑھنے کا اسلوب، شعر پڑھنے کا ڈھنگ، لوگوں سے مخاطب ہونے کا طریقہ اور اپنی بات سامعین کے کانوں تک پہنچانے کا ڈھب عام واعظوں اور مقرروں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اس نہج سے زبان کو حرکت دیتے اور اپنا مقصد بیان فرماتے کہ اس کے تمام پہلو لوگوں کے دلوں میں اترتے اور اپنے اثرات کے دائرے پھیلاتے جاتے تھے۔

اس قسم کے واعظ اور خطیب روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کے عالم وجود میں آنے کا بھی ایک خاص موسم اور خاص دور ہوتا ہے۔ اللہ انھیں تبلیغ دین کے طریقے سکھاتا ہے تو وہ اس کی مخلوق کو راہِ راست پر لانے کا ذریعہ بنتے اور اس کے احکام کی اشاعت کرتے ہیں۔

بہر حال مولانا غلام رسول رحمہ اللہ دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ سے علم بھی حاصل کرتے تھے اور شہر کے مختلف علاقوں میں لوگوں کے کہنے پر وعظ بھی فرماتے تھے۔ ان کے مواعظ کا اصل موضوع ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ کی توحید، اطاعت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) شرک و بدعات کی تردید، اسلام کی حقانیت، نماز روزہ وغیرہ احکام کی پابندی۔ علاوہ ازیں یتامیٰ ومساکین اور مستحقین کی امداد۔! حقیقتاً یہی اسلام کے اصل مسائل ہیں، جن پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ واعظین ومقررین کو ان مسائل پر خود بھی عمل کرنا چاہیے اور لوگوں کو بھی ان پر عمل کرنے کی تاکید کرنا چاہیے۔ جو واعظ خود بے عمل ہوں، ان کے وعظ اثر سے خالی ہوتے ہیں اور جو واعظین خود اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو مانتے ہیں، ان کے وعظ بھی لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔ مولانا غلام رسول ابتدائی زندگی ہی سے بہت بڑے عامل اور کتاب و سنت کو مسلمانوں کے لیے حرفِ آخر قرار دیتے تھے، اس لیے ان کے وعظوں میں بھی اثر تھا۔

گیارھواں باب

1857ء کی جنگ آزادی اور مولانا کی گرفتاری

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ اور سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ کے درس میں شامل تھے اور ان سے صحیح بخاری پڑھ رہے تھے کہ 11 / مئی 1857ء (17 / رمضان المبارک 1273ھ) کو میرٹھ کی فوجی چھاونی سے جنگ آزادی کا آغاز ہوگیا اور جلد ہی اس کے آثار پورے ہندوستان میں پھیل گئے۔ دہلی چوں کہ ملک کا دارالحکومت تھا، اس لیے وہ فوراً اس کی زد میں آ گیا۔ ہر طرف ایک ہنگامہ بپا ہوگیا۔ جس مسجد میں حضرت میاں سید نذیر حسین سے سید عبداللہ غزنوی اور مولانا غلام رسول علم حدیث حاصل کرتے تھے، وہاں مسلسل بندوق کی گولیاں گرتیں اور خوف ناک آوازیں کانوں میں پڑتی تھیں۔ سید عبداللہ غزنوی جو مولانا غلام رسول کو عبداللہ کہہ کر پکارتے تھے، یہ آوازیں سن کر حیران ہوکر ان سے پوچھتے ''عبداللہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

یہ نہایت بے چینی اور گھبراہٹ کا دور تھا۔ ہر شخص کو اپنی جان کی فکر تھی۔ کسی دوسرے کی خبر نہ تھی۔ لیکن مولانا غلام رسول رحمہ اللہ اور مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ اس عالم میں بھی حصولِ علم حدیث میں مشغول تھے۔

ایک زخمی انگریز عورت کی امداد

مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ نے ایک دن مولانا غلام رسول رحمہ اللہ سے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ پر کوئی مصیبت نازل ہو رہی ہے، لہٰذا یہاں رہنے کے بجائے، بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے گھر چلے جائیں۔ اس خواب کی وجہ سے میں آپ کے متعلق بہت فکر مند ہوں، آپ کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ بار بار مجھے دہلی چھوڑنے اور گھر جانے کے لیے کہتے اور اس پر اصرار کرتے تھے۔ میں انھیں جواب دیتا کہ اگر آپ واقعی یہ دیکھتے ہیں کہ میں کسی مصیبت میں مبتلا ہونے والا ہوں تو مجھ سے ایسی باتیں کریں، جو میرے لیے اطمینان کا باعث ہوں، ایسی باتیں نہ کریں، جن سے مجھے گھبراہٹ پیدا ہو، لیکن وہ برابر اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے...... بالآخر وہ مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے اصرار پر دہلی سے اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔ [1]

مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ ان کو رخصت کرنے کے لیے میاں صاحب کے مدرسے سے لاہوری دروازے کے باہر شاہدرہ تک ان کے ساتھ گئے۔ وہاں یہ دونوں ساتھی کھڑے آپس میں الوداعی باتیں کر رہے تھے کہ سامنے ایک انگریز عورت پر نظر پڑی جو سخت زخمی حالت میں پیاس کی شدت سے بلک رہی تھی۔ لیکن کوئی اسے پانی نہ پلاتا تھا۔ انسانی ہم دردی کے پیش نظر یہ دونوں اس عورت کے پاس آئے اور کہیں سے پانی لا کر اسے پلایا۔

1857ء کا زمانہ انتہائی ہنگامہ خیز تھا۔ ابتدا میں ہندوستانی انگریزوں پر غالب آ گئے

[1] سوانح حیات مولانا غلام رسول ص 65۔

تھے۔ اس وقت وہ اس قدر جوش میں تھے اور فضا ایسی پیدا ہوگئی تھی کہ انگریز بوڑھا ہو، بیمار ہو، عورت ہو، بچہ ہو اس کی امداد کرنا نہایت مشکل تھا، حالاں کہ اسلام کی رو سے زمانۂ جنگ میں یا کسی بھی صورت میں بچوں، بیماروں، بوڑھوں اور عورتوں کو تکلیف پہنچانا جائز نہیں، بلکہ جہاں تک ہو سکے ان کو تکلیف سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مولانا غلام رسول رحمہ اللہ اور مولانا عبداللہ رحمہ اللہ نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اس عورت کی مدد کی۔ [1]

اس عورت کو کسی صورت میں مردانہ لباس پہنایا اور نہایت مشکل سے مسجد کے حجرے میں لے کر آئے اور اس کے علاج کا سلسلہ شروع کیا۔ رات کو کچھ لوگوں کو شبہ ہوا تو وہ مسجد میں تلاشی کے لیے آ گئے۔ ان لوگوں سے کہا گیا کہ ایک مریض ہے جو حجرے میں لیٹا ہوا ہے۔ یہ سن کر وہ لوگ واپس چلے گئے۔

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ نے اب وطن جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ چند روز کے علاج سے وہ عورت صحت یاب ہوگئی تو پتا چلا کہ وہ ایک انگریز کرنل کی بیوی ہے۔ اسے کسی طرح اس کے گھر پہنچایا گیا۔

اس عورت نے مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کا بے حد شکریہ ادا کیا اور اپنی طرف سے خط لکھ کر انھیں دینا چاہا کہ کسی وقت ضرورت پڑے تو اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے، لیکن مولانا نے خط لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا ہم نے اس کی مدد اور خدمت محض رضائے الٰہی

[1] اس کے بعد جب انگریزوں نے غلبہ پالیا تو ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں پر بے حد مظالم ڈھائے اور انتہائی وحشی پن کا ثبوت دیا۔ بڑا چھوٹا کوئی ان سے محفوظ نہ رہا۔ اس کی تفصیل آگے ایک مستقل باب میں بیان کی جائے گی۔

اور انسانی ہم دردی کے لیے کی ہے، اس کا صلہ ہمیں اللہ ہی دے گا۔ اس عورت نے یہ بھی کہا کہ ممکن ہے ہندوستانیوں کی پکڑ دھکڑ تک نوبت پہنچ جائے، اس صورت میں یہ خط آپ کے کام آئے گا۔ اگر انگریزی حکومت سے کسی نے آپ کی شکایت کی تو متعلقہ لوگوں کو یہ خط دکھایا جا سکتا ہے، لیکن مولانا نہیں مانے، فرمایا ہم درویش لوگ ہیں۔ کوئی ہماری شکایت کیوں کرے گا اور ہمیں تکلیف پہنچا کر اسے کیا ملے گا۔

وطن کو روانگی اور وارنٹ گرفتاری

اس انگریز عورت کی صحت یابی کے بعد مولانا غلام رسول رحمہ اللہ نے اسے گھر پہنچایا اور پھر اس واقعہ کے کئی دن بعد دہلی سے وطن کو روانہ ہوئے۔ انھی دنوں کسی نے انگریز حکمرانوں سے شکایت کر دی کہ ان کے خلاف جو کچھ ہوا، اس میں مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کا بھی حصہ ہے۔ وہ دہلی کے مختلف علاقوں میں جو تقریریں کرتے رہے ہیں، ان میں انگریزی حکومت کی مخالفت کی جاتی تھی۔

یہ وہ دور تھا جب انگریزوں نے ان کی مخالفت کرنے والے ہندوستانیوں کو وسیع پیمانے پر گرفتار کر کے انھیں سنگین سزائیں دینا شروع کر دی تھیں۔ جگہ جگہ پھانسیاں نصب تھیں، اور جس پر کوئی ذرہ بھی شبہ ہوتا اسے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ مولویوں سے حکومت بالخصوص بدظن تھی اور جن مولویوں پر وہابی کے لفظ کا اطلاق ہوتا تھا، انھیں لازماً ہدفِ ستم ٹھہرایا جاتا تھا۔ مولانا غلام رسول اسی زمرے میں شامل تھے اور انھیں وہابی کہا جاتا تھا۔ بے شمار لوگ گرفتار کیے جا چکے تھے۔ مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو گئے تھے۔

وہ دہلی سے چلے اور اِدھر اُدھر کے چکر کاٹتے ہوئے امرتسر پہنچے۔ دو دن حافظ محمود کے پاس باغ والی مسجد میں قیام کیا۔ وہیں پتا چل گیا تھا کہ ان کی گرفتاری کے لیے حکومت نے اشتہار جاری کر دیا ہے، یعنی پولیس کی اصطلاح میں انھیں ''اشتہاری مجرم'' قرار دے دیا گیا ہے۔ امرتسر سے اپنے سسرال فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداس پور) گئے۔ ان کے سسر مولوی عبدالحق کو ان کی گرفتاری کے اشتہار کا علم تھا۔

پریشان کن بات یہ تھی کہ حکومت کے جاسوس اور ملازم ان کے رشتے داروں اور واقفوں کے گھروں میں جا جا کر ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ امرتسر کا انگریز ڈپٹی کمشنر اس قدر بدحواس ہو گیا تھا کہ جس کے متعلق فساد میں ملوث ہونے کی بھنک اس کے کان میں پڑتی، اسے بلاتحقیق گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیتا۔ مولوی عبدالحق اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے اور تمام دن دروازے پر بیٹھے رہتے تاکہ کسی کو پتا نہ چل سکے کہ مولوی غلام رسول ان کے گھر میں موجود ہیں۔

فتح گڑھ چوڑیاں کا ایک مشہور رئیس دیوان نرنجن داس تھا۔ وہاں کے لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ سرکار دربار میں بھی اس کا نام چلتا تھا۔ وہ مولوی عبدالحق کا شاگرد تھا اور ان کی بے حد تکریم کرتا تھا۔ ایک دن چند سرکاری آدمی دیوان نرنجن داس کے پاس پہنچے، اسے مولانا غلام رسول کے وارنٹ گرفتاری دکھائے اور گرفتاری کے لیے اس سے مدد طلب کی۔ دیوان صاحب نے خفیہ طور سے اس کی اطلاع مولوی عبدالحق کو دی اور پیغام بھجوایا کہ اگر مولانا غلام رسول یہاں ہیں تو انھیں علی الصبح ان کے گھر (قلعہ اسلام) روانہ کر دیں۔ ان کا اپنے علاقے میں چلے جانا ہی مناسب ہے۔ اس لیے کہ وہاں کے لوگ ان کے حالات و معاملات سے ہماری نسبت زیادہ واقفیت رکھتے ہیں

اور خطرے کی صورت میں وہ ان کی اچھے طریقے سے مدد کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ممکن ہے وہاں کوئی ایسا حاکم ہو جو محض شبہے کی بنا پر پکڑنا مناسب نہ سمجھتا ہو، لوگوں کی شہادتیں اور بیان لینا بھی ضروری قرار دیتا ہو اور اسی کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا عادی ہو۔

دیوان نرنجن داس کی یہ بات بالکل صحیح اور ہم دردانہ تھی، چنانچہ مولانا غلام رسول فتح گڑھ چوڑیاں سے چلے اور اپنے وطن قلعہ اسلام پہنچ گئے۔

گرفتاری

یہاں ان کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد سکونت پذیر تھے۔ انھوں نے مولانا کو باہر نہ نکلنے اور گھر ہی میں چھپے رہنے کا مشورہ دیا۔ مولانا نے فرمایا چھپ چھپا کر زندگی گزارنا مشکل ہے۔ میں اللہ کی رضا اور قضا پر راضی ہوں۔ حاکمِ وقت آخر میرا بیان بھی تو لے گا اور معاملے کی تحقیق بھی کرے گا۔ یوں ہی کسی کی شکایت پر تو پھانسی نہیں دے دے گا۔ آپ مجھے باہر نکلنے سے منع نہ کریں۔[1]

مولانا کا یہ جواب سن کر حکیم صاحب مسجد میں چلے گئے۔ دیکھا کہ ایک نووارد مسافر مسجد میں بیٹھا تھا۔ حکیم صاحب نے اسے اجنبی سمجھ کر کھانے کے متعلق پوچھا۔ اس نے انکار کیا اور کھانا نہیں کھایا۔ اس کی شکل و شباہت سے حکیم صاحب کو شبہ ہوا کہ یہ کوئی انگریز ہے جو بھیس بدل کر اور دیسی لباس پہن کر یہاں آیا ہے۔ وہ اسی وقت گھر گئے اور مولانا کو نووارد کے بارے میں بتایا۔ وہ نمازِ ظہر کا وقت تھا۔ مولانا

[1] سوانح حیات مولوی غلام رسول، ص62

نماز کے لیے مسجد میں آئے تو وہ شخص ان کو دیکھتے ہی باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد پولیس کپتان اور اس کے ساتھ بہت سے پولیس والے مسجد میں آ گھسے۔ وہ نو وارد مسافر بھی ان کے ساتھ تھا۔ آتے ہی مولانا کو گرفتار کر لیا اور انھیں پکڑ کر لاہور کو روانہ ہو گئے۔

اس پر گاؤں میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور لوگوں نے پولیس والوں کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور اندیشہ تھا کہ پولیس تمام گاؤں کے لوگوں پر سختی کا برتاؤ کرے گی۔ مولانا نے جو پولیس کی حراست میں تھے، بلند آواز میں لوگوں سے کہا کہ وہ پولیس کی کارروائی میں مزاحم نہ ہوں، اس نے مجھے گرفتار کر لیا ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ سب لوگ آرام سے گھروں کو چلے جائیں۔ اگر مزاحمت کی گئی تو آپ لوگوں کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو جائے گا اور خود میری زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اگر امن و امان قائم رہا تو میں ان شاء اللہ جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ مولانا کی یہ باتیں سن کر لوگ پیچھے ہٹ گئے اور پولیس مولانا کو پکڑ کر لاہور کو روانہ ہو گئی۔ اس وقت تین آدمی ان کے ساتھ تھے۔ بڑے بھائی حکیم غلام محمد، پھوپھی زاد بھائی مولوی بدر الدین اور گوجراں والا کے مولوی علاء الدین جو ان کے شاگرد تھے۔

میہاں سنگھ کی بہو کا نام ”سکھد یئی“ تھا۔ خود سکھدیئی اور اس کے خاندان کے لوگ مولانا کی بے حد تکریم کرتے تھے۔ سکھدیئی کو مولانا کی گرفتاری کا پتا چلا تو بہت پریشان ہوئی۔ اس زمانے میں ایمن آباد (ضلع گوجراں والا) کا دیوان جوالا سہا مہاراجا جموں کشمیر کا وزیر تھا۔ وہ اتفاقاً چند روز پیشتر جموں سے ایمن آباد آیا تھا اور پولیس اور فوج کے کچھ لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ سکھدیئی نے اس کو مولانا کی گرفتاری کی اطلاع دی اور ان کی رہائی کے لیے کوشش کرنے کو کہا۔ وہ بھی مولانا کا

بہت احترام کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے کوشش کر کے مولانا کو اور اس پولیس کو جس نے انھیں گرفتار کیا تھا، اپنے ہاں ایمن آباد بلا لیا اور پولیس سے کہا کہ مولانا کا تعلق چوں کہ گوجراں والا سے ہے اور اسی علاقے میں انھیں گرفتار کیا گیا ہے لہٰذا ان پر گوجراں والا ہی میں مقدمہ چلایا جائے، لاہور یا کسی دوسری جگہ نہ لے جایا جائے۔ اب پولیس والے مولانا کو دیوان جوالا سہا کے پاس چھوڑ گئے اور دیوان صاحب مولانا کو گوجراں والا لے گئے۔ دیوان صاحب کا مقصد یہ تھا کہ گوجراں والا کے لوگ مولانا کو جانتے اور قابل احترام گردانتے ہیں، اس لیے ضلعی حکام ان سے کسی قسم کی سختی کا برتاؤ نہیں کریں گے۔ لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ گوجراں والا کی ضلعی انتظامیہ نے مولانا کو لاہور پہنچا دیا اور کہا کہ یہ کیس لاہور میں فنانشل کمشنر منٹگمری کی عدالت میں پیش ہوگا اور وہی اس کی سماعت کریں گے۔

اللہ کی ضمانت پر رہائی

لاہور میں ان کو فنانشل کمشنر منٹگمری کی عدالت میں پیش کیا گیا، وہ انھیں دیکھ کر نہایت متاثر ہوا اور کرسی پر بٹھایا۔ بیان لینے کے بعد حسب قاعدہ انھیں حوالات میں بھیج دیا گیا۔ لاہور ان کے لیے کوئی اجنبی شہر نہ تھا۔ یہاں کے بے شمار لوگ ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھے، انھیں گرفتاری کا پتا چلا تو فنانشل کمشنر صاحب کے دفتر کے سامنے آ بیٹھے۔ فنانشل کمشنر کو مختلف ذرائع سے مولانا کی شخصیت کا علم ہوا تو انھیں دوبارہ عدالت میں طلب کیا اور کہا۔

''آپ کا کوئی ضامن ہے تاکہ آپ کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے؟''

فرمایا: ''ہاں ......!''

پوچھا: ''کون؟''

آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر جواب دیا: ''میرا ضامن اللہ تعالیٰ ہے۔''

اس پر مسل نویس اور دیگر اہل کار جو وہاں موجود تھے، مسکرائے، لیکن فنانشل کمشنر کے دل پر اس کا بے حد اثر ہوا، اور کہا: ''اچھا تو ہم آپ کو اسی کی ضمانت پر رہا کرتے ہیں۔'' چنانچہ انھیں رہا کر دیا گیا۔[1]

دوبارہ نظر بندی اور وعظ کی ممانعت

1857ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کی ہزیمت کے بعد کا زمانہ نہایت نازک اور پُر آشوب تھا۔ انگریزی حکومت اس قدر حساس بلکہ بدحواس ہوگئی تھی کہ ذرا سی شکایت اور شبہے پر بڑے سے بڑے آدمی کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیتی تھی۔ علمائے کرام کو بالخصوص نشانۂ ستم بنایا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ ملک میں بغاوت پھیلانے کا ذمے دار یہی گروہ ہے۔ چنانچہ ضمانت پر رہائی کے بعد مولانا کو ان کے گاؤں میں نظر بند کر دیا گیا۔ کافی عرصہ نظر بند رہے، نہ کہیں جانے کی اجازت تھی نہ وعظ و نصیحت کی۔

ایک مدت کے بعد حالات معمول پر آئے تو نظر بندی بھی ختم کر دی گئی اور وعظ و نصیحت کی اجازت بھی دے دی گئی۔

حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ

مولانا غلام رسولؒ صاحب کے دو اساتذہ کرام (مولانا غلام محی الدین بگویؒ اور مولانا حافظ احمد الدین بگویؒ) کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ان حضرات سے انھوں نے اس عہد کے مروجہ نصاب کی کتابیں پڑھیں۔ ذیل کی سطور میں حضرت میاں سید نذیر حسینؒ دہلوی کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جن سے انھوں نے حدیث کی سند لی۔

ولادت اور خاندان

حضرت میاں صاحب نہ صرف ہندوستان کے بلکہ دنیاے اسلام کے عظیم المنزلت عالم دین تھے۔ اپنے عہد کے تمام علوم پر انھیں عبور حاصل تھا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ عرب وعجم کے تقریباً تمام ممالک کے شائقین علومِ دینیہ نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے اکتسابِ فیض کیا۔ اس جلیل القدر عالم کی ولادت 1220ھ (1805ء) کو موضع بلتھوا میں ہوئی جو ہندوستان کے صوبہ بہار کا ایک معروف گاؤں ہے۔ بعدازاں اس خاندان کے بعض لوگ موضع سورج گڑھ چلے گئے تھے جو بلتھوا سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ حضرت میاں صاحب کا سلسلہ

نسب 34 ویں پشت میں بہ واسطہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ تک اور 35 ویں پشت میں بہ واسطہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ حضرت ممدوح ننھیال اور دودھیال کی طرف سے نقوی حسینی سید ہیں۔ والد کا اسم گرامی سید جواد علی تھا جو فارسی زبان میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔

میاں صاحب کا خاندان اس علاقے میں علم وفضل میں بھی ممتاز تھا اور دنیوی لحاظ سے بھی اپنا ایک مقام رکھتا تھا۔ چھٹے مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے عہد سے اس خاندان کے بعض افراد خدمتِ قضا پر مامور چلے آرہے تھے۔ عہدۂ قضا کی دو سندیں اس کے چند ارکان کے پاس موجود تھیں۔ ایک سند بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی عطا کردہ تھی جس میں ان کو سورج گڑھ اور چند دیگر مقامات کے منصبِ قضا پر فائز کیا گیا تھا اور ایک سند شاہ عالم بادشاہ کی طرف سے جاری کی گئی تھی۔ اس میں بھی سورج گڑھ اور صوبہ بہار کے چند دیگر مقامات کے عہدۂ قضا پر متمکن ہونے کا فرمان مرقوم تھا۔

تحصیل علم کا آغاز

حضرت میاں صاحب نے تحصیل علم کا آغاز اپنے والد ماجد سید جواد علی سے کیا۔ وہ فارسی کے ماہر اور عربی سے آشنا تھے۔ میاں صاحب نے ان دونوں علوم کی ابتدائی کتابیں انھی سے پڑھیں اور محنت اور انہماک سے پڑھیں۔ باپ پڑھانے میں تیز تھے اور بیٹا پڑھنے میں تیز تھا۔ چنانچہ تھوڑے عرصے میں بہت کچھ حاصل کر لیا۔ اب وہ اس راہ پر چل پڑے تھے اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد اس راہ کی تمام منزلیں طے کر لی

جائیں۔ والد صاحب سے جو استفادہ کر سکتے تھے کر لیا تھا، اب ارادہ آگے بڑھنے اور نئے اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا تھا۔

عظیم آباد کو روانگی

اس زمانے کے صوبہ بہار کے دارالحکومت عظیم آباد (پٹنہ) کو مدینۃ العلم کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ حضرت میاں صاحب کو ان کے شوقِ علم نے وہاں پہنچا دیا۔ وہاں کے محلہ نمو ہیاں میں شاہ محمد حسین صاحب کے مکان پر قیام کیا، جہاں طلبا کی تعلیم اور کفالت کا بہت اچھا انتظام تھا۔ طلبا خاصی تعداد میں وہاں تحصیل علم میں مصروف تھے۔ میاں صاحب کا قیام وہاں چھ مہینے رہا۔ اس مدت میں انھوں نے وہاں کے اساتذہ سے قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھا اور کتب حدیث میں مشکوٰۃ شریف پڑھی۔ یہاں ان کے شوقِ حصول علم میں مزید اضافہ ہوا اور انھوں نے آگے بڑھنے کا عزم فرمایا۔

مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ اور سید احمد شہید رحمہ اللہ سے ملاقات

یہاں یہ عرض کر دیں کہ مولانا اسماعیل دہلوی رحمہ اللہ اور سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ تین سو سے زیادہ آدمیوں کے ساتھ یکم شوال 1236ھ (2۔ جولائی 1821ء) کو نماز عید الفطر پڑھنے کے بعد سفرِ حج کے ارادے سے رائے بریلی سے روانہ ہوئے تھے۔ وہ ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگاتے اور ان میں قیام کرتے ہوئے کئی مہینوں کے بعد عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے تھے اور وہاں کے ایک مقام ”گول گھر“ کے سامنے ان کا قافلہ اترا تھا۔ ”لین“ کے میدان میں جمعے کی نماز ہوئی تھی اور مولانا اسماعیل شہید نے وعظ فرمایا تھا۔ حضرت میاں صاحب فرماتے ہیں:

''ہم اس وعظ اور نماز میں شریک تھے۔ سارا میدان لین کا آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلی ملاقات سید صاحب اور مولانا شہید سے یہیں پٹنہ میں ہوئی تھی۔''[1]

حضرات شہیدین کے ساتھیوں کا یہ قافلہ چند روز وہاں رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اور مولانا شہید کی اس صحبت اور وعظ کی برکت سے میاں صاحب کے دل میں دہلی جانے اور وہاں تعلیم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی زندہ تھے اور دہلی میں تشریف فرماتھے۔ وہ حضرت مولانا اسماعیل شہید کے خانوادۂ رفیع القدر کے رکنِ اعلیٰ تھے اور سید احمد بریلوی کے مرشدِ ذی شان! نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام اسلامی ممالک میں ان کی فضیلتِ علمی کا شہرہ تھا اور ہر جگہ ان کے فیض یافتہ لوگ موجود تھے۔ میاں صاحب کا عازمِ دہلی ہونے کا اصل مقصد حضرت شاہ عبدالعزیز کے حضور زانوئے شاگردی تہ کرنا تھا۔

دہلی کو روانگی

1237ھ (1822ء) کو حضرت میاں صاحب پٹنہ سے دہلی کو روانہ ہوئے اور غازی پور پہنچے، وہاں مولانا احمد علی چڑیا کوٹی کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ کچھ عرصہ ان کے پاس رہے اور ان سے چند درسی کتابیں پڑھیں۔ غازی پور سے بنارس کا عزم کیا۔ وہاں بھی کچھ مدت قیام رہا۔ بنارس سے الہ آباد کو روانہ ہوئے اور جمنا کے کنارے ایک مسجد میں قیام کیا۔ اس اثنا میں وہاں مولوی زین العابدین سے صرف ونحو وغیرہ علوم کی چند کتابیں پڑھیں۔

[1] الحیات لبعد الممات ص26۔

الہ آباد سے روانہ ہو کر ضلع فتح پور کے ایک مقام موضع ''کوڑا'' گئے۔ وہاں سے کان پور، پھر فرخ آباد وغیرہ کے چکر لگاتے ہوئے 13۔رجب 1243ھ (30۔جنوری 1828ء) کو دہلی پہنچے۔ یعنی پٹنہ سے لے کر دہلی تک کا سفر انھوں نے چھ سال میں کیا۔ اس سے تقریباً چار سال قبل 7۔شوال 1239ھ (5۔جنوری 1824ء) کو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی وفات پا چکے تھے۔

تحصیل علم کا آغاز

دہلی آنے کے بعد حضرت میاں صاحب نے پنجابی کٹڑہ کی مسجد اورنگ آبادی میں تحصیل علم کا آغاز کیا۔ وہاں ان کے استاد تھے مولانا عبدالخالق دہلوی، مولانا اخوند شیر محمد قندھاری، مولانا محمد بخش عرف تربیت خاں، مولانا عبدالقادر رام پوری، مولانا حکیم نیاز احمد سہسوانی، ملا محمد سعید پشاوری، مولانا کرامت علی اسرائیلی اور مولانا جلال الدین ہروی۔ ان حضرات سے میاں صاحب نے مختلف علوم وفنون کی درسی کتابیں پڑھیں۔

حضرت شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ کے حلقۂ درس میں

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا حضرت میاں صاحب کا دہلی تشریف لانے کا اصل مقصد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے تحصیل علم کرنا تھا، لیکن وہ ان کے ورودِ دہلی سے قبل سفرِ آخرت پر روانہ ہو چکے تھے اور ان کی مسندِ درس پر ان کے لائق ترین نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب متمکن تھے۔ حضرت میاں صاحب نے ان سے صحاح ستہ کی تکمیل کی۔ نیز تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، کنزالعمال اور حافظ سیوطی کی جامع صغیر کا درس لیا۔ حضرت شاہ صاحب نے میاں صاحب کو جو سند عطا فرمائی اس میں وہ رقم

فرماتے ہیں: سمع منی الا حادیث الکثیر ۃ۔ یہ پوری سند ذیل میں درج کی جارہی ہے۔
حضرت میاں صاحب کو صحیح بخاری اور صحیح مسلم پڑھنے کا شرف مولانا عبدالخالق صاحب سے بھی ہوا اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے بھی۔! سند یہ ہے:

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العا لمین والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین محمد واله وصحبه اجمعین۔ اما بعد فیقول العبد الضعیف محمد اسحاق ان السید النجیب المولوی ، حمد نذیر حسین قدقرأ علی اطرافاً من الصحاح الستةالبخاری ؤمسلم وابی داؤد والجامع الترمذی و النسائی وابن ماجة وشیأً من کنزالعمال والجامع الصغیر وغیر ها وسمع منی الاحادیث الکثیرۃ وعلیه ان یشتغل بقرأۃ هذه الکتب ویتدرس بها لا نه اهلها بالشروط المعتبرۃ عند اهل الحدیث وانی حصلت القرأۃ والسماعة والاجازۃ لهذهِ الکتب من الشیخ الا جل الشیخ عبدالعزیز المحدث الدهلوی وهو حصل القرأۃ والا جازۃ عن الشیخ ولی الله المحدث الدهلوی رحمة الله علیهما وباقی سنده مکتوب عنده۔ حرره فی ثانی عشرشوال1258الهجریة۔ الحمد لله اولًا واخراً۔

نشانِ مہر
محمد اسحاق
1258ھ

شادی

جس زمانے میں میاں صاحب دہلی میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے کسبِ فیض کر رہے تھے، اسی زمانے میں ان کی شادی اپنے شفیق ترین استاذ مولانا سید عبدالخالق صاحب کی صاحب زادی سے ہوئی۔ یہ ان کے دہلی تشریف لانے کے چھ سال بعد 1248ھ (1832ء) کا واقعہ ہے۔ اس شادی کے کفیل حضرت شاہ محمد اسحاق اور ان کے برادرِ صغیر شاہ محمد یعقوب تھے۔ نکاح مسجد اکبر آبادی میں ہوا تھا، جس میں حضرت شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب سمیت تمام اساتذہ اور طلباے علم شریک تھے۔ دونوں شاہ صاحبان تمام رات قرآن مجید اور سنن ابی داؤد شریف کا درس فرماتے رہے۔ صبح کو نکاح ہوا، اس کے بعد دعوتِ ولیمہ ہوئی۔ ولیمہ تناول فرما کر شاہ صاحب اپنے دولت خانہ پر تشریف لے گئے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب اپنے اس شاگرد میاں سید نذیر حسین صاحب سے کس قدر مشفقانہ سلوک فرماتے تھے اور ان کی کتنی دلجوئی کرتے تھے۔

جہاد کا فتویٰ

1857ء کی جنگ آزادی کو علمائے کرام نے جہاد قرار دیا تھا اور اس سلسلے میں 2۔ جولائی 1857ء کو ایک فتویٰ جاری کیا تھا۔ دورانِ جنگ میں جنرل بخت خاں دہلی آیا تو اس

نے وہاں کے علمائے کرام کو جامع مسجد میں جمع کیا اور ان سے جہاد کا فتویٰ مرتب کرایا۔ یہ فتویٰ اس زمانے کے اخبارات (ظفر الاخبار اور صادق الاخبار) میں شائع ہوا تھا۔ اس فتوے پر چونتیس (34) علمائے کرام نے دستخط کیے تھے، جن میں حضرت میاں صاحب کے دستخط بھی ہیں۔ دستخط کنندگان حضرات کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

① مولانا نور جمال
② مولانا محمد
③ مولوی عبدالکریم
④ مولانا سکندر علی
⑤ مولانا سید نذیر حسین دہلوی
⑥ مولانا رحمت اللہ
⑦ مفتی صدرالدین آزردہ
⑧ مفتی اکرام الدین معروف بہ سید رحمت علی
⑨ مولانا محمد ضیاء الدین
⑩ مولانا عبدالقادر لدھیانوی
⑪ مولانا شاہ احمد سعید مجددی
⑫ مولانا محمد منیر خاں
⑬ مولانا شاہ عبدالغنی مجددی
⑭ مولانا محمد علی
⑮ مولانا فرید الدین
⑯ مولانا محمد سرفراز علی
⑰ سید محبوب علی جعفری
⑱ مولانا ابو حامد محمد حامی الدین
⑲ سید احمد علی
⑳ مولوی الٰہی بخش
㉑ مولانا محمد کریم اللہ
㉒ مولوی سعید الدین
㉓ مولوی محمد مصطفیٰ خاں ولد حیدر شاہ نقشبندی
㉔ مولوی محمد انصار علی
㉕ مولانا حفیظ اللہ خاں
㉖ مولانا محمد نور الحق
㉗ مولوی محمد ہاشم
㉘ مولوی حیدر علی
㉙ مولانا سیف الرحمٰن لدھیانوی

(۳۰) سید محمد (۳۱) مولوی محمد امداد علی

(۳۲) سید عبد المجید (۳۳) مفتی رحمت علی خاں

(۳۴) قاضی محمد علی حسین۔

تدریس علمِ حدیث

فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت میاں صاحب نے مسند درس کو زینت بخشی۔ ان کا انداز تدریس بالخصوص علم حدیث پڑھانے کا اسلوب کچھ ایسا تھا کہ بہت جلد اس کی شہرت اکناف ملک سے نکل کر اقطار عالم میں پھیل گئی اور مختلف ملکوں کے طلبا ےعلم ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے مستفیض ہونے لگے۔ ہندوستان کے لوگ تو ان سے حصول فیض کرتے ہی تھے، اس کے علاوہ حجاز، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، یمن، نجد، حبش، افریقہ، تیونس، الجزائر، کابل، غزنی، قندھار، سمرقند، بخارا، داغستان، ایشیاے کوچک، ایران، مشہد، ہرات، چین، کوچین، برما (میانمار)، سری لنکا وغیرہ ملکوں اور علاقوں کے بے شمار طلبا ان کی خدمت میں آئے اور ان سے کتب حدیث پڑھیں۔ پھر ان حضرات نے اپنے اپنے ملکوں میں واپس جا کر مسانید حدیث آراستہ کیں اور فرامین پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دنیا میں پھیلانے کے لیے کوشاں ہوئے۔ پھر آگے چل کر ان کے شاگردوں کے شاگردوں اور پھر ان کے شاگردوں نے قال اللّٰه وقال الرسول کی صدائیں بلند کیں۔ اس طرح سلسلۂ نشر و اشاعتِ حدیث مسلسل آگے بڑھتا گیا اور ان شاء اللہ بڑھتا رہے گا۔

گرفتاری

1863ء اور اس کے بعد انبالہ، عظیم آباد، مالدہ اور راج محل وغیرہ میں مولانا احمداللہ، مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، مولانا محمد جعفر تھانیسری اور دیگر حضرات پر انگریزوں نے بغاوت کے مقدمات قائم کیے تو اس سلسلے میں دہلی سے حضرت میاں صاحب کو بھی گرفتار کرلیا گیا اور انھیں دہلی سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر دور راولپنڈی کی جیل میں بند کردیا گیا تاکہ ان کا کوئی رشتے دار یا تعلق دار اتنا طویل سفر کر کے انھیں مل نہ سکے۔ اس زمانے میں نہ ریل چلتی تھی، نہ سڑکیں تھیں اور نہ بسیں اور ٹرینیں تھیں۔ اتنا دوردراز کا سفر کرنا بے حد مشکل تھا۔ میاں صاحب ایک سال راولپنڈی جیل میں قید رہے۔

سند حدیث

ہمارے ممدوح ومخدوم مولانا غلام رسول نے 1857ء (1273ھ) میں حضرت میاں صاحب سے حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں اور اس سے چھ سال بعد 1279ھ میں ان سے سندِ حدیث لی جو مندرجہ ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والعاقبة للمتقین والصلوة والسلام علی خیر خلقه محمدٍ واله واصحابه اجمعین امابعد فیقول العبد العاجز محمد نذیر حسین عافاہ اللہ تعالی فی الدارین ان

المولوی عبدالله المعروف غلام رسول السا کن فی موضع گوجرانوالا، لقینی 1273 الهجریة و سمع منی طرفاً من صحیح البخاری ومقدمة صحیح مسلم فوجد ته صاحب القریحة الوفادة والطبیعة النقادة و حائز المکارم بالرم والطم فعلیه ان یشتغل بتدریس الا حادیث و اقراء کتب الصحاح الستة البخاری ومسلم وابی داؤد وجامع الترمذی والنسائی وابن ماجة وغیرها من ملحقات الصحاح کا لمشکوٰة والشما ئل وحصن الحصین والجامع الصغیر وجمع الجوامع وکنزالعمال وکتب البیهقی وغیرهامن کتب الا حادیث لانه ا هل للشروط المعتبرة عند اهل الحدیث و متفضل بذلك الحال الله بقاء ہ ویسرلنا لقائه، وانی حصلت القرأة والسماعة والاجازة هذا الکتب المذکورة من الشیخ الاورع البارع المختص بالمأثر الجلیله والمفاخر العلیة علی الاطلاق مولانا محمد اسحٰق رحمه الله تعالٰی وهو حصل القرأة والا جازة لهذا الکتب عن الشیخ الا جل الاکرم الشیخ عبدالعزیز المحدث الدهلوی وهو حصل القرأ ة والاجازة لهذاالکتب عن الشیخ مسند الوقت بقیة السلف وحجة الخلف ولی الله المحدث الدهلوی رحمهم الله تعالٰی وباقی سنده مکتوب عنده حرره 1279 الهجریة المقد سة فی التاریخ

العشرین منالربیع الثانی۔

الراقم العاجز

نشان مہر

سید محمد نذیر حسین

حضرت میاں صاحب نے کم وبیش ستر (70) برس درس حدیث دیا اور 10۔رجب 1320ھ (13۔اکتوبر 1902ء) کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تیرھواں باب

مولانا شاہ عبدالغنی مجددیؒ

مولانا غلام رسولؒ 1288ھ (1872ء) کو حج بیت اللہ کے لیے گئے تو مدینہ منورہ میں مولانا شاہ عبدالغنی مجددیؒ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا اور ان سے سندِ حدیث لی۔ مولانا عبدالغنی مجددی حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے اخلاف میں سے تھے۔ اس خانوادۂ عالی مرتبت کا تقریباً ہر فرد زیورِ علم سے آراستہ تھا۔ آج اس برصغیر کے مختلف گوشوں میں فروغِ علم کی جو مسندیں بچھی ہوئی ہیں، ان میں کسی نہ کسی شکل میں اس خاندان کے اصحابِ کمال کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان میں سے کسی بزرگ نے تصوف وطریقت کی محفلیں جمائیں، کسی نے وعظ ونصیحت کا راستہ اختیار کیا، کوئی بزرگ تصنیف و تالیف کی راہوں پر گامزن ہوئے اورکوئی درس و تدریس کے میدان میں اترے۔ غرض ہر ایک نے اپنی بساط و استطاعت اور حالات کے مطابق وہ خدمات انجام دیں جن کی ہمہ گیر اثر پذیری سے بنجر دلوں کی کھیتیاں سرسبز ہوئیں اور قلب ونظر کے بھٹکے ہوئے قافلوں نے تسکین و راحت کی منزل پائی۔ ان حضرات کے نوع بنوع کارنامے آج تذکرہ و رجال کی

کتابوں کے زریں باب بن گئے ہیں اور لوگ ان سے مستفید ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ مولانا عبدالغنی مجددی اسی بحرِ ناپیدا کنار کی ایک موجِ خوش خرام تھے، جس سے ہزاروں تشنہ لبوں نے سیراب ہونے کی سعادت حاصل کی۔

مولانا شاہ عبدالغنی مجددی 22۔ شعبان 1235ھ (25۔ مئی 1820) کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب ساتویں پشت میں حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی سے ملتا ہے اور وہ یہ ہے: عبدالغنی بن شاہ ابوسعید زکی القدر بن صفی القدر بن عزیز القدر بن محمد عیسیٰ بن سیف الدین بن خواجہ محمد معصوم بن حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہم اجمعین۔۔۔! نسلاً فاروقی تھے اور ان تمام اوصاف سے متصف تھے جو ان کے آباؤ اجداد میں پائے جاتے تھے۔ ان کے والد گرامی مولانا شاہ ابوسعید مجددی دہلوی دیارِ ہند کے بلند مرتبت علما وفقہا اور اصحاب طریقت وتصوف میں سے تھے۔ برادرِ کبیر مولانا شاہ احمد سعید مجددی کا شمار بھی خطۂ ہند کے جلیل القدر ارباب فقہ اور نامور صوفیا و اتقیا میں ہوتا ہے۔ ان کا گھرانا علم و عمل اور فضل وکمال کا گھرانا تھا اور بڑے بڑے فضلا ان کے حلقے میں شامل ہوئے جو ان کی صحبت اختیار کرنے کو اپنے لیے موجب شرف قرار دیتے تھے۔

شاہ عبدالغنی نے کچھ ہوش سنبھالا تو قرآن مجید حفظ کیا، پھر مولانا حبیب اللہ دہلوی سے صرف ونحو اور علوم عربی کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد حصول حدیث و فقہ کی طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی۔ حدیث کی تحصیل مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے کی۔ مؤطا امام محمد اپنے والد گرامی شاہ ابوسعید سے پڑھا، اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ مشکوٰۃ شریف کا درس شاہ رفیع الدین دہلوی کے فرزند گرامی شاہ مخصوص اللہ سے

لیا۔ 1249ھ میں عازمِ حجاز ہوئے اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ اس زمانے میں سرزمین حجاز میں مولانا محمد عابد سندھی اور شیخ ابو زاہد اسماعیل رومی کا غلغلۂ درسِ حدیث بلند تھا، شاہ عبدالغنی نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور سند حدیث سے متفخر ہوئے۔ بعد ازاں ہندوستان کو مراجعت فرمائی اور دہلی میں مسندِ درس حدیث آراستہ کی۔

تیرھویں صدی ہجری میں شاہ محمد اسحاق دہلوی کے دریائے فیض سے دو طویل و عریض نہریں جاری ہوئیں۔ ایک سرعنوان بزرگ شاہ عبدالغنی مجددی کے نام سے موسوم ہے اور ایک حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے نام نامی سے۔۔۔ آگے چل کر ان سے فیض کے بے شمار چشمے پھوٹے، جنھوں نے برصغیر کے علاوہ دیگر ممالک اسلامیہ کو بھی سیراب کیا۔

شاہ عبدالغنی علم وفضل میں درجۂ امامت پر فائز تھے۔ رجوع الی اللہ میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ہر وقت دل پر خوفِ خدا طاری رہتا۔ حدیثِ رسول پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت اور اتباع سنت کا جذبہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ حسنِ اخلاق کا پیکر تھے۔ لوگوں کو نفع پہنچانا اور ان سے نیکی کا برتاؤ کرنا ان کا شیوہ تھا۔ دنیا کے مال ومتاع سے کبھی تعلق نہیں رکھا۔ وہ اس جہانِ گزراں میں فرشتہ سیرت عالم تھے۔

سرزمین برصغیر میں انھوں نے علم حدیث کی تدریس و ترویج میں بے پناہ خدمت سرانجام دی۔ وہ گوشہ گیر بزرگ تھے اور مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر درسِ حدیث دیتے تھے۔ ان سے بے شمار علما نے کسب علم حدیث کیا اور پھر وہ اس علم کی اشاعت کا بہت بڑا ذریعہ بنے۔ ان کے تلامذۂ حدیث کے وسیع حلقے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا عبدالحلیم انصاری لکھنوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

آج ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں علوم حدیث کے جو مراکز دکھائی دیتے ہیں، ان کی نسبتِ قیام جن بزرگوں کی طرف جائے گی، ان میں شاہ عبدالغنی کے اسم گرامی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

شاہ عبدالغنی مجددیؒ جس دور میں دہلی میں مشغولِ تدریس حدیث تھے، اسی دور میں 1857ء کا حادثہ ہائلہ پیش آیا، قمری اعتبار سے وہ 1273ھ تھا۔ شدید خوں ریزی کے بعد انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کرلیا اور دہلی کے گلستانِ علم اجڑ گئے۔ شاہ عبدالغنی کا مدرسہ بھی انگریزوں کی دست برد کی نذر ہوگیا۔ علمائے ہند کے لیے بالخصوص یہ نہایت ابتلا کا وقت تھا۔ یہ بوریا نشین مسجدوں اور مدرسوں میں علومِ اسلامی کی جو خدمت انجام دے رہے تھے، اس میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں اور یہ ملک اپنی انتہائی وسعت کے باوجود ان کے لیے تنگ ہوگیا۔ علمائے دین حالات سے مایوس اور وقت کی آندھیوں سے دل برداشتہ ہونے کے کبھی عادی نہیں رہے، لیکن یہ انقلاب و تغیر کی ایسی خونی لہر تھی کہ بعض حضرات نے یہ محسوس کیا کہ اب آگے چلنے کے راستے بالکل مسدود ہوگئے ہیں۔ ان کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اس ملک سے جس میں انھوں نے قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند کرنے میں عمریں کھپادی تھیں، ہجرت کر جائیں اور اس کی سکونت ترک کر کے ارض حجاز کو اپنا مسکن بنالیں۔ چنانچہ اس ہنگامۂ دار و گیر میں شاہ صاحب ممدوح نے دہلی کو خیر باد کہا اور حجاز کی راہ لی۔ پہلے مکہ معظّمہ گئے۔ اس کے بعد مدینہ منورہ کا قصد کیا اور پھر وہیں قیام پذیر ہوگئے۔ ان کے برادرِ کبیر مولانا شاہ احمد سعید مجددی دہلوی نے بھی اسی ہنگامے کے نتیجے میں اہل وعیال سمیت مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کرلی تھی۔ لیکن اس

ناموافق عہد میں جن علماے کرام نے اپنے ملک ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا اور حالات کی سنگینی کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے پاکیزہ ترین مشن کی گاڑی کو صحیح رفتار کے ساتھ آگے بڑھاتے رہے، وہ بھی انتہائی دل گردے کے مالک تھے۔ اللہ نے ان کو ان کے نیک مقاصد میں کامیابی سے نوازا۔ رحمۃ اللہ علیہم۔

حضرت شاہ عبدالغنی رحمہ اللہ کا عمر بھر ایک ہی مشغلہ رہا اور وہ تھا درسِ علم حدیث۔ مدینہ منورہ میں بھی شائقین حدیث کا بہت بڑا گروہ ان کے درس میں جمع ہوگیا۔ اس گروہ میں ہندوستان کے طلبا بھی شامل تھے اور حجاز، نجد، یمن، عراق، ترکی، خراسان، ماوراء النہر اور دیگر ممالک اسلامیہ کے بھی۔۔۔! دہلی کی بہ نسبت مدینہ منورہ میں ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اور ہر ملک کے طلبائے حدیث کھنچے ہوئے ان کے درس میں شامل ہوتے تھے، اس لیے کہ مطالبِ حدیث کے حل وکشود میں ان کی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی تھی۔

حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمہ اللہ نے تدریس کے علاوہ تحریری طور پر بھی حدیث کی خدمت کی اور ''انجاح الحاجۃ'' کے نام سے حدیث کی مشہور کتاب ''سنن ابن ماجہ'' پر ذیل سپرد قلم کی جو اپنے انداز کی بہترین ذیل ہے۔

تیرھویں صدی ہجری کے یہ وہ ہندی عالم تھے جو تدریس حدیث کے لحاظ سے عرب وعجم کے علما وطلبا میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ اس عالم کبیر نے منگل کے روز 6۔محرم 1296ھ (31۔دسمبر 1878ء) کو مدینہ منورہ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[1]

[1] تذکرہ علمائے ہند ص 126۔۔۔ نزھۃ الخواطر ج 7، ص 289، 290۔۔۔ آثار الصنادید ص 215، 216۔۔۔ ابجد العلوم ص 929، 930۔۔۔ واقعات دار الحکومت دہلی ج 2، ص 395۔۔۔ حدائق الحنفیہ ص 490، 491۔۔۔ الیانع الجنی۔

مولانا غلام رسول قلعوی نے 1288ھ میں مدینہ منورہ میں ان سے جو سند حاصل کی، وہ مندرجہ ذیل ہے اور مولانا کی سوانح حیات کے صفحہ 40، 41 پر درج ہے۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ اولا واخراً والصلوۃ والسلام علی رسولہ دائماً وسرمداً۔ اما بعد فقد ور دعلی فی المدینۃ المنورۃ الفاضل الفحول مولانا غلام رسول والتمس منی اجازۃ الحدیث والتفسیر و بغیر ھما من الکتب المعتمدۃ اسانیدھا فی حصر الشاردوالبالغ فاجزت لہ واسأل اللہ ولہ التوفیق با تبا ع السلف الصالحین من الائمۃ والمجتھدین والصوفیۃ الصافیۃ المنادین بالشریعۃ الطاھرۃ رضوان اللہ علیھم اجمعین وصلی اللہ علی سیدنا محمدٍ والہ واصحابہ اجمعین۔

قال بفمہ وکتبہ بقلمہ الملتجیٔ الحرم النبی عبدالغنی بن ابی سعید المجددی الدھلوی

نشان مہر حضرت مسند صاحب
عبدالغنی عفااللہ

جہادِ 1857ء کے وجوہ و اسباب

1857ء کی جنگِ آزادی کا گزشتہ صفحات میں متعدد مرتبہ ذکر آیا ہے۔ خود مولانا غلام رسول کو اس موقعے پر بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے استاذِ محترم حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی نے ایک فتوے کے ذریعے اسے جہاد قرار دیا۔ اس دور کے بے شمار علمائے کرام کو اس وقت شدید اذیتوں میں مبتلا کیا گیا۔ پھر طویل مدت تک اس کے آثار باقی رہے اور مولانا یحییٰ علی، مولانا احمد اللہ، مولانا عبدالرحیم، مولانا محمد جعفر تھانیسری رحمہ اللہ اور بہت سے علمائے کرام کو اس کے نتائج بھگتنا پڑے۔ انھیں طویل اور سخت سزائیں دی گئیں۔ گرفتار کر کے کالے پانی (جزائر انڈیمان) بھیجا گیا۔ حضرت میاں سید نذیر حسین کو پکڑ کر دہلی سے سیکڑوں میل دور راولپنڈی کی جیل میں قید کیا گیا۔ یہ بہت بڑا جہادِ حریت تھا۔ اختصار کے ساتھ اس کا ذکر ایک مستقل باب میں کیا جاتا ہے۔

1857ء کے جہادِ حریت کی ابتدا میرٹھ سے ہوئی، جب کہ 11 مئی کی صبح کو میرٹھ کی دیسی سپاہ دہلی پہنچی اور اس نے بہادر شاہ ظفر، مغل شہزادوں اور لال قلعہ کے مکینوں کو

مجبور کیا کہ وہ برصغیر سے انگریز کو نکالنے کے لیے میدان جہاد میں اتریں۔ چند ہی روز میں اس کے اثرات پورے ملک میں پھیل گئے اور اس کی ہمہ گیریوں اور وسعت پذیریوں نے جہاں فوج پر بے پناہ اثر ڈالا، وہاں علماء، عوام، نواب اور جاگیردار بھی حالات کی رفتار سے مجبور ہو گئے کہ شمشیر بکف ہو کر میدانِ مبارزہ میں نکلیں۔ چنانچہ چند ہی روز میں ہر طبقہ و خیال کے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے اور ملک کو انگریز کے وجود سے پاک کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا تہیہ کر لیا۔ بے شک ان سب کی تکلیفیں مختلف تھیں اور مصائب ومشکلات جداگانہ نوعیت کی تھیں، لیکن واقعات نے انگریز کے خلاف ان سب کو متفق اللسان اور متحد الخیال کر دیا تھا۔

❁ دیسی فوج کو یہ غصہ تھا کہ انگریزی فوج کے مقابلے میں ان کی تنخواہیں بہت کم تھیں اور یہ ان تمام مراعات سے محروم تھے جو انگریزی فوج کو حاصل تھیں۔ حالاں کہ وفاداری اور دشمن کے ساتھ معرکہ آرائیوں میں دیسی فوج ہمیشہ پیش پیش رہتی تھی اور اس کا انگریز اعلیٰ افسروں کو بھی اعتراف تھا۔ لیکن کسی اونچے اور ذمہ دارانہ عہدے پر کوئی ہندوستانی فائز نہیں تھا۔ سب اہم مناصب پر انگریز چھائے ہوئے تھے، جب کہ بے شمار ہندوستانی فوجی نہایت قابل تھے۔ ان کی فوجی خدمات بھی بہت پرانی تھیں اور ان کا سابقہ ریکارڈ بھی بالکل صاف تھا، مگر انگریزی حکومت اور اعلیٰ انگریز حکام ان پر اعتماد نہیں کرتے تھے اور ان کو اونچے مناصب پر فائز کرنا انھیں منظور نہیں تھا۔ پھر چربی والے کارتوسوں کو استعمال کرنے کا جبری حکم ان کے لیے اور بھی باعث اہانت تھا۔

❁ طبقہ علماء اور مذہب پسند عنصر انگریزی عمل داری سے اس لیے نالاں تھا کہ انگریز براہِ

راست مذہب میں دخیل ہونے لگا تھا۔ پادریوں کا جال ملک میں بچھا دیا گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو وسیع پیمانے پر عیسائی بنایا جائے تاکہ اس ملک میں عیسائی حکومت کے خلاف کوئی شورش برپا نہ ہوسکے، اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ پورا ملک حلقہ بگوشِ عیسائیت ہوجاتا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے یہاں بڑے بڑے پادری بھیجے گئے اور انھوں نے اپنے مذہب کی پوری بے باکی اور آزادی کے ساتھ تبلیغ کی۔ بالخصوص اسلام پر وہ ایسے شدید حملے اور اتنی سخت نکتہ چینی کرنے لگے کہ اسے کوئی خود دار اور مذہب پسند شخص برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

❁ نوابوں اور جاگیرداروں پر یہ آفت آن پڑی تھی کہ ان کی ریاستیں چھینی جا رہی تھیں اور جاگیروں پر قبضہ کیا جا رہا تھا۔ ان میں سے بعض کو اتنی قلیل اور محدود پینشنیں دی جاتیں کہ ان کا معمولی گزارا تک مشکل ہوگیا۔ یہ اپنی جگہ بااختیار لوگ تھے اور ریاستوں کے مالک تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال کسی طرح ان کے لیے وجہِ اطمینان اور باعثِ سکون نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ والیانِ ریاست اس وقت تک خاموش رہے جب تک حالات ناسازگار تھے، جوں ہی حالات نے پلٹا کھایا اور انگریزی حکومت اور اس کی پالیسی کے خلاف ایک عام حرکت پیدا ہوئی، یہ لوگ ہاتھ میں تلوار پکڑ کر میدان میں آگئے۔

❁ ہندوستان کے مسلمان خصوصیت سے انگریزوں سے بغض وعناد رکھتے تھے کیونکہ انگریزوں نے براہِ راست مسلمانوں ہی سے حکومت چھینی تھی اور مسلمان ہی ان کی تیغِ ستم کا اولیں ہدف تھے۔ اس سے قبل سراج الدولہ کے بے رحمانہ قتل اور سلطان ٹیپو کی شہادت کا حادثہ ہائلہ بھی انگریز کے ہاتھوں، نوکِ شمشیر سے تاریخِ ہند کے

صفحات میں نقش ہو چکا تھا۔ پھر دلی کے لال قلعہ میں تیمور کا وارث، انگریز کی مکارانہ اور جابرانہ حکمت عملی سے بے بس و مجبور ہوا بیٹھا تھا اور اقتدار واختیار کی باگ ڈور مغل خاندان کے قبضے سے نکل کر کمپنی بہادر کی طرف منتقل ہو چکی تھی اور مسلمان اپنی آنکھوں کے سامنے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ اس شدید ضرب کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور نہیں کی۔ ان کی حمیت بیدار ہوئی۔ غیرت نے جوش مارا اور اپنے اہل وطن کے اشتراک سے انگریز کے جبر وقہر سے پنجہ آزمائی شروع کر دی۔ غرض ایک عمومی بے چینی اور ہمہ گیر اضطراب تھا جس نے ملک کے ہر طبقہ وخیال کے لوگوں کو جگایا اور ان کو انگریزی حکومت کے مقابلے میں لانے کا باعث بنا۔

❀ ملک کے عوام وخواص کے ساتھ 1857ء کے جہادِ حریت میں علماء نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1857ء سے ٹھیک چھبیس (26) سال قبل، 6۔ مئی 1831ء کو حضرت سید احمد بریلوی، مولانا اسماعیل دہلوی اور ان کے سیکڑوں رفقائے مخلصین بالاکوٹ میں شہادت پا چکے تھے۔ علماء میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور دیگر علما کی ایک طویل قطار ہے جو ہمیں انگریزی اقتدار کے خلاف صف آرا نظر آتی ہے۔ یہ حضرات اپنی اپنی جگہ نہایت معزز و محترم تھے۔ اخلاص وللّٰہیت کے اعتبار سے ان کا درجہ بہت اونچا تھا۔ یہ انگریز کے اجنبی اقتدار کے سخت تریں مخالف تھے۔ مناسب ہوگا، اگر ان میں سے بعض کے متعلق یہاں کچھ تعارفی الفاظ عرض کر دیے جائیں۔

❀ مولانا لیاقت علی رحمہ اللہ ضلع الہ آباد (یو۔ پی) کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کا حلقہ ارادت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ اپنے مریدوں میں ہر آن جہاد کی تلقین

وترغیب میں مشغول رہتے تھے۔انگریز کے خلاف انھوں نے کئی اشتہارات شائع کیے جو فوج اورعوام میں کثرت سے تقسیم کیے گئے ، ان کے مندرجات نے لوگوں میں انگریز کے خلاف اشتعال کی آگ بھڑکا دی تھی اورجوشِ جہاد پیدا کردیا تھا، مولانا ممدوح ہراس مقام میں گئے جہاں انگریز کی مخالفت ہوسکتی اوراسے کوئی تکلیف پہنچائی جاسکتی تھی۔ بالآخرگرفتار ہوئے اورانڈیمان بھیج دیے گئے۔ وہاں پہنچنے کے چندروز بعدان کا انتقال ہوگیا۔

❀ مولانا احمداللہ شاہ مدراسی رحمہ اللہ بھی اسی پاک باز طائفہ کے ایک رکن تھے جو اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک اور بے حد منتظم اورقابل شخص تھے۔1857ء کے جہادِ حریت میں ان کی خدمات ہر جگہ نمایاں رہیں۔انھوں نے چاروں طرف اپنے آدمی دوڑادیے تھے اور ایک عرصے سے انگریز کے خلاف فضا ہموار کررہے تھے۔فوج میں ان کی خفیہ کوششیں جاری تھیں اورمختلف ذمہ داریاں انھوں نے لائق اعتماد افراد کے سپرد کررکھی تھیں۔ انگریز مؤرخین کا بیان ہے کہ مولانا احمد اللہ مدراسی ان کے خلاف جگہ جگہ وعظ کہا کرتے تھے اور انگریزی اقتدار کونقصان پہنچانے کے درپے تھے۔کہیں اپنے اصلی لباس اوراصلی وضع وہیئت میں پہنچے اورکہیں فقیروں کے بھیس میں گئے۔ہرجگہ انگریز کے اجنبی اقتدار کو ختم کرنے کی تلقین کی۔اس بہادر مردمجاہدکوشاہ جہان پور سے شمال مشرق میں اٹھارہ میل دور راجا پوائیں جگن ناتھ کے بھائی نے گولی مارکرعین اس وقت شہید کردیا تھاجب کہ یہ ہاتھی پرسوار تھے اوراسی کی دعوت پر پوائیں گئے تھے۔

❀ مولانا رحمت اللہ رحمہ اللہ کیرانہ ضلع مظفرنگر کے باشندے تھے۔ نیک نفس اورمتدین

بزرگ تھے۔ انگریز سے ان کو بے حد عداوت تھی۔عیسائی لٹریچر پر ان کو عبور حاصل تھا۔ بڑے بڑے نام ور پادری ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔ان کا فیصلہ کن مناظرہ مشہور پادری فنڈر سے مارچ 1856ء (رجب 1272ھ) میں آگرہ میں ہوا،جس میں پادری مذکور نے شکست کھائی اور وہ اس شکست سے اتنا بددل ہوا کہ اس کے بعد اسے ہندوستان میں رہنے کی جرات نہ ہوئی اور وہ انگلستان چلا گیا۔

اضطرابِ میرٹھ کے بعد بغاوت کے آثار جب مظفر نگر پہنچے تو گرد و پیش کے لوگوں نے مولانا رحمت اللہ رحمہ اللہ کو اپنا سالار مقرر کرلیا اور انھوں نے انگریز کے خلاف خوب دادِ شجاعت دی۔ ناکامی کے بعد انگریزوں نے مولانا کی تلاش شروع کی تو وہ غائب تھے۔ان کی گرفتاری کا اشتہار دیا گیا۔گرفتار کرانے والے کے لیے معقول انعام کا اعلان کیا گیا لیکن مولانا ہجرت کر کے مکہ معظّمہ پہنچ گئے تھے۔ وہاں انھوں نے مدرسہ صولتیہ قائم کیا، الحمد للہ وہ مدرسہ اب تک قائم ہے۔انھوں نے 2 مئی 1891ء (24/ رمضان 1308ھ) کو مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔ ہجرت کے بعد ان کی جائیداد حکومت انگریزی نے ضبط کر لی تھی۔

ان کے علاوہ بے شمار علماے حق تھے،جنھوں نے 1857ء کے جہادِ حریت میں حصہ لیا اور انگریز کا ہدفِ ظلم بنے،رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

❁ عالموں اور فوجیوں کے علاوہ نوابوں،تعلقہ داروں،راجوں اور عام اثر و رسوخ کے مالک حضرات کا نمبر آتا ہے، جنھوں نے 1857ء کی تحریک آزادی میں حصہ لیا اور استخلاصِ وطن کے لیے جدوجہد کی ۔ ان میں ہندو،مسلمان اور مرہٹے سبھی شامل ہیں اور ان کے مشترکہ عمل و سعی کی داستان بہت طویل ہے۔ان میں شہزادہ

فیروز شاہ، تانتیا ٹوپے، نواب علی بہادر، نواب تفضّل حسین، خان بہادر خاں، ڈھونڈو پنت نانا، عظیم اللہ خاں، رانی لکشمی بائی (جھانسی) راجا کنور سنگھ اور نواب محمود خاں خاص شہرت کے مالک ہیں۔ ان کے متعلق بھی چند تعارفی الفاظ سنتے جائیے۔

❁ شہزادہ فیروز شاہ مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مذہبی امور کی طرف اس کا زیادہ رجحان تھا اور وظائف و اوراد سے بہت شغف تھا۔ 1856ء میں شہزادہ حج کے لیے گیا۔ واپس آیا تو 1857ء کا ہنگامہ شروع تھا۔ شہزادے نے بھی اس میں حصہ لیا اور مختلف معرکوں میں مجاہدین کے ساتھ دادِ شجاعت دیتا رہا اور مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، تانتیا ٹوپے، نانا راؤ، اور ان کے رفقاء کے ساتھ رہا۔ تحریک کی ناکامی کے بعد کے حالات میں اس کے متعلق مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایران اور روس ہوتا ہوا حجاز پہنچ گیا تھا۔ وہاں مکہ معظّمہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا یعقوب دہلوی، حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی اور مولانا محمد مظہر مجددی وغیرہ نے اصلاح و ہدایت کی غرض سے ایک جماعت قائم کی تھی، شہزادہ فیروز شاہ بھی اس میں شامل ہو گیا۔

ایک اور روایت کے مطابق اپریل 1868ء میں مجاہدین کے امیر مولانا عبداللہ باج کٹہ (علاقہ بونیر سرحد) کے پاس چلا گیا تھا۔ ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ 1906ء میں شہزادہ زندہ تھا۔

غرض شہزادہ فیروز شاہ مردِ مجاہد تھا اور راسخ عزم و ارادے کا مالک تھا۔

❁ تانتیا ٹوپے ایک بہادر مرہٹہ تھا۔ اس کا اصلی وطن تو ناسک کے علاقے میں ضلع پٹورہ میں ایک گاؤں تھا، لیکن کان پور سے متصل بٹھور میں ڈھونڈو پنت نانا کے پاس قیام

پذیر تھا اور نانا کا مصاحب تھا۔ اس بہادر جرنیل نے بے شمار مقامات میں انگریز کے ساتھ جنگ کی۔ حضرت محل، مولانا احمد اللہ شاہ، لکشمی بائی (رانی جھانسی) اور نانا کے ساتھ شامل ہو کر اس نے پوری شجاعت اور بہادری سے انگریز کے ساتھ جنگ لڑی اور ہر میدان میں انگریز کو پریشان کیا۔ رانی جھانسی کے مارے جانے کے بعد اس نے مختلف مقامات کے چکر لگائے اور انگریزی حکومت گرفتاری کے لیے اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اس اثنا میں گوالیار کے ایک ماتحت رئیس مان سنگھ سے اس کا تعلق قائم ہو گیا۔ مان سنگھ کی مہاراجا گوالیار سے چپقلش چل رہی تھی، جس کی وجہ سے وہ مہاراجا سے لڑائی پر آمادہ ہو گیا تھا اور طاقت جمع کرنے کے لیے جنگل میں چھپا بیٹھا تھا۔ تانتیا بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا اور ان میں دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے۔ جب انگریزوں کو اس کا پتا چلا تو انھوں نے مان سنگھ سے گفتگو کی اور مہاراجا گوالیار سے اس کی مصالحت کرا دینے کا وعدہ کیا اور آہستہ آہستہ اس کو اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ تانتیا کو گرفتار کرا دے گا۔ چنانچہ 7۔ اپریل 1859ء کو نصف رات کے وقت مان سنگھ نے دھوکے سے تانتیا کو گرفتار کرا دیا۔ انگریزوں کا جو دستہ اسے گرفتار کرنے آیا تھا، مان سنگھ اس کے ساتھ تھا۔ یہ دستہ تانتیا کو گرفتار کر کے 8۔ اپریل کی صبح کو فوجی کیمپ میں لے گیا۔ مان سنگھ کو اس کے عوض میں ایک جاگیر مل گئی۔ اسی کی جاگیر میں فوجی عدالت میں تانتیا پر مقدمہ چلایا گیا اور 18۔ اپریل 1859ء کو سپری کے مقام پر اس کو پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی کے وقت جنرل تانتیا کی عمر 45 برس کی تھی۔

❁ نواب علی بہادر یو۔ پی کی ایک ریاست باندہ کے نواب تھے۔ کان پور میں جب

ہنگامہ ہوا تو کچھ فوجی ان کے پاس بھی گئے اور انگریز کے خلاف لوگوں میں اشتعال پیدا کیا۔ خود علی بہادر کو بھی ساتھ لینے کی کوشش کی، لیکن یہ شرافتِ نفس کی وجہ سے ابتدا میں توپس و پیش کرتے رہے، لیکن بعد میں باقاعدہ انگریزی حکومت کے خلاف جنگ میں کود پڑے۔ جب انگریزی فوج باندہ پہنچ گئی تو یہ کالپی چلے گئے۔ وہاں تانتیا ٹوپے اور رانی جھانسی کے ساتھ شامل ہو کر انگریزی فوج سے جنگ کی۔ شکست کے بعد روپوش ہو گئے۔ 1858ء میں جب ملکہ وکٹوریہ نے اعلانِ عفو جاری کیا تو نواب علی بہادر نے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا لیکن انگریزوں نے انھیں معافی دینے کے بجائے ان کی ریاست چھین لی اور انھیں اندور میں نظر بند کر کے تین سو روپے ماہانہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ انھوں نے اندور ہی میں 1873ء میں وفات پائی۔

❁ خان بہادر خاں خاندانی اعتبار سے ریاست کے مالک تھے، لیکن اب ریاست ختم ہو چکی تھی۔ بریلی میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ 1857ء میں یہ پینشن پا رہے تھے اور عمر ستر سال کی تھی۔ روہیل کھنڈ کا علاقہ کسی زمانے میں چونکہ ان کا زیرِ نگیں رہ چکا تھا، اس لیے وہاں کے لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ 1857ء میں جنگ کے شعلے جب ہر سو بھڑک اُٹھے تو بریلی کا علاقہ بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا اور جنرل بخت خاں کی کوشش سے اس علاقے کے انتظامات ان کے سپرد کر دیے گئے۔

خان بہادر خاں ستر سال کے بوڑھے تھے لیکن بہت بڑے منتظم، بہادر اور پُر جوش تھے۔ انھوں نے اپنے علاقے کا انتظام نہایت مستحکم کر لیا تھا۔ ان کی فوج میں ایک ایسا

جیش بھی تھا جس کے تمام افراد نے یہ قسم کھارکھی تھی کہ میدانِ جنگ میں ڈٹے رہیں گے۔ تاوقتیکہ خود مر جائیں یا دشمن کو مارڈالیں۔ یہ سب بوڑھے فوجی تھے لیکن بڑے وجیہ اور بارعب تھے۔ان کی ڈاڑھیاں سفید ہوچکی تھیں۔ان کے ہاتھوں میں چاندی کی انگوٹھیاں تھیں۔وہ بجلی کی سی تیزی سے حملہ کرتے تھے اوران کے گھوڑے نہایت تیز رفتار تھے۔انھوں نے ایک دفعہ انگریزوں کے مددگار پنجابی سکھوں پرحملہ کیا جو ان کے مقابلے کی تاب نہ لاکرخس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

بہرحال خان بہادرانتہائی جواں مردی سے لڑے اوردشمن کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ 1859ء کوکوہستان نیپال کی ایک لڑائی میں اتفاق سے گھوڑے سے گر پڑے اور گرفتار ہوگئے۔کمشنرلکھنؤ کی کچہری میں پیش کیے گئے تو زمین پر بیٹھ گئے ۔کرسی پیش کی گئی تو کہا، ہمیشہ کرسی پر بیٹھے،اب قیدی ہیں تو قیدیوں کی جگہ بیٹھنا چاہیے۔چیف کمشنر نے بہ زور کرسی پر بٹھایا۔فوجی عدالت میں مقدمہ چلااور پھانسی کی سزادی گئی۔پھانسی دینے کے لیے لکھنؤ سے بریلی لائے گئے۔کہتے ہیں، جب انھیں پھانسی دینے لگے تو کہا گیا کوئی وصیت کرنی ہوتو کرلو۔جواب دیا: کوئی وصیت نہیں اور یہ شعر پڑھا۔

بہ جرم کلمہ حق مے کشند غوغائیست　　　　زمرگ زندگیم مے شود تماشائیست

نعش وارثوں کے حوالے کرنے کے بجائے بریلی کی ڈسٹرکٹ جیل کے اندر ہی دفن کردیے گئے ۔خان بہادرخاں کی مہر میں ”**الحکم للہ والملک للہ**“کے الفاظ کندہ تھے۔

❁ عظیم اللہ خاں ایک مدبراورصاحب الرائے شخص تھا۔کان پورکا رہنے والا تھا۔ انگریزوں کی مخالفت اس کا وظیفہ حیات تھا۔ڈھونڈو پنت (ناناراؤ) کا معتمدعلیہ

اور مشیر تھا۔اس کی وکالت کے لیے انگلستان بھی گیا تھا۔انگریز کی مخالفت کی آگ اس کے سینے میں ہمیشہ مشتعل رہی۔انگریزوں اور فرانسیسیوں کے خلاف قسطنطنیہ میں ترکوں نے جو محاذ جنگ قائم کر رکھا تھا، اس نے وہ بھی دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور یہ سوچنے لگا کہ ہندوستان میں ہم بھی ان کو آخری شکست دے سکتے ہیں۔1857ء کی جنگ کے دوران میں یہ متعدد محاذوں پر لڑا اور انگریزی فوج کو ہزیمت دی۔ لکھنؤ میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے ساتھ بھی رہا۔تحریک کی ناکامی کے بعد نیپال چلا گیا۔1859ء میں وہیں وفات پائی۔

۞ ڈھونڈو پنت نانا ایک دلیر اور باہمت مرہٹہ تھا۔ایک ریاست کا مالک تھا جسے انگریزوں نے ضبط کر لیا تھا اور کان پور کے متصل بٹھور میں رہ رہا تھا۔ریاست کی واپسی کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔1857ء کی جنگ میں شرکت کی اور انگریزوں سے لڑا۔عظیم اللہ خاں اور تانتیا ٹوپے اس کے خاص مشیر و مصاحب تھے۔جنگ کے بہت سے محاذ قائم کیے۔کہیں شکست کھائی اور کہیں فتح یاب ہوا۔آخر میں حضرت محل کے پاس لکھنؤ چلا گیا تھا۔مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی بھی وہیں تھے۔حضرت محل نے اس کا شاہانہ استقبال کیا اور خاص عزت واحترام سے جگہ دی۔ تسخیر لکھنؤ کے بعد نیپال چلا گیا تھا اور فقیرانہ اور درویشانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔

۞ کنور سنگھ صوبہ بہار کے ضلع جگدیش پور کا راجپوت رئیس تھا۔انگریزوں نے اس پر مالیہ کے بعض مقدمات دائر کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا تھا۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں اس کی عمر اسی (80) سال کی تھی۔آزادیٔ وطن کی خاطر اس بوڑھے جنگ جُو نے تلوار ہاتھ میں پکڑی اور تادمِ مرگ اسے سنبھالے

رکھا۔ باتدبیر اور فہیم آدمی تھا۔ انگریز جرنیل اس کی جنگی تدبیروں سے ہر لحظہ خوف زدہ رہتے تھے۔ ایک دفعہ اپنی فوج کے ساتھ دریائے گنگا عبور کر رہا تھا کہ انگریزی فوجیں آ پہنچیں اور گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک گولی اس کی کلائی پر لگی۔ زخم انتہائی شدید تھا، لیکن میدانِ جنگ میں علاج کی کوئی صورت نہ تھی۔ جب گنگا پار کر چکا تو زخمی کلائی پر زور سے تلوار ماری اور اسے کاٹ ڈالا۔ کلائی کو گنگا میں پھینکتے ہوئے گنگا سے مخاطب ہو کر کہا:

''ماتا! اپنے سپوت کی اس آخری قربانی کو شرفِ قبول عطا کر۔''

اسی حالت میں تین روز تک لڑتا رہا اور آرہ کے معرکہ میں فتح یاب ہوا۔ لیکن کلائی کے زخم کی تکلیف نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ تین روز بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

کہنا یہ ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی عوامی تھی، اس میں سکھوں کے سوا سب نے حصہ لیا۔ سکھ نہ صرف خاموش رہے بلکہ ناکامی کے بعد انگریزوں کے ساتھ مل کر انھوں نے مسلمانوں کے قتل وغارت میں انتہائی سرگرمی دکھائی۔ پنجاب کی سکھ ریاستوں کی فوج نے جن میں پٹیالہ، نابھہ، جیند اور فرید کوٹ قابل ذکر ہیں، دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

بعد میں ہندوؤں نے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ تنہا مسلمان میدان میں رہ گئے تھے اور زیادہ تر یہی انگریزوں کا نشانہ ستم بنے۔

جن علمائے اسلام نے اس تحریک میں حصہ لیا، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ''وہابیوں'' سے تعلق رکھتے تھے اور سید احمد شہید بریلوی کی ''تحریکِ جہاد'' سے ان کا رشتہ تھا۔ جنرل بخت خاں بھی انہی سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ مولانا غلام رسول مہر نے

متعدد حوالوں سے لکھا ہے۔

''دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسر اعلیٰ بخت خاں وغوث محمد خاں ومولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اوران کے ساتھ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی آئے تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا، اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کا میر لشکر اور بخت خاں اس کا معاون ہوا۔''

اسی طرح بہادر شاہ کے مقدمے میں حکیم احسن اللہ خاں نے اپنے بیان میں کہا تھا۔

''ٹونک سے وہابی آئے ۔دوسرے مقامات مثلاً جے پور، بھوپال، ہانسی، حصار سے وہابی دہلی پہنچے۔جنرل بخت خاں،محمد غوث رسالدار، مولوی امام خاں رسالدار، مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی بھی وہابی تھے۔بخت خاں کی آمد پر بہت سے وہابی شامل ہوئے۔''

غرض 1857ء کی تحریک جہاد میں علما نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اگر مغل شہزادے دوراندیشی سے کام لیتے اور جنرل محمد بخت خاں کے ساتھ گھٹیا رقابتوں پر نہ اتر آتے ، نیز سید رجب علی اور مرزا الٰہی بخش انگریزوں سے سازباز کر کے بہادر شاہ کو حوالگی پر آمادہ نہ کرتے یا خود بہادر شاہ دانش مندی کا ثبوت دیتا اوران کے بھرے میں نہ آتا اور جنرل بخت خاں کی بات مان کر اس کے ساتھ چلا جاتا تو 1857ء کی تحریک کا وہ حشر نہ ہوتا جو ہوا، اس کا نتیجہ امید ہے، خاطر خواہ نکلتا۔

بہادر شاہ سے جنرل بخت خاں نے بہت کہا کہ دہلی کو انگریزی فوج نے اگر فتح کر لیا ہے تو گھبرانے کی بات نہیں۔یہ شہر لڑنے کے قابل نہیں تھا۔بہتر ہوگا،آپ میرے ساتھ چلیں، ہندوستان کھلا پڑا ہے۔ ہم کہیں جا کر محاذ قائم کر لیں گے اور انگریزوں کے

ساتھ فیصلہ کن لڑائی کا آغاز کردیں گے۔لیکن مرزاالٰہی بخش اور جگراؤں کے سید رجب علی، بہادر شاہ کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے جنرل بخت خاں کو اس پروگرام میں کامیاب نہ ہونے دیا۔خود بہادر شاہ بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کا خون سرد پڑ گیا تھا۔وہ بھول گیا تھا کہ وہ تیموری خاندان کا فرد ہے، اس لیے وہ کوئی بہادرانہ اور جرأت مندانہ اقدام نہ کر سکا اور نہ اس سے اس کی توقع تھی۔ اگر بہادر شاہ خود کو انگریز کے حوالے کرنے کے بجائے میدانِ جنگ میں کود پڑتا تو تاریخِ جہادِ حریتِ ہند بالکل دوسرے انداز سے لکھی جاتی اور برصغیر کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالتی۔

خدمتِ تدریس

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ بہت بڑے واعظ وخطیب اور نیک سرشت و صالح فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ ممتاز مدرس اور معروف معلم بھی تھے۔ تفسیر وحدیث، فقہ واصول، عربی ادبیات، فارسی ادبیات، صرف ونحو، منطق وفلسفہ، معانی وبیان وغیرہ علوم کی جو کتابیں ان کے زمانے میں پڑھائی جاتی تھیں، وہ انھوں نے باقاعدہ اپنے عہد کے فاضل اساتذہ سے پڑھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ذہانت کی نعمت سے بھی خوب نوازا تھا۔ ان کی حدودِ مطالعہ بہت وسیع تھیں۔ ہر موضوع کی کتابیں روانی اور آسانی سے پڑھتے اور پڑھاتے تھے۔ بزرگانِ دین اور اسلافِ کرام کے متعلق بھی ان کا دامن معلومات وسعت پذیر تھا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے گاؤں (قلعہ اسلام) میں ''اشاعۃ التوحید والسنہ'' کے نام سے ایک دینی مدرسہ جاری کیا تھا۔ اس مدرسے میں جو بیرونی طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے، ان کی تعداد بسا اوقات تیس سے لے کر چالیس تک پہنچ جاتی تھی۔ مولانا غلام رسول واحد مدرس تھے جو ان طلبا کو مختلف فنون کی کتابیں پڑھاتے

تھے۔ بیرونی طلبا کے علاوہ مقامی شائقینِ علم بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل تھے۔ پھر اردگرد کے دیہات کے وہ طالب علم بھی ان سے فیض حاصل کرتے تھے جو صبح آتے اور شام کو چلے جاتے تھے۔

مولانا ممدوح کا پڑھانے کا اسلوب ایسا دلکش تھا کہ جو طالب علم ایک دفعہ ان سے کچھ پڑھ لیتا، اس کے لیے ان سے جدا ہونا اور کسی دوسرے استاذ کے پاس جانا مشکل ہو جاتا۔ وہ ہر طالب علم کی ذہنی کیفیت کو سمجھتے اور اسی کے مطابق اسے بات سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ صورتِ حال طالب علم کے لیے باعث کشش ہوتی تھی اور وہ ان سے وابستگی اختیار کر لیتا تھا۔ تحصیل علم کا بنیادی طریقہ یہی ہے کہ استاذ اپنے طالب علم کے فکر و فہم کے دائروں سے آگاہ ہو، اور طالب علم، استاذ کے طریقِ تفہیم سے باخبر ہو۔

بیرونی طلبا کی خوراک کا انتظام مولانا خود کرتے تھے اور ان کا دو وقت کا کھانا ان کے گھر سے آتا تھا۔ اس کے لیے وہ کسی سے چندہ نہیں مانگتے تھے۔ کوئی شخص اگر کچھ دینا چاہتا تو پورا اطمینان کرتے کہ اس کا مال مشتبہ نہ ہو۔ جب انھیں یقین ہو جاتا کہ یہ حلال کی کمائی سے دے رہا ہے تو اس سے غلہ یا نقد روپیہ لے لیتے۔ اگر ذرہ بھی شبہ پڑ جاتا تو لینے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیتے۔ اس سلسلے میں نہایت محتاط اور انتہائی نازک احساسات کے مالک تھے۔

اپنے گاؤں کی مسجد میں تو وہ طلبا کو پڑھاتے ہی تھے، بسا اوقات سفر میں بھی بعض طلبا ان کے ساتھ جاتے اور تعلیم حاصل کرتے۔ طلبا کا ہمیشہ خیال رکھتے اور ان کے اسباق میں حتی الامکان ناغہ نہ ہونے دیتے۔ ان سے جن علما و طلبا نے تحصیل علم کی،
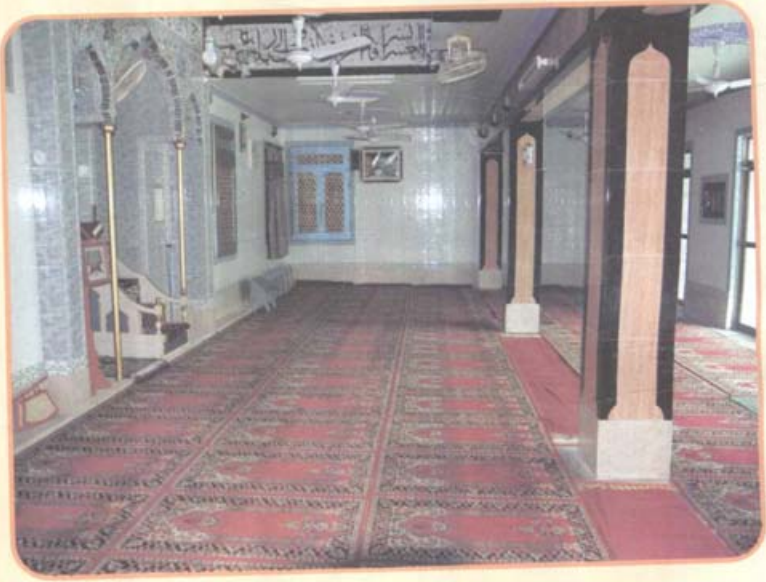
مسجد کا ہال

مدرسہ اشاعت القرآن والسنۃ
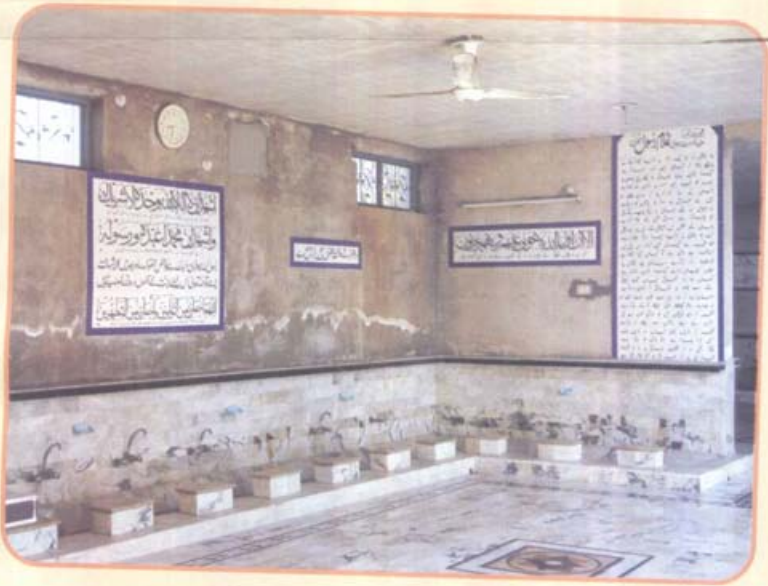
وضو کی جگہ

بیرونی منظر

ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی معلوم ہو سکے ہیں، جو ان کے فرزند نام دار مولانا عبدالقادر نے اپنی کتاب ''سوانح حیات مولانا غلام رسول'' کے صفحہ 72، 73 پر درج کیے ہیں۔

① مولوی علاء الدین صاحب ساکن گوجراں والا

② مولوی محمد عظیم اللہ صاحب موضع بڑبن۔ ضلع میر پور

③ مولوی محمد صاحب موضع بکن ضلع گوجراں والا

④ مولوی محمد عثمان صاحب ساکن فتح گڑھ چوڑیاں، ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب، ہندوستان)

⑤ مولوی قطب الدین صاحب، ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب، ہندوستان)

⑥ مولوی محمد علی صاحب میر واعظ، ساکن بوپڑہ ضلع گوجراں والا

⑦ مولوی محمود شاہ صاحب واعظ ساکن ڈیھنڈہ (ہری پور ہزارہ)

⑧ مولوی بدرالدین صاحب ساکن سیالکوٹ

⑨ مولوی بدرالدین صاحب ساکن گل والا ضلع گوجراں والا

⑩ مولوی احمد علی صاحب ساکن کوٹ بھوانی داس، ضلع گوجراں والا

⑪ مولوی شمس الدین صاحب، ساکن جموں (کشمیر)

⑫ حافظ کرم الدین صاحب، ساکن جموں (کشمیر)

⑬ حافظ ولی اللہ صاحب لاہوری

⑭ مولوی عبدالعزیز صاحب، ناظم انجمن اہل حدیث لاہور و بانی انجمن حمایت اسلام

⑮ حافظ گوہر صاحب، ساکن نوکھر ضلع گوجراں والا۔[1]

⑯ حافظ غلام محمد صاحب ساکن ۔۔ ھاکموہ، ضلع شاہ پور۔

⑰ مولوی برہان الدین صاحب جہلمی

⑱ مولوی محمد نعمان صاحب ساکن جہلم

⑲ مولوی نور احمد صاحب۔ ساکن کھائی ضلع جہلم

⑳ مولوی نور احمد صاحب ساکن چنیوٹ

㉑ مولوی غلام حسین صاحب ساکن ساہو والا چیمہ ضلع سیالکوٹ۔

㉒ مولوی عمر الدین صاحب حال مقیم بقایا بٹالیاں، گوجرہ ضلع لائل پور

یہ بائیس نام لکھنے کے بعد مولانا عبدالقادر تحریر فرماتے ہیں:

''اور بھی بہت سے لوگوں نے تعلیم حاصل کی اور فیض پایا، مگر مجھ کو صرف انہی سے واقفیت ہے۔''[2]

ان بائیس میں سے چھ کا تعلق ضلع گوجراں والا سے ہے، تین کا ضلع جہلم سے، دو کا ضلع سیالکوٹ سے، ایک کا چنیوٹ سے اور ایک کا ضلع فیصل آباد سے ...... ان بزرگوں کے اخلاف میں سے بعض لوگ موجود ہوں گے اور ان کے متعلق تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتے ہوں گے۔ لیکن افسوس ہے جماعت اہل حدیث کے اصحابِ قلم کو زیادہ محنت کرنے کی عادت نہیں ہے۔ وہ ان مشہور علمائے کرام کے بارے میں تو لکھتے رہتے ہیں جن کے حالات آسانی سے حاصل ہوجاتے ہیں۔ کوئی صاحب ان کی تفسیری خدمات کا تذکرہ فرما دیتے ہیں، کوئی دوست ان کے مناظروں کا ذکر کر دیتے

① پورا نام غالباً گوہر دین ہوگا۔ ② سوانح حیات ص 73۔

ہیں، کوئی مرزائیت یا آریہ سماجیوں اور عیسائیوں کے بارے میں ان کی تصانیف کی فہرست کسی اخبار میں شائع کرادیتے ہیں، لیکن جن علمائے کرام کے حالات معلوم کرنے میں محنت کرنا پڑے، انھیں چھوڑ دیتے ہیں۔ مشاہیر کے حالات لکھنا بھی اچھی بات ہے، ان کی مختلف نوعیّتوں کی خدمات کا تذکرہ بھی ہونا چاہیے، لیکن غیر معروف بزرگوں کے واقعاتِ زندگی کی تلاش بھی ہمارے فرائض میں شامل ہے۔

میں کسی بھائی کا کیا شکوہ کروں، خود میرا بھی یہی حال ہے۔ میں بھی آسان کام کرنا چاہتا ہوں، مشکل کام کرنے کی نوبت آجائے تو سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ کروں یا نہ کروں۔

بہر حال ان بائیس حضرات میں سے جن بزرگوں کے کوائفِ حیات کا مجھے تھوڑا بہت علم ہوسکا ہے، اس کا ذکر آئندہ صفحات میں ایک مستقل باب میں کر دیا گیا ہے۔

پیکرِ سخاوت اور مجسمۂ مروّت

مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ بہت سی خصوصیات کے مالک تھے۔ ان کی ایک قابل ذکر خصوصیت ان کی سخاوت اور مروت تھی۔ اس حیثیت سے کہنا چاہیے کہ وہ پیکرِ سخاوت اور مجسمۂ مروت تھے۔ اپنے خاندان کے لیے تو وہ خاص طور سے سراپا شفقت تھے۔ ان کو تعلیم دلانے اور ان کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے۔

ان کے بھتیجے، بھائیوں کے پوتے اور دوسرے قریبی رشتے دار زیادہ تر ان کے پاس ہی رہتے تھے۔ ان کی تعلیم اور ان کی شادی بیاہ وغیرہ کے اخراجات انھی کے ذمے تھے، یہاں تک کہ کسی کی جوتی ٹوٹ جاتی یا کپڑا پھٹ جاتا تو انھی کے پاس آتا اور اپنی ضرورت کا اظہار کرتا، اور اسے سب کچھ آسانی سے مل جاتا۔

مہمان نوازی

مہمان ان کے پاس بہت آتے تھے، کوئی شرعی مسائل پوچھنے آتا، کوئی میل ملاقات کے لیے حاضر خدمت ہوتا، کوئی کسی اور کام کے لیے آتا، راہ چلتے مسافر بھی رات بسر کرنے کے لیے آجاتے۔ ان مہمانوں کے لیے روٹی پانی اور قیام کا انتظام مولانا

ممدوح ہی کرتے۔ مہمانوں کی تعداد روزانہ دس پانچ تو معمولی بات تھی، بسا اوقات یہ تعداد چالیس تک پہنچ جاتی۔ مولانا کی اہلیہ محترمہ باہمت خاتون تھیں، ان کا زیادہ تر وقت چکی پر آٹا پیسنے اور چولھے پر ہانڈی روٹی پکانے میں صرف ہوتا۔ اس نیک بخت خاتون نے اپنی اس انتہائی مشکل مصروفیت کا شوہر مکرم سے ذکر کیا تو انھوں نے ازراہِ کرم دو بیل خریدے اور آٹا پیسنے کے لیے خراس لگوایا۔ تاہم گھر میں بھی چکی چلتی رہتی۔

مہمانوں کو کھانا کھلانے کا کام نو سال کے بڑے بیٹے عبدالقادر کے سپرد تھا۔ کسی غریب مسکین یا مسافر و مستحق کو کچھ نقد پیسے دینے کا معاملہ ہوتا تو یہ بھی انہی کے ہاتھ سے دیا جاتا تھا۔ اس سے مقصد ان کی تربیت کرنا اور انھیں یہ احساس دلانا تھا کہ مستحقین کی مدد انھیں کھانا کھلا کر بھی کی جائے اور ان کی ضرورت اور اپنی استطاعت کے مطابق نقد پیسے دے کر بھی!

بیٹوں کو نمازِ فجر سے پہلے اٹھا دیتے تاکہ انھیں صبح سویرے جاگنے کی عادت پڑے اور وہ ابھی سے نماز با جماعت کی پابندی کرنے لگیں۔ اگر اہلیہ مکرمہ بچوں کو اس وقت جگانے سے روکنے کی کوشش کرتیں تو فرماتے بچوں کو کم عمری میں نیکی کی راہ پر لگانے کی خو ڈالنی چاہیے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ وہ جلد دنیا سے رخصت ہوجائیں گے اور ان بچوں کو یتیمی کا وقت دیکھنا پڑے گا۔ اس قسم کی باتیں وہ اپنی بیوی سے بھی کسی نہ کسی انداز میں کرتے۔ [1]

[1] سوانح حیات ص 152

ایک پوستی کی مدد اور اس کا نتیجہ

ایک دن ایک پوستی مولانا کے پاس آیا اور صاف لفظوں میں کہا کہ میں پوست پیتا ہوں، لیکن آج میرے پاس پوست خریدنے کے لیے کوئی پیسا نہیں ہے، سخت پریشان اور بے تاب ہوں۔ آپ مجھے پوست کے لیے کچھ پیسے دیں۔ مولانا نے ایک روپیہ اسے دیا اور وہ چلا گیا۔ دوسرے دن پھر آیا اور وہی ضرورت بیان کی جو پہلے دن کی تھی، اب بھی اسے ایک روپیہ دے دیا۔ اس طرح وہ مسلسل ایک ہفتہ آتا اور ایک روپیہ لیتا رہا۔ ایک روپیہ اس زمانے میں بہت بڑی بات تھی۔

حاضرینِ مجلس نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ اس پوستی کو کیوں روزانہ ایک روپیہ دیتے ہیں۔ اب حسبِ معمول وہ پھر آیا تو مولانا نے اس کے سامنے پوست اور نشہ آور چیزوں کے کھانے پینے کی اس انداز سے مذمت کی کہ اس نے اسی وقت اس غلط حرکت سے توبہ کرلی۔ اس کے بعد وہ بیمار ہوگیا۔ بعض حکیموں نے اسے پوست پینے کو کہا اور بتایا کہ اس کی بیماری کا یہی علاج ہے، لیکن اس نے حکیموں کی بات نہیں مانی۔ چھ مہینے بیماری کی حالت میں وہ مولانا کے پاس رہا۔ وہ اسے اپنے ہاتھ سے دودھ پلاتے اور حلوہ کھلاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے صحت عطا فرمادی۔[1]

حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کی خدمت

حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ایک مستقل باب میں بھی کیا گیا ہے اور کتاب کے مختلف مقامات میں بھی ان کا ذکر آیا ہے۔ وہ مولانا غلام رسول

---

[1] سوانح حیات ص152

کے مرشد بھی تھے، ہم سبق بھی تھے اور مخلص ترین دوست بھی تھے۔ انھوں نے حضرت سید صاحب کی خدمت میں مختلف اوقات میں بہت سے روپے بھیجے جو سید صاحب موصوف نے یتامیٰ و مساکین پر خرچ کیے۔[1]

اللہ نے ان پاک باز لوگوں کو تقویٰ و طہارت کی بہت بڑی نعمت سے نوازا تھا۔ یہ عابد و زاہد لوگ تھے جو ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ مستحقین کی مدد کرنا، کم زور کے لیے سہارا بننا اور غریبوں اور مسکینوں کی نصرت کے لے کوشاں رہنا ان کا مشغلۂ حیات تھا۔ یہ ان کے وہ اوصاف تھے جن کی وجہ سے لوگ انھیں مستحق اکرام گردانتے، ان کی باتیں دھیان سے سنتے اور ان پر عمل کرتے۔ یہ لوگ کسی پر بوجھ نہیں بنتے تھے بلکہ دوسروں کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جو کچھ ان کے پاس ہوتا، اس سے لوگوں کی مدد فرماتے اور خود تکلیف اٹھا کر ان کو آرام پہنچانے کی سعی کرتے۔ رحمھم اللہ تعالٰی

اب دنیا بدل گئی ہے، حالات منقلب ہوگئے ہیں۔ نہ وہ زمانہ رہا ہے، نہ ان اوصاف کے حامل لوگ کہیں دکھائی دیتے ہیں۔

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سوانح حیات مولانا غلام رسول از ص 150 تا 154۔

عادات واطوار

مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ کی زندگی کے تقریباً تمام اہم اور قابل ذکر پہلو خوانندگانِ محترم کے علم میں آچکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی عادات واطوار ان کی ذات گرامی میں جمع فرمادی تھیں جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔ تقویٰ ان کا شعار، اللہ کا ڈر ان کی عادت اور طہارت ان کا معمول تھا۔ وہ ہمیشہ باوضو رہتے اور فرماتے:

الوضوء سلاح المؤمنن.

"وضو مومنوں کا ہتھیار ہے۔"

ان کے سوانح نگار فرزند مولانا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے:

"صاحبِ وضو پر سحر وغیرہ اثر نہیں کرتا۔ نہ جن بھوت اسے ایذا دے سکتے ہیں۔ وضو سے ہر کام میں برکت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ پاکیزہ رہنا اور پاکیزہ رہنے کا حکم دینا اسلامی منشا ہے۔ صوفی اور سالک کو زیادہ مقبولیت ستھرائی اور پاکیزگی کی وجہ سے ہوتی ہے۔۔۔ فیوض وبرکات اور درجات کا منبع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ خود وضو سے رہنا اور دوسروں کو وضو سے رہنے کی تلقین کرنا سنت ہے،

اور یہ مقبول عمل ہے۔ وضو پاکیزگی کا باعث ہے۔

﴿ان اللہ یحب التوابین و یحب المتطھرین﴾

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ چلتے ہوئے نظر نیچے رکھتے۔ ادھر ادھر، آگے پیچھے اور دائیں بائیں نہ دیکھتے۔ کسی کا شعر ہے۔

شیر سرافگندہ بر اندر راہ   رسم سگانست بہر سو نگاہ

''شیر راستے میں چلتے ہوئے اپنا سر نیچے رکھتا ہے۔ کتوں کی عادت ہر طرف دیکھنا ہے۔''

نظر کی حفاظت کے لیے مولانا غلام رسول اپنے معتقدین کو قرآن کا یہ حکم سناتے:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَ یَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ط ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ ط﴾(سورہ النور: 30)

''اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو فرما دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچے رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے بہت پاکیزہ بات ہے۔''

مولانا ممدوح اپنے عقیدت مندوں کو بہت سی نصیحتیں فرمایا کرتے تھے۔ انھیں خاموش رہنے کی نصیحت بھی فرماتے۔ ان کا ارشاد ہے:

''خاموشی سے سینہ منور ہو جاتا ہے۔ نورِ ایمان ترقی کرتا ہے۔ خدا کے نزدیک درجہ بلند ہوتا ہے۔ آدمیوں میں رعب اور عزت ہوتی ہے۔ صفائی قلب جلدی حاصل ہوتی ہے۔ صوفی اکثر کم کلام ہوتا ہے۔ زیادہ بولنا فیض کا دشمن ہے۔''

دل زِ پُر گفتن بمیرد در بدن   گرچہ گفتارش بود درعدن

یعنی زیادہ باتیں کرنے سے دل بدن کے اندر مردہ ہو جاتا ہے، بے شک بولنے

والے کی آواز بہشت میں ہو۔[1]

مالِ حرام سے نفرت

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کو مالِ حرام سے بے حد نفرت تھی۔ اسے ہاتھ لگانا بھی گوارا نہ فرماتے۔ اس سلسلے میں ان کے سوانح نگار مولانا عبدالقادر ایک واقعہ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک روز میں ان سے شیخ سعدی کی کتاب ''بوستاں'' پڑھ رہا تھا۔ ایک عورت بڑا قیمتی زرق برق لباس پہنے دو آدمیوں کے ساتھ مولانا کی خدمت میں آئی۔ اس نے ایک سو روپیہ نقد، ایک باریک ململ کا تھان اور کچھ مٹھائی پیش کی۔ مولانا نے اس عورت سے پوچھا تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟ اس نے بتایا کہ وہ گوجراں والا کی رہنے والی ایک طوائف ہے۔ مولانا نے فرمایا تیرا یہ حرام مال ہے، میں اسے ہرگز نہیں لے سکتا۔ اس عورت کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ حرام مال کیا ہوتا ہے۔ مولانا کی باتوں سے وہ اس درجہ متاثر ہوئی کہ اس کی دنیا بدل گئی اور اس نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی۔ پھر یہ مال اس نے کسی مقروض کو دے دیا جس سے اس نے اپنا قرض ادا کیا۔

نفسانی خواہش سے بچنے کا ایک واقعہ

مولانا رحمہ اللہ اپنے آپ کو نفسانی اور ذاتی خواہشات سے ہمیشہ بچا کر رکھتے۔ اس سلسلے کے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ سنیے! ضلع سیالکوٹ میں ایک گاؤں ''ستراہ'' ہے۔ وہاں کے لوگ مولانا مرحوم کے بے حد معتقد تھے اور ان کے منتظر رہتے تھے۔

[1] سوانح حیات مولانا غلام رسول ص 155، 156۔

مولانا بھی ان کا خیال رکھتے اور ان کے ہاں تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہاں گئے تو اس سے قریب کے گاؤں ''کالی صوبہ'' کے لوگوں کو بھی ان کی تشریف آوری کا پتا چل گیا اور وہاں کے چند معزز آدمی انھیں اپنے ہاں (کالی صوبہ) لے جانے کے لیے آئے۔ مولانا نے فرمایا کہ وہ کسی اور موقعے پر ان کے گاؤں جائیں گے، اب جانا مشکل ہے۔ ستراہ میں مولانا کا قیام چند روز رہا۔ اس اثنا میں کالی صوبہ کے لوگ روزانہ آتے اور مولانا سے اپنے گاؤں جانے کے لیے اصرار کرتے رہے۔ بالآخر ان کے اصرار پر مولانا ان کے ساتھ کالی صوبہ کو روانہ ہو گئے۔

راستے میں باتیں کرتے ہوئے ان میں سے ایک شخص نے مولانا سے عرض کیا کہ وہاں کے نمبردار اور ذیل دار نے آپ کے لیے گیارہ مانی مونجی (دھان) اور تین سو روپے نقد جمع کیے ہیں جو آپ کی خدمت میں پیش کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی خدمت کی جائے گی۔ تین سو روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی اور گیارہ مانی دھان (یعنی تقریباً اسّی من دھان) بھی بہت بڑی بات تھی۔ لیکن اس شخص سے یہ الفاظ سنتے ہی مولانا نے کالی صوبہ جانے سے انکار کر دیا اور اپنے گاؤں قلعہ اسلام کو لوٹ گئے۔ انھوں نے وہاں جا کر نمبردار اور ذیل دار کو بتایا تو وہ گھوڑیوں پر سوار ہوئے اور مولانا کو ایک گاؤں ''وڈالا سندھواں'' میں آملے۔ انھوں نے بھی وہاں جانے کے لیے بے حد اصرار کیا لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور فرمایا اب میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ پھر کبھی اپنی مرضی سے آؤں گا۔

فرمایا: ''اب میرا جانا محض نفسانی طمع کی خاطر ہے۔''

وہ نہایت اونچے مرتبے کے عالم دین اور بلند کردار واعظ و خطیب تھے۔ جو عمل

کرتے، فقط رضائے الٰہی کے لیے کرتے۔ اپنی نفسانی خواہشات کو اس میں دخیل نہ ہونے دیتے۔ ہر مشتبہ اور مشکوک چیز سے دامن بچا کر رکھتے۔ وعظ و تبلیغ کا کام فی سبیل اللہ اور خوش نودیٔ خدا کے لیے ہوتا۔۔۔ مولانا عبدالقادر فرماتے ہیں:

''جہاں سے وعظ کے بعد کچھ ملنے کا کچھ اشارہ بھی ہوتا، آپ وہاں ہرگز نہ جاتے۔ کئی دفعہ ایسے واقعات پیش آئے۔''[1]

مولانا عبدالقادر لکھتے ہیں:

''ایک سال آپ کو بہت تنگی آئی۔ ایسی حالت میں آپ نے فاقہ کشی کو سوال کرنے پر ترجیح دی اور نہ وعظ پر کسی سے کچھ لیا۔ بہت لوگ موسم فصل میں آپ کو بلاتے اور لالچ بھی دیتے، مگر آپ نے نفس کا کہا نہ مانا۔''[2]

چھوٹے پر شفقت اور بڑے کا احترام

مولانا ممدوح ہمیشہ اپنے سے عمر میں اس بڑے کا احترام کرتے جو احکام شریعت کا حامل ہوتا اور اس کی زندگی کے شب و روز کتاب و سنت کی اطاعت میں گزرتے۔

بچوں اور کم عمر لوگوں پر شفقت فرماتے۔ کوئی بچہ ان کی انگلی پکڑ کر جہاں چاہے لے جاتا، مسکراتے اور اس کی دلجوئی کرتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑتے۔ کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالتے جس سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ وہ شیریں کلام واعظ اور خوش گفتار معلّم تھے۔

مولانا عبدالقادر رقم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دو زمیندار ان کے پاس آئے اور کہا

---

[1] سوانح حیات مولانا غلام رسول ص 156 تا 158۔ [2] ایضاً ص 158۔

کہ ''ہم کو ایک مسئلہ دریافت کرنا ہے، مگر جب تک آپ اللہ کی قسم کھا کر نہ بتا دیں گے ہم یقین نہ کریں گے۔ آپ نے فرمایا: پوچھو۔ انھوں نے کہا کیا آمین اور رفع یدین سنت ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم سنت ہے۔''

مولانا عبدالقادر لکھتے ہیں: ''آپ کسی کو خلافِ شرع کام کرتا دیکھتے تو آپ کو بہت رنج پہنچتا۔ اگر کوئی سنت کا انکار کرتا تو اس سے گفتگو کرتے اور قائل کر لیتے۔ آپ کے حلم نے پنجاب سے بدعت کی بیخ کنی کر کے توحید کا بیج بو دیا۔''

بے شبہ مولانا غلام رسول نہایت خوش اطوار اور انتہائی بلند کردار عالم دین تھے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ

اٹھارھواں باب

قبولیتِ دعا اور ظہورِ کرامات

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ بے شمار خصوصیات کے حامل اور بہت بڑے عالم تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بلاشبہ اللہ کے مقرب، ولی اللہ اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ ان کی زبان میں بے پناہ اثر تھا اور اللہ ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا تھا۔ اس سلسلے میں ان سطور کے راقم نے بہت سی باتیں متعدد ثقہ لوگوں سے سنی ہیں اور ان کے سوانح نگار مولانا عبدالقادر نے بھی (جو ان کے بڑے صاحب زادے تھے) چونسٹھ پینسٹھ واقعات درج کیے ہیں، جو نہایت عجیب و غریب ہیں۔ یہ واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

① موضع ستراہ سندھواں ضلع سیالکوٹ کے ایک شخص کا نام ''عمرا'' تھا جو کمہار برادری سے تعلق رکھتا تھا اور کثیر العیال تھا لیکن اس کی آمدنی بہت کم تھی جس کی وجہ سے وہ زیادہ تر تنگ دستی اور غربت کا شکار رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک مرتبہ وہاں مولانا غلام رسول تشریف لے گئے۔ عمرا ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور تنگیٔ معاش کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: یا حی یا قیوم برحمتک استغیث کثرت سے بلا تعداد

پڑھا کرو، وضو ہو یا نہ ہو اس کی کوئی شرط نہیں، لیکن اس کے معنوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے (یعنی اے اللہ! جو ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے، میں تیری رحمت سے تجھ سے فریاد کرتا ہوں) اگر ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ فضل فرمائے گا۔

اس نے اس پر عمل کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں مال دار ہو گیا اور موضع ستراہ میں خاصی زمین بھی خرید لی۔[1]

② سلیمان ایک بنگالی طالب علم تھا جو تمام عمر مولانا غلام رسول قلعوی کی خدمت میں رہا' ان کی وفات کے بعد بیت اللہ شریف چلا گیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ مولانا کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد ایک شخص شیخ غلام حسین بھیروی کے دو ہزار روپے کے مقروض تھے۔ وہ قرض جلدی ادا نہ کر سکے تو شیخ غلام حسین نے دعویٰ کر کے ڈگری حاصل کر لی، اور حکیم غلام محمد کو عدالت نے جیل بھجوا دیا۔ مولانا غلام رسول اس وقت گاؤں میں موجود نہ تھے۔ اسی روز عصر کے قریب تشریف لائے اور سنت

[1] اس دعا کے بارے میں راقم الحروف بھی اپنا ایک ذاتی واقعہ اور تجربہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ میں ہفت روزہ الاعتصام کا ایڈیٹر تھا۔ جنوری 1958ء میں چند دوستوں کے اشتراک سے میں نے اپنا ایک سہ روزہ اخبار ''منہاج'' جاری کیا۔ اکتوبر 1958ء میں ملک میں ایوب خان نے مارشل لا نافذ کر دیا اور نیوز پرنٹ کنٹرول میں آ گیا۔ ''منہاج'' چوں کہ نیا نیا جاری ہوا تھا اس لیے اسے کنٹرول ریٹ میں اخباری کاغذ نہیں مل سکتا تھا۔ اخباری کاغذ پرانے اخباروں کو ملتا تھا۔ میں نے یہ اخبار تنگ آ کر اپریل 1959ء میں بند کر دیا۔ حساب کیا تو میں تین ہزار روپے کا مقروض تھا۔ ''الاعتصام'' سے مجھے اس زمانے میں دو سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی جو اس وقت کے مطابق مناسب تنخواہ تھی، لیکن اس سے یہ قرض جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی' ادا کرنا نہایت مشکل تھا۔ میں نے مولانا محمد علی لکھوی مرحوم و مغفور سے جو مدینہ منورہ میں مقیم تھے، ایک خط میں دعا کے لیے درخواست کی۔ انھوں نے فوراً جواب دیا اور یہی وظیفہ اسی طرح بتایا جیسا کہ اوپر مذکور ہے ہیں۔ میں نے اس پر عمل کیا اور چند ماہ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ میں قرض سے سبک دوش ہو گیا اور تمام مالی تکلیفیں ختم ہو گئیں۔

نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق پہلے مسجد میں آئے۔ حکیم صاحب کے بارے میں پوچھا کہ کہاں ہیں۔ سلیمان بنگالی نے تمام واقعہ بیان کیا۔ مولانا کو اس سے نہایت ذہنی کوفت ہوئی۔ نماز عصر سے فارغ ہوئے تو سلیمان سے کہا ''پانی کا ایک لوٹا بھر لو اور میرے ساتھ آؤ۔'' گاؤں سے کچھ دور جا کر اپنے گرد ایک حصار کھینچا۔ اسی میں وضو کیا، قبلہ رو ہو کر بیٹھ گئے اور کچھ پڑھنے لگے۔ سلیمان بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مغرب کی طرف سے سفید لباس میں ملبوس ایک شخص آیا اور اس نے مولانا کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ آپ نے فرمایا: ''مجھے دو ہزار کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا: ''ہزار روپیہ دینے والے نے کہا ہے کہ باقی روپے (قرض خواہ) چھوڑ دے گا۔'' مولانا اسی وقت وہاں سے اٹھے اور شیخ غلام حسین کو تلاش کر کے ہزار روپیہ دیا اور فرمایا: ''باقی روپے میں جلد ہی ادا کر دوں گا۔'' شیخ غلام حسین نے ایک ہزار روپیہ وصول کیا اور باقی ہزار چھوڑ دیا۔ مولانا گئے اور حکیم صاحب کو جیل سے رہا کرا کے گھر لے آئے۔

③ علاقہ شاہ پور کے موضع سدرہ میں ایک بزرگ حافظ غلام محمد سکونت پذیر تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے گاؤں سدرہ کے قریب ایک گاؤں ''کوٹلی'' ہے۔ کوٹلی کا ایک زمیندار لاولد تھا۔ وہ اپنی بیوی اور انہی حافظ غلام محمد کے ساتھ مولانا غلام رسول کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ''اللہ سے دعا کریں وہ مجھے اولاد عطا فرمائے''۔ مولانا نے اسی مجلس میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ دعا کے بعد فرمایا۔ ''شاید اللہ تعالیٰ تمھیں لڑکی عطا کرے گا۔'' چنانچہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے لڑکی عطا فرمائی۔

④ مولانا غلام رسول قلعوی کے سوانح نگار مولانا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ قلعہ اسلام میں ایک حافظ قرآن لڑکوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے۔ ان کے چہرے پر چنبل ہو گیا تھا۔ بہت علاج کرایا' لیکن صحت یاب نہ ہوئے۔ ایک دن انھوں نے مولانا سے عرض کیا تو آپ نے دیکھ کر دریافت فرمایا: ''کوئی علاج نہیں کرایا۔؟'' کہا: ''بہت علاج کرائے، سال بھر سے علاج کرا رہا ہوں مگر بجائے فائدے کے مرض بڑھ گیا ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے، اب خدائی علاج چاہتا ہوں۔'' آپ نے اسی وقت دم کیا اور فرمایا: ''متواتر تین دن دم کراؤ''۔ حافظ صاحب نے مولانا کے فرمان کے مطابق تین دن دم کرایا اور بالکل صحت یاب ہو گئے۔

⑤ قلعہ اسلام کے حاجی کرم الٰہی کا بیان ہے کہ ان کی شادی کے موقعے پر ان کی والدہ کا زیور گم ہو گیا۔ جہاں رکھا تھا، بار بار وہاں دیکھا، اور جگہوں میں بھی دیکھا مگر نہ ملا۔ حاجی صاحب ممدوح کی والدہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور زیور کی گم شدگی کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: ''جہاں رکھا تھا وہیں پڑا ہے۔'' چنانچہ جا کر دیکھا تو وہیں پڑا تھا۔

⑥ ضلع سیالکوٹ کے موضع ستراہ سندھواں کے چودھری محمود خاں بیان کرتے ہیں کہ ابتدا میں اس کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ مولانا ایک مرتبہ وہاں تشریف لے گئے تو اس نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنی مالی کمزوری کا ذکر کیا۔ فرمایا ''اللہ الصمد ہر روز بلا تعداد پڑھا کرو اور نماز تہجد بھی با قاعدہ پڑھا کرو۔'' چودھری محمود خاں کا بیان ہے کہ اس نے اس پر عمل کیا اور چند ہی روز میں مال دار ہو گیا۔ یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ اتنی دولت کہاں سے آئی۔ مولانا نے تہجد پڑھنے کا حکم دیا

تھا، نماز تہجد بھی بالالتزام پڑھنے لگا۔ چودھری محمود خاں کا کہنا ہے کہ اگر کسی دن عمداً سو بھی جاؤں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تہجد کے لیے مجھے خود جگا رہے ہیں۔

⑦ قلعہ اسلام کا ایک درزی امام الدین کہتا ہے کہ وہ بالکل کند ذہن اور ان پڑھ تھا۔ اس کا بڑا بھائی عبداللہ ایک دن اسے مولانا کے پاس لے گیا اور اس کا حال بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: ''لوٹے میں تھوڑا سا پانی لاؤ''۔ پانی لایا گیا تو آپ نے اس پر دم کیا اور فرمایا ''لو امام الدین اس کو پی جاؤ۔ تم تھوڑا بہت حساب کتاب سیکھ جاؤ گے''۔ امام الدین کہتا ہے کہ اللہ کے فضل اور مولانا کی دعا سے اس دن سے مجھ میں اتنی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے کہ حساب کتاب بھی کر لیتا ہوں اور معمولی خط و کتابت بھی کر سکتا ہوں۔

⑧ ایک شخص ملا کرم داد ملتان میں دکان کرتا تھا، کہتا ہے کہ میرا والد مولانا کی خدمت میں گیا اور عرض کیا کہ ہم مختلف مقامات میں تجارت کے سلسلے میں جاتے ہیں تو راستے میں چوری وغیرہ ہو جاتی ہے، کوئی وظیفہ بتا دیجیے تا کہ ہمارا مال محفوظ رہے۔ فرمایا: ''تم جہاں رات کو ٹھہرو، اپنے مال کے گرد ایک سو مرتبہ ''یا محیط'' پڑھ لیا کرو۔'' وہ کہتا ہے کہ ہم یہ عمل کرتے رہے اور ہمیشہ سلامتی کے ساتھ مال لے کر گھر پہنچتے رہے۔ ہمارا کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا، جب کہ ہمارے ساتھیوں کا کئی دفعہ نقصان ہوا۔

⑨ موضع کوٹلی سنگھ بھرڑاں (ضلع گوجراں والا) کے ایک زمیندار ''بلندا'' کا بیان ہے کہ اس کا بھائی علی گوہر ایک مدت تک بخار میں مبتلا رہا۔ اطبا نے تشخیص کی کہ اسے دق اور سل کی بیماری ہوگئی ہے۔ طبی علاج سے نا امید ہو کر وہ لوگ اسے

مولانا کے پاس لے گئے اور عرض کیا کہ طبیب اسے مدقوق اور مسلول قرار دیتے ہیں۔ فرمایا ''طبیبوں نے تشخیص میں غلطی کی ہے، اسے معمولی سا بخار ہے۔'' اس کے بعد پانی دم کر کے اسے پلایا اور اسی روز بخار اتر گیا اور مریض اچھا بھلا ہو گیا۔

⑩ بعض ہندو یا سکھ اپنے بچوں کو سودا وغیرہ لینے کے لیے اگر کسی ایسی دکان پر بھیجتے جو مولانا کی مسجد کی طرف ہوتی تو انھیں تاکید کرتے کہ مسجد کے قریب سے ''واہگرو واہگرو'' یا رام رام کرتے جانا اور جلدی سے نکل جانا۔ ایک دن ایک ہندو لڑکی والدین کی ہدایت کے مطابق بھاگتی ہوئی جا رہی تھی اور رام رام کا لفظ اس کی زبان پر تھا۔ مولانا کے پاس سے گزری تو فرمایا ''یا اللہ یا اللہ کہو، یہ کیسا پیارا لفظ ہے''۔ چنانچہ ''یا اللہ یا اللہ'' کے الفاظ اس کی زبان سے جاری ہو گئے اور یہی الفاظ ادا کرتی ہوئی گھر پہنچی۔ والدین بے حد پریشان ہوئے اور اسے بار بار کہا کہ ''رام رام'' کہو، مگر لڑکی مسلسل ''یا اللہ یا اللہ'' کہتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی گھر والوں سے کہتی تھی تم بھی ''یا اللہ یا اللہ'' کہو۔ یہ بڑا پیارا لفظ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے اور سب کی زبان سے ''یا اللہ یا اللہ'' کے الفاظ ادا ہونے لگے۔

⑪ گجرات کا ایک موچی لاہور میں اپنا کوئی کام کاج کرتا تھا۔ اتفاقاً مولانا لاہور تشریف لائے اور وعظ فرمایا۔ وعظ میں آپ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا قصہ بیان کیا۔ اس وقت گجرات کا موچی بھی موجود تھا۔ وہ دورانِ وعظ ہی میں اٹھ کھڑا ہوا اور کہا ''حضرت! اب بھی ایسا ہو سکتا ہے؟'' فرمایا: ''ہاں اب بھی اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر قادر ہے۔'' موچی نے کہا ''تو میرا حال بعینہ حضرت زکریا علیہ السلام کا سا ہے۔ میری بیوی بانجھ ہے اور میں

بوڑھا ہوں۔ آپ میرے لیے دعا فرمائیں، شاید آپ کی دعا کی برکت سے میرے گھر لڑکا پیدا ہو جائے۔'' آپ نے دعا فرمائی اور لوگوں نے آمین آمین کہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کو لڑکا عطا فرمایا۔ اس نے مولانا کو اطلاع دی تو آپ نے اس کا نام ''اللہ دتا'' رکھا۔ وہ لڑکا حافظ قرآن ہوا۔

(۱۲) ایک دن مولانا لاہور میں کہیں وعظ فرما رہے تھے۔ دو گورے عیسائی' کچھ سکھ اور چند ہندو بھی وعظ میں موجود تھے۔ وعظ میں مولانا نے سورۂ مریم کی چند آیات تلاوت کیں اور ہرقل کے دربار میں قریشِ مکہ کی سفارت کا ذکر کیا۔ حضرت جعفر طیار سے ہرقل نے جس انداز سے بات کی اور کلمہ شہادت سنا، وہ بتایا تو ساتھ ہی اس طرح زور دار اور پُرکشش آواز میں کلمہ شہادت پڑھا کہ سننے والوں میں ایک تہلکہ بپا ہو گیا اور ہندو' مسلمان' گورے عیسائی اور سکھ شدت تاثر سے تڑپنے لگے۔ اس وعظ میں جتنے بھی غیر مسلم موجود تھے' سب مسلمان ہو گئے۔

(۱۳) لاہور ہی کا واقعہ ہے کہ آپ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر وضو کرنے کی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سکھ عورت '' واہگر و واہگرو'' کہتی ہوئی وہاں سے گزری۔ آپ نے فرمایا ''وحدہ وحدہ'' کہو۔ اس عورت کی زبان پر'' وحدہ وحدہ'' جاری ہو گیا۔ گھر والوں نے اسے بہت سمجھایا اور مار پیٹ بھی کی' مگر وہ باز نہ آئی اور مسلمان ہو گئی۔

(۱۴) ایک مرتبہ مولانا ممدوح ضلع گجرات میں سفر کر رہے تھے کہ ایک سکھ نے آپ سے پوچھا ''موضع ڈنگہ کا راستہ کون سا ہے۔''؟ فرمایا:'' بھائی مجھے ڈنگوں کا راستہ تو یاد نہیں، البتہ سیدھوں کا یاد ہے۔'' اس نے کہا'' سیدھوں ہی کا بتا دو''۔ فرمایا

سیدھوں کا راستہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔'' ادھر مولانا کی زبان سے یہ کلمہ نکلا اور ادھر سکھ کی زبان پر یہی کلمہ جاری ہو گیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔

⑮ موضع دلاور چیمہ (ضلع گوجراں والا) کے ایک بڑے زمیندار اور دولت مند سکھ کا نوجوان بیٹا مولانا کا وعظ سن کر مسلمان ہو گیا اور اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اس سکھ نے دلاور چیمہ اور علی پور میں اعلان کرا دیا کہ کوئی پنڈت یا گرنتھی قلعہ میہاں سنگھ والے مولوی صاحب سے بحث کر کے ان کو شکست دے دے اور میرے بیٹے کو دوبارہ سکھ مذہب قبول کرنے پر آمادہ کر لے تو میں اس کو ایک ایکڑ زمین اور پانچ سو روپے نقد انعام دوں گا۔ علی پور کے ایک پنڈت نے یہ اعلان سنا تو لالچ میں آ کر مولانا سے بحث کے لیے تیار ہو گیا۔ سکھ زمیندار نے پانچ سو روپے نقد جمع کرا دیے اور زمین کے لیے دستاویز لکھ دی اور پنڈت کو ساتھ لے کر قلعہ اسلام کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور بھی بہت سے لوگ جن میں غیر مسلم بھی تھے اور مسلمان بھی، بحث سننے اور نتیجہ معلوم کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ چل پڑے۔ یہ لوگ قلعہ اسلام پہنچے تو مولانا غلام رسول اپنے بالا خانے میں تشریف فرما تھے اور ایک طالب علم کو شیخ سعدی کی کتاب بوستان کا وہ سبق پڑھا رہے تھے، جس میں رسول اللہ ﷺ کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ پنڈت نے آتے ہی مولانا سے ایک سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: تشریف رکھیے، آپ کی تشریف آوری سے بہت خوشی ہوئی۔ طالب علم کے سبق سے فارغ ہو جاؤں تو آپ سے بات ہو گی، جو جی چاہے سوال کریں، میں ان شاء اللہ نہایت خوشی سے جواب دوں گا۔ یہ الفاظ کہہ کر اس شعر کی طرف متوجہ ہوئے۔

دریں بحر جز مرد راعی نرفت گم آں شد کہ دنبال داعی نرفت

کہتے ہیں یہ شعر پڑھتے ہی مولانا کا اسلوبِ بیان بدل گیا اور مجلس کا انداز کچھ اور ہی رنگ اختیار کر گیا۔ تقریر میں اللہ نے ایسی تاثیر بھر دی کہ سامعین یوں محسوس کر رہے تھے کہ در و دیوار سے کلمہ شہادت کی آوازیں آ رہی ہیں۔ پنڈت اور ان کے ساتھی بے جان تصویر بنے ہوئے مولانا کا منہ تک رہے تھے اور سب کی زبانیں گنگ تھیں۔ ناگہاں پنڈت نے شور مچانا شروع کر دیا: ''مجھے لے چلو' مجھے لے چلو''۔ کچھ لوگوں نے پنڈت کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور بڑی مشکل سے بالا خانے سے نیچے اتارا۔ پنڈت پر مدہوشی طاری تھی۔ جب وہ کچھ ہوش میں آیا تو اس سکھ زمیندار نے جو اسے لے کر گیا تھا اور اس کے ساتھیوں نے اس سے دریافت کیا' تم بڑی شان اور ادعا سے وہاں گئے تھے' لیکن جاتے ہی خاموش ہو گئے اور کوئی بات کہے بغیر لوٹ آئے' اس کی کیا وجہ ہے؟ پنڈت نے جواب دیا میں اسلام کے خلاف اکیس اعتراض سوچ کر گیا تھا جو میرے نزدیک بڑے مضبوط تھے' لیکن مولوی صاحب کے سامنے جاتے ہی تمام باتیں ذہن سے نکل گئیں۔ ان کی تقریر میں کچھ ایسا جادو بھرا ہوا تھا کہ خود میرے دل میں ایک کہرام سا بپا ہو گیا۔ ان کے مذہب کی سچائی میرے دل میں پیوست ہونے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ میرا مذہب صحیح نہیں ہے۔ مولوی صاحب کی طرف سے ایک روشنی میری طرف بڑھ رہی تھی اور میرے مذہب کے آثار مٹنا شروع ہو گئے تھے۔ اگر چند ثانیے مزید ان کے سامنے بیٹھا رہتا تو میں کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاتا۔

اس کے بعد بہت لوگوں نے پنڈت جی کو مولانا کی خدمت میں لے جانے اور ان سے بحث و مناظرہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے اور صاف لفظوں میں کہا کہ میں ہرگز مولوی غلام رسول سے بحث و مناظرہ نہیں کروں گا۔

⑯ یہی عبداللہ نو مسلم، جس کے سکھ والد کے کہنے پر پنڈت مذکور مولانا سے بحث کرنے گئے تھے، بیان کرتے ہیں کہ مولانا کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے ایک مسلمان خاندان میں شادی کر لی تھی۔ قبول اسلام سے پہلے بھی وہ شادی شدہ تھے، ایک دن وہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے پوچھا "کہو میاں عبداللہ مع اہل و عیال کے خوش ہو؟" عرض کیا۔ "حضرت! میری پہلی بیوی بہت سلیقہ شعار اور تابعدار تھی۔ مجھے وہ بہت یاد آتی ہے۔ آپ دعا فرمائیں وہ بھی اسلام قبول کر لے اور میرے پاس آ جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہے، ورنہ دن تو گزر ہی رہے ہیں۔"

فرمایا "میاں عبداللہ! جس ذات اقدس نے تم کو ہدایت دی ہے، وہ اس کو بھی ہدایت دینے پر قادر ہے۔ گھبراؤ نہیں، ان شاء اللہ جلد ہی تمھاری مراد پوری ہو گی۔ اب تم گھر جاؤ۔"

عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ وہ مولانا کے حسب فرمان گھر چلے آئے، ابھی ایک ہی دن گزرا تھا کہ ان کی پہلی بیوی نے ایک شخص کے ہاتھ ان کو خط بھیجا کہ فلاں دن اور فلاں وقت آ کر اسے لے جاؤ۔ وہ گئے اور اسے ساتھ لے کر مولانا کی خدمت میں قلعہ اسلام حاضر ہوئے اور وہ مسلمان ہو گئی۔

⑰ موضع ستراہ سندھواں (ضلع سیال کوٹ) کے چودھری محمود خاں کہتے ہیں کہ ان

کے گاؤں کے برہمن نے ان سے کہا کہ سنا ہے جو غیر مسلم مولوی صاحب کا درشن کرنے آتا ہے وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: ''بات تو ایسی ہی ہے۔'' برہمن نے کہا: ''کسی دن ہم کو بھی ان کے درشن کرانا''۔ چند روز بعد مولانا تشریف لے آئے اور چودھری محمود خاں نے ان سے برہمن کی بات بیان کی۔ فرمایا ''اگر کوئی وقت آیا تو میں کہوں گا' تم اسے بلا لانا۔ جمعے کا دن تھا' مولانا وعظ فرما رہے تھے کہ محمود خاں کو حکم دیا ''برہمن کو بلا لاؤ۔ کوئی اور غیر مسلم آنا چاہے تو وہ بھی آ جائے''۔ حسب ارشاد محمود خاں گئے۔ برہمن سے کہا اور اس کو لانے کی بہت کوشش' کی مگر وہ نہیں آیا۔ دو اور غیر مسلم ان کے ساتھ آ گئے۔ جوں ہی وہ مولانا کے سامنے آئے، حالانکہ انھوں نے وعظ کا کوئی لفظ نہیں سنا تھا' ان کو دور سے دیکھتے ہی کلمہ شہادت پڑھنا شروع کر دیا۔

محمود خاں کہتے ہیں کہ ایندھن کاٹنے کے لیے وہ ایک کلہاڑی برہمنوں سے مانگ کر لائے تھے۔ انھوں نے وہ کلہاڑی واپس کرنے کی بہت کوشش کی' لیکن برہمنوں نے نہیں لی اور کہا کہ اس کلہاڑی سے جو لکڑیاں کاٹ کر کھیت سے لائی گئی ہیں' ان سے مولوی صاحب کے لیے کھانا پکایا گیا ہے۔ ممکن ہے اس کو دیکھ کر اور ہاتھ لگا کر ہی ہم مسلمان ہو جائیں۔

(١٨) گوجراں والا کے دو میاں بیوی اپنی چودہ سالہ لڑکی کو لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ان کی لڑکی کے سر پر کوئی بال نہیں ہے اور یہ بالکل گنجی ہے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ آپ دعا فرمائیں کہ اس کے سر پر بال اگ آئیں۔

مولانا نے لڑکی سے فرمایا: ''بیٹی نماز پڑھا کرو' ان شاء اللہ تم جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی۔'' لڑکی نے نماز پڑھنا شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں سر پر بال اُگ آئے اور گنجا پن ختم ہو گیا۔ دو سال بعد وہ لڑکی اپنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ مولانا کی خدمت میں نذرانہ لے کر حاضر ہوئی' اس کی ماں بھی ساتھ تھی۔ مولانا نے ان سے پوچھا' ''تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟'' لڑکی کی والدہ نے تمام واقعہ بیان کیا۔ آپ نے پوچھا: ''نماز پڑھتی ہو یا نہیں؟'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''پہلے تو نماز پڑھا کرتی تھی مگر اب چند روز سے چھوٹ گئی ہے''۔ یہ سنتے ہی آپ نے نذرانہ واپس کر دیا اور فرمایا: ''تمھارے جیسے لوگوں سے جو خدا سے وعدہ کر کے توڑ دیتے ہیں، مجھے کوئی سروکار نہیں۔'' ہر چند اس نے کہا، لیکن آپ نے نذرانہ قبول نہ کیا اور دونوں ماں بیٹی واپس گوجراں والا چلی گئیں۔ رات کو وہ لڑکی سوئی' صبح اٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرا تو ایک بال بھی نہ تھا۔

⑲ موضع کھبیکی (ضلع گوجراں والا) کے حکیم نبی بخش کا بیان ہے کہ انھیں ایک گاؤں میں ایک ایسے مریض کے علاج کی غرض سے جانا پڑا جو مالیخولیا میں مبتلا تھا اور جسے طبیب لا علاج قرار دے چکے تھے۔ حکیم صاحب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ بیان کیا۔ مولانا نے فرمایا علاج کرو' اللہ شافی مطلق ہے' شفا دے گا۔ حکیم صاحب نے اس کا علاج شروع کیا اور قدرتِ الٰہی سے ایک ہی دن کے علاج سے آدھی بیماری ختم ہو گئی' دوسرے روز مریض بالکل تندرست ہو گیا۔ حکیم صاحب با مذاق آدمی تھے اور مولانا ان کی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔ وہ مولانا کے پاس آئے، مریض کی صحت یابی کی اطلاع دی اور عرض کیا، وہ مریض

تو صحت یاب ہو گیا، اگر کوئی ایسا ہی مریض اور آ گیا تو پھر کیا ہو گا؟ فرمایا ''اللہ تعالیٰ تمھارے علاج سے ہمیشہ ایسے مریضوں کو صحت عطا فرمائے گا۔'' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد سے مالیخولیا کے جتنے بھی مریض ان کے پاس آئے اللہ نے انھیں صحت عطا فرمائی۔

(۲۰) لاہور کے میاں محمد صاحب کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں وہ گھوڑوں کا بیوپار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے گھوڑے خرید کر اپنے ملازموں کو سری نگر گھوڑے فروخت کرنے کے لیے بھیجا۔ تین مہینے گزر گئے' لیکن گھوڑے فروخت نہ ہوئے۔ میاں محمد صاحب نہایت پریشان تھے، کیوں کہ سری نگر میں ملازموں کا خرچ بھی پڑ رہا تھا اور گھوڑوں کا بھی۔ اتفاقاً مولانا غلام رسول لاہور تشریف لائے اور مسجد چینیاں والی میں وعظ کہا۔ سامعین میں میاں محمد بھی موجود تھے۔ وعظ کے بعد وہ مولانا سے ملے اور اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ فرمایا، ان شاء اللہ تیسرے روز تمھارے گھوڑے حاکم کشمیر خرید لے گا اور تمھیں تین ہزار روپے منافع ہو گا۔ میاں محمد کہتے ہیں کہ وہ تاریخ انھوں نے لکھ لی۔ جب ملازم واپس آئے تو معلوم ہوا کہ مولانا کے فرمان کے تین روز بعد گھوڑے فروخت ہوئے اور حساب کیا گیا تو ٹھیک تین ہزار روپے منافع ہوا۔

(۲۱) ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب) کے ایک ہندو مہنت کا نام کاہن داس تھا۔ وہ اپنے چند عقیدت مندوں کے ساتھ ایک مرتبہ ''موضع کالو والی'' آیا جو قلعہ اسلام کے قریب ایک گاؤں ہے۔ مہنت نے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں سے قلعہ اسلام کتنے فاصلے پر ہے؟ بتایا گیا تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ موجودہ حساب کے مطابق

پانچ کلو میٹر کہنا چاہیے۔ مہنت کاہن داس نے کہا، سنا ہے وہاں مولوی غلام رسول رہتے ہیں جو بہت عالم اور صوفی ہیں۔ میرے دل میں اسلام کے بارے میں کچھ سوالات پیدا ہو رہے ہیں، میں ان سے یہ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے بتایا کہ ان کے پاس کئی پنڈت اور غیر مسلم بحث و مباحثہ کے لیے آئے اور مسلمان ہو گئے، آپ وہاں نہ جائیں۔ لیکن مہنت صاحب نہیں مانے اور مولانا کے پاس پہنچ گئے۔ جاتے ہی سوال کیا ''اسلام کیا چیز ہے''؟ فرمایا'' پہلی چیز ہے کلمہ پڑھنا۔'' پھر کلمہ پڑھ کر سنایا۔ کلمہ سنتے ہی مہنت کاہن داس نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد دو سال وہ مولانا کی خدمت میں قلعہ اسلام رہے۔

(۲۱) ضلع شاہ پور کے موضع بھرت لوتھ کا نمبردار جس کا نام ''جوایا'' تھا، کسی پیر کا مرید تھا۔ وہ نمبردار قتل کے ایک مقدمے میں گرفتار ہو گیا۔ گواہ بھی بھگت گئے جنھوں نے اس کے قاتل ہونے کی گواہی دی۔ نمبردار نے جو جیل میں بند تھا، اپنے بیٹے کو مولانا کی خدمت میں بھیجا۔ مولانا نے اسے ایک حرف پڑھنے کے لیے فرمایا اور کہا کہ تم اسے متواتر تین دن پڑھو۔ ان شاء اللہ گرفتار شدہ شخص بری ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ بری ہو گیا۔ اسے جرمانہ بھی نہیں ہوا۔ (مولانا کے سوانح نگار نے اس حرف کا ذکر نہیں کیا، جو مولانا نے پڑھنے کے لیے فرمایا تھا)

(۲۲) موضع سدرہ ضلع شاہ پور کے حافظ غلام محمد ایک دن مولانا غلام رسول کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں دیکھتے ہی رونے لگے۔ مولانا نے رونے کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ گاؤں کا نمبردار انھیں بہت اذیت پہنچاتا اور پریشان کرتا ہے۔ معاملہ یہاں

تک پہنچ گیا ہے کہ اس نے مجھے گاؤں سے بھی نکال دیا ہے۔ نمبردار سے میرے اختلاف کا باعث فقط شرعی معاملات ہیں۔ حافظ غلام محمد کی بات سن کر مولانا خاموش رہے۔

حافظ صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں تین دن مولانا کی خدمت میں رہا۔ وہ اپنی جوتی صبح کے بعد پانچ مرتبہ زور سے زمین پر مارتے تھے۔ تیسرے روز مجھے فرمایا کہ حافظ جاؤ جلدی پہنچو تا کہ اس نمبردار کا جنازہ تم ہی پڑھاؤ۔ اس طرح دشمن سے بھی تمھیں ثواب مل جائے گا۔

حافظ صاحب کہتے ہیں کہ جب میں گاؤں کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ لوگ اس نمبردار کا جنازے لیے جا رہے ہیں۔ مولانا کے فرمان کے مطابق جنازہ میں نے ہی پڑھایا۔

(۲۴) موضع بڈھا گورایہ متصل ستراہ سندھواں (ضلع سیالکوٹ) کے نمبردار کا نام ''بیغم'' تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو خوب صورت جوان اور خوش آواز تھا۔ اسے فالج ہو گیا۔ بہت سے طبیبوں سے علاج کرایا گیا، لیکن افاقہ نہ ہوا اور اطبا نے اسے لا علاج قرار دے دیا۔ اتفاقاً مولانا غلام رسول ایک مرتبہ ستراہ تشریف لے گئے۔ بیغم نمبردار کو پتا چلا تو وہ اپنے مریض بیٹے کو لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا مریض کو دیکھنے کے لیے اس کے قریب ہوئے تو اس نے کہا: ''السلام علیکم''۔ مولانا نے نام پوچھا تو اس نے جو نام بتایا، نمبردار نے کہا: ''یہ میرے بیٹے کا نام نہیں۔'' مولانا سمجھ گئے کہ اسے جن کا عارضہ ہے۔ جن حاضر ہی تھا۔ مولانا نے اس سے پکڑنے کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا: ''حضرت میں اپنے بادشاہ

کا مامور ہوں۔ ایک دن ہمارا گزر ان کے کنوئیں پر سے ہوا۔ ہم وہاں ٹھہر گئے۔ یہ نو جوان ''گادھی'' پر بیلوں کے ذریعے کنوئیں سے پانی نکال رہا تھا۔ سحری کا وقت تھا۔ اس نے نہایت خوش الحانی سے چند اشعار پڑھے۔ اس کی خوب صورت شکل اور دلکش آواز کی وجہ سے ہمارے بادشاہ کی بیٹی اس پر عاشق ہوگئی۔ بادشاہ کو غیرت آئی۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ اسے پکڑ لو اور اس کا بدن سکھا سکھا کر اس کی جان نکالو۔ اس روز سے میں اسے پکڑے ہوئے ہوں۔''

مولانا نے پوچھا: ''تمھارا بادشاہ اس وقت کہاں ہے؟''

جن نے جواب دیا: ''اس وقت وہ کشمیر میں ہے۔''

مولانا نے فوراً اسے حاضر کیا اور فرمایا: ''اسے چھوڑ دو''۔ اس پر مولانا اور بادشاہ کے درمیان چند باتیں ہوئیں۔ بالآخر وہ اسے چھوڑنے پر رضا مند ہو گیا اور اس نے چھوڑ دیا۔

(۲۵) اس باب کے شروع میں سلیمان بنگالی کا ذکر آیا ہے جو مولانا غلام رسول کے شاگرد تھے اور ان کی زندگی تک ان کی خدمت میں رہے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ مولانا کی وفات کے بعد وہ دہلی گئے۔ وہاں ایک شخص جن کی گرفت میں تھا۔ جن نکالنے کے لیے اس کے وارثوں نے بہت سے عاملوں کو بلایا اور عاملوں نے اپنی سی کوشش کی، لیکن جن نہیں نکلا۔ سب لوگ مایوس ہو چکے تھے۔ اس اثنا میں ان لوگوں کو پتا چلا کہ قلعہ والے مولانا غلام رسول کا شاگرد یہاں آیا ہے۔ وہ لوگ انھیں بلا کر لے گئے۔ جن چوں کہ ہر وقت حاضر رہتا تھا، اس لیے سلیمان بنگالی کو اسے حاضر کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مولانا غلام رسول مشہور عالم اور معروف

عامل تھے۔ سلیمان بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے گھر میں جاتے ہی جن سے کہا کہ میرے استاذ مولوی غلام رسول قلعہ اسلام والے تمھیں السلام علیکم کہتے تھے۔

جن نے یہ الفاظ سن کر کہا کہ وہ مجھے کہتے ہوں گے نکل جا، لیکن میرا ارادہ نکلنے کا نہیں تھا۔ اچھا میں چلا جاتا ہوں۔ اب میں نہیں آؤں گا۔

(۲۶) ایک مرتبہ ایک عورت کو جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، اس کے وارث مولانا غلام رسول کے پاس قلعہ اسلام لائے۔ وہ عورت جن کی گرفت میں تھی اور بے ہوش تھی۔ مولانا کے سامنے آئی تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مولانا نے جن سے کہا تو اس عورت کو چھوڑ دے۔ اس نے جواب دیا میں اس پر عاشق ہوں، اسے نہیں چھوڑوں گا۔ مولانا نے اس کو ڈانٹا اور وہ مان گیا اور کہا کہ میں نکل جاتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا کوئی نشانی دے جاؤ۔ (کہتے ہیں جن جاتے ہوئے کوئی نشانی دے جائے تو پھر نہیں آتا۔) اس نے کہا فرمایے کیا نشانی دوں؟ میں آپ کے ہر ارشاد پر عمل کروں گا۔

فرمایا: وہ گھڑا جو سامنے پڑا ہے، یہاں لے آؤ۔۔۔ چنانچہ وہ گھڑا چلتا چلتا سیڑھیوں پر سے ہوتا ہوا مولانا کی چارپائی کے نزدیک آ کر رک گیا۔

لوگ اس گھڑے کو چلتا ہوا دیکھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے۔

(۲۷) قلعہ اسلام کا رہنے والا ایک شخص عبداللہ کشمیری، مولانا غلام رسول کا عقیدت مند تھا۔ اس نے ایک دن مولانا سے عرض کیا: جن کس طرح کے ہوتے ہیں؟

مولانا نے فرمایا: تم جنوں کو دیکھنا چاہتے ہو؟

اس نے جواب دیا: ہاں۔ دیکھنا چاہتا ہوں۔

مولانا چپ رہے۔

دوسرے دن عبداللہ کشمیری لاہور جانے کے لیے تیار ہوا اور ملنے کے لیے مولانا کی خدمت میں گیا۔ وہ اپنے بالا خانے میں تشریف فرما تھے جو مسجد کے قریب ہی تھا۔ فرمایا: عبداللہ! جو خواہش تم نے کل ظاہر کی تھی، آج راستے میں پوری ہوگی۔ (یعنی لاہور جاتے ہوئے راستے میں تمھیں جن دکھائی دیں گے)

عبداللہ نے منت سماجت کرتے ہوئے عرض کیا: حضور! مجھے بن دیکھے ہی خوف آرہا ہے۔ مجھے یقین ہے جن کوئی مخلوق ہے۔ مہربانی فرما کر وہ مخلوق مجھے نہ دکھلائی جائے۔

(۲۸) ایک نہایت عجیب وغریب کرامت ملاحظہ ہو: قلعہ اسلام کا ایک حجام مولانا کی حجامت بنا رہا تھا۔ اس نے کہا: حضرت میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ وہ کئی سال سے کہیں باہر چلا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ جوان بہو ہے۔ دعا فرمائیں کہ وہ آجائے، بیٹے کے لیے کچھ بتادیں تاکہ اس کا پتا چلے۔

مولانا حجام کی بات سن کر خاموش رہے۔ وہ کہتا ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ پڑھ رہے ہیں۔

حجامت بنانے کے بعد حجام نے پھر وہی عرض کی جو پہلے کر چکا تھا۔

مولانا نے فرمایا: تمھارا بیٹا تو تمھارے گھر میں ہے اور چنوں کے آٹے کی پکی ہوئی نمکین روٹی کھا رہا ہے۔ جا کر دیکھو۔

حجام کہتا ہے: میں ان کی یہ بات سن کر سخت حیران ہوا۔ چوں کہ ان کی کرامتوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا، اس لیے جی میں آیا کہ ممکن ہے میرا بیٹا آ گیا ہو۔ جب میں گھر پہنچا تو بیٹا واقعی گھر میں بیٹھا چنے کے آٹے کی نمکین روٹی کھا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں صوبہ سندھ کے شہر سکھر میں تھا اور اپنی رہائش گاہ میں آٹا گوندھ رہا تھا۔ پانی لینے کے لیے باہر نکلا تو معلوم نہیں کیا ہوا۔ مجھے کسی نے اٹھایا اور پل بھر میں یہاں اپنے گاؤں پہنچ گیا۔۔۔ میرا سامان اور استعمال کی تمام چیزیں سکھر میں ہیں۔

(۲۹) ایک شخص بیان کرتا ہے کہ ایک دن میں مولانا کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک آدمی آیا۔ اس نے بتایا کہ ایک بزرگ کی میں نے عجیب کرامت دیکھی۔ وہ کرامت یہ ہے کہ اس نے چھری پکڑی۔ اس پر کچھ پڑھ کر پھونک ماری اور اسے زمین میں گاڑ دیا۔ ایک جانور اڑتا ہوا جارہا تھا کہ وہ اس چھری پر آ گرا۔

مولانا نے فرمایا: یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ انھوں نے ایک چھری منگوائی اور ہمیں ساتھ لے کر جنگل میں چلے گئے۔ پہلے کچھ پڑھ کر چھری پر پھونک ماری اور اسے زمین میں گاڑ دیا۔ پھر چھری کے اس حصے پر جو زمین سے باہر تھا، کپڑے کی دھجیاں لپیٹ دیں اور پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ وہ شخص قسم کھا کر بیان کرتا ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جانوروں کے جھنڈ کے جھنڈ آتے اور اپنا گلا چھری کے ساتھ اس طرح رگڑتے کہ گویا ذبح ہونے کے لیے بے قرار ہیں۔ اس دن ایسے ایسے جانور دیکھنے میں آئے جو نہ کبھی اس سے پہلے دیکھے تھے اور نہ سنے تھے۔ حیرانی ہوتی تھی کہ قسم قسم کے یہ جانور اتنی تعداد میں کہاں سے آئے۔ کچھ دیر

یہ حالت رہی۔ پھر مولانا نے چھری زمین سے نکال لی۔ چھری نکالتے ہی تمام جانور جدھر سے آئے تھے، ادھر ہی چلے گئے۔

③⓪ ایک دن مولانا لاہور میں وعظ فرما رہے تھے، جس میں بے شمار لوگ جمع تھے۔ وعظ میں لاہور کے بعض علمائے کرام بھی آئے جو مولانا سے چند سوالات کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت مولانا سورہ عنکبوت کی پہلی آیت پڑھ رہے تھے۔ **الم . احسب الناس ان یتر کوا ان یقو لو اامنا وھم لا یفتنون.** (کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صرف یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے، چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی)

مولانا نے ایسے خوب صورت اور منطقیانہ و فلسفیانہ انداز سے اس آیت کی تفسیر بیان کی اور اس اسلوب سے اس کے تمام پہلوؤں کی وضاحت فرمائی اور بحث کرنے والے حضرات جو سوالات و اعتراضات سوچ کر آئے تھے، ان میں سے ہر سوال اور ہر اعتراض کا اس نہج سے جواب دیا کہ وہ بالکل مطمئن ہو گئے اور ان کے لیے مجمع عام میں بات کرنے کی ذرہ بھر گنجائش نہ رہی۔ وہ مولانا سے کوئی بات کیے بغیر واپس چلے گئے۔ جن لوگوں کو ان کی آمد کی وجہ کا علم تھا، انھوں نے ان سے ان کی خاموشی کے متعلق پوچھا تو جواب دیا کہ ہمارے اعتراضات کا ایک ایک کر کے وعظ میں جواب دے دیا گیا ہے اور ان کے سامنے ہمارے لیے بات کرنا مشکل ہے۔ یہ شخص صرف عالم ہی نہیں، ولی اللہ بھی ہے۔

③① ایک شخص نے مولانا سے کہا کہ بعض علمائے دین آپ کے وعظ میں صرف بحث کے لیے آتے ہیں۔ بعض لوگ کچھ مسائل سمجھنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ بعض

غیر مسلم اسلام کے بعض پہلوؤں پر اعتراض کرنے کی غرض سے وعظ میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن وعظ سننے کے بعد سب لوگ خاموشی سے چلے جاتے ہیں۔ نہ کوئی بحث کرتا ہے، نہ کوئی مسئلہ پوچھتا ہے، نہ کوئی اعتراض کرتا ہے۔ عالم بھی خاموش، سائل بھی خاموش اور غیر مسلم بھی خاموش، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

فرمایا: جب میں وعظ کے لیے کھڑا ہوتا ہوں تو اللہ کے فضل وکرم سے تمام اعتراضات اور سوالات کرنے والوں کے اعتراضات وسوالات کی فہرست ان کے ناموں سمیت مجھے پیش کردی جاتی ہے، اگر چاہوں تو ہر ایک کا نام لے کر اور اس کا اعتراض بتا کر اس کا جواب دوں، لیکن میں اپنی شہرت کے ڈر کی وجہ سے اس کا ذکر نہیں کرتا، تاہم ان کے اعتراضات کے جواب وعظ میں تفصیل سے دیتا ہوں، جس سے سب کی تسلی ہوجاتی ہے اور کسی کے لیے اعتراض یا سوال کی گنجائش نہیں رہتی۔

موضع دلاور چیمہ کے سکھ زمیندار کا بیٹا بھی (جس کا واقعہ پہلے بیان کیا گیا ہے) اسلام پر اعتراض کرنے کے لیے مولانا کے پاس آیا تھا، لیکن ان کا وعظ سنا تو اس کے تمام اعتراضات کا جواب اس میں آگیا تھا، لہٰذا مسلمان ہوگیا۔

ان واقعات کا شمار ان کی کرامات میں ہوگا۔

(۳۲) گیارھویں صدی ہجری کے ایک مشہور عالم ومصنف محمد بن ابراہیم شیرازی تھے۔ ان کا لقب صدرالدین تھا لیکن علمی حلقوں میں انھوں نے ''ملا صدرا'' کے نام سے شہرت پائی۔ وہ بہت بڑے فلسفی تھے۔ ان کی ایک کتاب شرح ہدایت الحکمت ہے۔ جو درس نظامی کے حلقوں میں ''صدرا'' کے نام سے معروف ہے۔ یہ کتاب

کسی زمانے میں درسِ نظامی کے علما وطلبا میں متداول تھی۔ اب بھی کہیں کہیں پڑھائی جاتی ہے۔ ہمارے ممدوح مولانا غلام رسول نے یہ کتاب پڑھی تھی اور وہ اسے طلبا کو پڑھاتے بھی تھے۔ ان کے عہد کے ایک عالم دین مولوی غلام محمد تھے۔ ان کا سلسلۂ درس قائم تھا اور ان کے طلبا میں ایک طالب علم ''صدرا'' پڑھتا تھا جو بڑا ذکی اور ذہین طالب علم تھا۔ مولوی غلام محمد نے اس طالب علم کو صدرا کا ایک مقام سمجھنے کے لیے جو فلکیات سے متعلق تھا، مولانا غلام رسول کے پاس بھیجا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مولانا یہ مقام نہ خود سمجھ سکتے ہوں گے اور نہ طالب علم کو سمجھا سکیں گے۔ اس طرح وہ مولانا کا امتحان لینا چاہتے تھے۔

وہ طالب علم جس وقت مولانا کے پاس آیا، اس وقت مولانا ایک طالب علم کو قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا رہے تھے اور سورہ یٰسین کی اس آیت کا مطلب سمجھا رہے تھے: والقمر قدرناه منازل حتی عاد کا لعرجون القدیم. (یعنی چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ آخیر منزل میں پرانی ٹہنی کی طرح باریک رہ جاتا ہے) نووارد طالب علم السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا۔ جو سوال وہ اپنے استاد مولوی غلام محمد سے سمجھ کر آیا تھا، مولانا غلام رسول نے دوران درس وہی سوال اپنے شاگرد سے کیا اور پھر اس کا جواب دینا شروع کیا۔ جواب دے کر کتاب ''صدرا'' کے مصنف کے نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائی اور اس پر جو حاشیہ لکھا گیا ہے، اس کی تشریح کی۔ مولانا غلام رسول کی تمام تقریر فلکیات سے متعلق تھی اور یہی بات وہ طالب علم بہ صورت امتحان سمجھنے کے لیے آیا تھا، لیکن اب اس کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔

اس کے بعد مولانا نے اس طالب علم سے فرمایا کہ صدرا کے اس مقام پر میرے دو سوال ہیں جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیے۔ یہ سوال سمجھ لو اور پھر اپنے استاد صاحب سے ان کے جواب پوچھ کر مجھے بتانا۔۔۔ اس کے بعد طالب علم چلا گیا اور سارا واقعہ اپنے استاذ سے بیان کیا۔ اس پر چند روز گزرے تھے کہ مولوی غلام محمد صاحب، مولانا غلام رسول کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہو گئے۔

(۳۳) موضع بھڑت (ضلع شاہ پور) کا ایک شخص مسمی ''جوایا'' اپنے علاقے کا مشہور چور تھا اور زمین جائیداد کا بھی مالک تھا۔ ایک مرتبہ مولانا غلام رسول اس نواح کے ایک گاؤں موضع ''سدرہ'' تشریف لے گئے تو جوایا ان سے ملنے کے لیے آیا اور پچیس روپے (جو اس زمانے میں اچھی خاصی رقم تھی) بہ طور نذر پیش کیے۔ مولانا نے مسکراتے ہوئے روپے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جوایا نے انکار کی وجہ پوچھی تو فرمایا: یہ چوری کا مال ہے۔

جوایا نے کہا: حضرت! یہ روپے چوری کے مال میں سے نہیں ہیں۔ آپ کو کسی نے شبہے میں ڈال دیا ہے۔

مولانا نے فرمایا: تم نے فلاں شخص کی افیم چوری کی اور شاہ پور جا کر ایک سو روپے میں فروخت کی۔ یہ پچیس روپے اس میں سے ہیں۔ باقی پچھتر روپے تم نے فلاں جگہ رکھے ہیں۔

جوایا نے یہ بات سنی (جو بالکل صحیح تھی) تو اسی وقت چوری سے توبہ کر لی۔ نماز روزے کا پابند ہو گیا اور بالالتزام تہجد پڑھنے لگا۔

۳۴ ایک مرتبہ صدر الدین اور سرفراز (ساکن سدرہ کمبو) ایک بزرگ حافظ غلام محمد کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ان کی زمین کا بہت سا حصہ دریا کی زد میں آ گیا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو خطرہ ہے کہ ساری زمین دریا برد ہو جائے گی۔ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مصیبت سے نجات دے۔

یہ تینوں آدمی دو دن مولانا کے پاس ان کے گاؤں قلعہ اسلام رہے۔ تیسرے دن جانے لگے تو مولانا نے فرمایا کہ دریا کے کنارے پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہنا: ''یا ملائکۃ اللہ السلام علیکم من غلام رسول قلعہ والا''۔ نیز فرمایا کہ سورہ یٰسین تین روز پڑھنا۔

ان تینوں حضرات کا بیان ہے کہ جب ہم نے مولانا کے حسب فرمان دریا کے کنارے کھڑے ہو کر ان کا سلام پہنچایا تو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دریا پیچھے کو ہٹنا شروع ہو گیا۔ ہم یہ سلسلہ نہایت حیرانی کے عالم میں دیکھتے رہے۔ دریا کے یک دم پیچھے کو ہٹ جانے کے عمل کا آغاز ہمارے لیے بے حد تعجب خیز معاملہ تھا۔ پھر جب سورہ یٰسین پڑھی تو دریا پیچھے ہٹ کر بالکل اپنی اصل جگہ پر آ گیا۔

۳۵ مولانا مرحوم کے سوانح نگار بیٹے (مولانا عبدالقادر) فرماتے ہیں کہ مولانا کی وفات کے بعد حافظ غلام محمد مذکور ایک مرتبہ تشریف لائے۔ انھوں نے مذکورہ بالا واقعہ بیان کر کے کہا کہ مولانا تو وفات پا چکے ہیں، میں آپ کو ان کے جانشین سمجھ کر بیان کرتا ہوں کہ ہمارے گاؤں کے قریب کے ایک گاؤں کی زمین اسی طرح دریا کی زد میں آنا شروع ہو گئی تھی، جس طرح ہمارے گاؤں کی زمین آئی تھی۔ میں نے گاؤں کے لوگوں کو وہی طریقہ بتایا جو مولانا نے ہمیں بتایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا

کہ اللہ کی مہربانی سے دریا پیچھے ہٹ گیا۔ اب معاملہ یہ ہے کہ پہلے کی طرح دریا نے ہماری زمینوں کی طرف رخ کرلیا ہے۔

مولانا عبدالقادر فرماتے ہیں کہ حافظ غلام محمد کی بات سن کر میں نے مولانا مرحوم کے الفاظ بیان کر کے وہی پڑھنے کا مشورہ دیا جو مولانا نے اپنی زبان مبارک سے ادا فرمائے تھے۔ چنانچہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ نے پھر وہی کچھ کردیا جو پہلے ہوا تھا، یعنی دریا پیچھے ہٹ گیا۔

(۳۶) ایک بزرگ کا نام مولوی قطب الدین تھا۔ وہ مولانا غلام رسول کے شاگرد اور مرید تھے۔ انھوں نے ایک دن مولانا سے پوچھا کہ کرامتیں تو اللہ کے بہت سے صالح اور متقی بندوں سے صادر ہوتی رہی ہیں، لیکن آپ سے تو بے شمار کرامتوں کا صدور ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

فرمایا: جب سے مجھے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے، اس وقت سے کرامتوں کا صدور بڑھ گیا ہے۔

اب مولوی قطب الدین نے ان سے خواب کی کیفیت پوچھنا چاہی، لیکن وہ انھیں ٹالتے رہے، جب ان کا اصرار بہت بڑھ گیا تو فرمایا کہ ایک مبارک رات کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ (مولوی قطب الدین کا خیال ہے کہ وہ شاید لیلۃ القدر ہوگی) مولانا فرماتے ہیں کہ ”نہ تو میں اسے خواب سے تعبیر کرسکتا ہوں، نہ بیداری سے۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صابن عنایت فرمایا اور ارشاد ہوا کہ اس سے اپنے کپڑے دھولو۔ میں نے حسب الحکم کپڑے دھولیے اور پھر حاضر خدمت ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے منبر پر کھڑا کر کے

میرے ایک ہاتھ میں قرآن شریف عنایت فرمایا اور دوسرے ہاتھ میں صحیح بخاری اور فرمایا تم اسے لوگوں کو سناؤ، تم میرے وارث ہو۔"

مولانا یہ خواب سنا کر مولوی قطب الدین سے فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ایسی رات عمر بھر نصیب نہیں ہوئی۔ جو فیوض و برکات اس رات حاصل ہوئے، پھر وہ کسی کی صحبت اور کسی کے ذکر سے حاصل نہیں ہوئے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔

آنچہ اندر خواب دیدیم ہیچ بیداری نہ دید
آنچہ در دیوانگی دیدیم ہوشیاری نہ دید

"جو کچھ ہم نے خواب میں دیکھا وہ کبھی بیداری میں نہ دیکھا اور جو دیوانگی میں دیکھا، وہ ہوشیاری میں نظر نہ آیا۔"

(۳۷) مولوی قطب الدین نہایت صالح بزرگ تھے۔ وہ خود اپنے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ مولانا غلام رسول صاحب سے مروجہ علوم کی تحصیل کر چکے تو ان سے (دوبارہ) قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا۔ ابھی ایک سیپارہ پڑھا تھا کہ ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ مولانا کے ہاتھ پر انھوں نے بیعت نہیں کی تھی اور نہ کبھی ان سے وظائف یا ذکر اذکار کے متعلق پوچھا تھا، لیکن حالت بیعت کرنے والوں اور وظائف پوچھنے والوں سے بھی دگرگوں ہوگئی تھی۔ وہ اس پر بہت خوش تھے اور ان پر ایسی روحانی کیفیت طاری تھی جو بیان نہیں کی جاسکتی۔ اللہ کے خوف سے آنسو آنکھوں سے جاری رہتے تھے۔ مولانا قرآن مجید کا ترجمہ اس انداز سے پڑھاتے کہ ایسا محسوس ہوتا جیسے قرآن نازل ہو رہا ہے اور یوں خیال گزرتا کہ وہ پڑھنے والے ہیں اور پڑھانے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

جب مولانا کوئی بات کرتے یا مسئلہ بیان فرماتے تو اللہ کے ڈر سے مولوی قطب الدین کانپ اٹھتے اور ایسے لگتا کہ اب تک کے تمام گناہ ان کے سامنے آ گئے ہیں۔ وہ اللہ کے دربار میں کھڑے ہیں اور حساب کتاب ہو رہا ہے۔ اکثر حالت یہ رہتی کہ انھیں دنیا اور اس کے معاملات کا کچھ پتا نہ ہوتا۔ نیند آتی تو فوراً آنکھ کھل جاتی اور اٹھ کر بیٹھ جاتے۔

مولوی قطب الدین کہتے ہیں کہ قلعہ اسلام سے بجانب مغرب ایک میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام ''کھبیکی'' ہے۔ وہاں کے لوگوں نے مولانا سے درخواست کی کہ کوئی طالب علم جو تھوڑا بہت وعظ نصیحت کر سکے مغرب کے وقت ان کے گاؤں آجایا کرے۔ مغرب، عشا اور فجر کی نمازیں انھیں پڑھائے اور صبح کو قلعہ اسلام جا کر اپنے اسباق پڑھے۔ مولانا نے انھی (قطب الدین) کو یہ خدمت انجام دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ روزانہ مغرب سے پہلے کھبیکی پہنچ جاتے، رات وہاں رہتے اور صبح کو قلعہ اسلام آکر مولانا سے قرآن مجید کا ترجمہ اور دوسری کتابیں پڑھتے۔

ایک دن وہ حسب معمول نماز عصر کے بعد کھبیکی کو روانہ ہوئے تو مولانا نے فرمایا کہ آج تمھیں راستے میں ایک بے دین صوفی ملے گا۔ وہ شیطان ہے۔ اس کے پھندے میں نہ آجانا۔ اس سے بچ کر آگے نکل جانا۔

مولوی قطب الدین جب آدھا فاصلہ طے کر چکے تو ایک شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ ان کے ذہن میں مولانا کا فرمان آیا اور اس شخص سے بچ کر آگے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے مولوی قطب الدین کا نام لے کر انھیں آواز دی اور

انھیں روک لیا۔

اب آگے سنیے!

وہ ان کے قریب آیا اور آتے ہی انھیں سینے سے لگالیا۔ سینے سے لگتے ہی تمام فیض اور تمام ذوقِ عبادت ختم ہوگیا۔ البتہ دل کا لطیفہ اور احساسِ عبادت برقرار رہا۔ یعنی یہ کیفیت باقی رہی کہ اللہ کی عبادت کرنی اور اس سے ڈرنا چاہیے۔ یہ احساس بھی بہت معمولی تھا۔

اب وہ کھبکی پہنچے تو نماز پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، لیکن کسی نہ کسی طرح نماز پڑھ لی۔ عشا کا وقت ہوا تو اس وقت بھی یہی صورت حال تھی۔ نہایت مشکل سے یہ فریضہ ادا کیا۔ رات کو ذہن اس قسم کے خیالات کی آماج گاہ بنا رہا کہ نماز روزے کی کیا ضرورت ہے اور اللہ کا ڈر بالکل غیر ضروری ہے۔ بہر حال اسی کش مکش میں رات گزر گئی اور بادل نخواستہ فجر کی نماز پڑھائی۔ واپس مولانا کی خدمت میں بھی آنے پر طبیعت آمادہ نہ تھی، لیکن کسی نہ کسی طرح آ گئے۔ یہ خیال البتہ ذہن میں رہا کہ میں عالم دین ہوں، مجھے نماز پڑھنی اور اللہ کی تھوڑی بہت عبادت کرنی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں کروں گا تو لوگوں پر برا اثر پڑے گا۔ یہی خیال انھیں دوسرے دن صبح کے وقت مولانا کی خدمت میں قلعہ اسلام حاضر ہونے کا باعث بنا۔

مولانا سے ملے تو فرمایا وہ شیطان راستے میں تمھیں ملا؟ ان پر جو کچھ بیتی تھی، وہ سنانا شروع کی تو مولانا نے مسکراتے ہوئے ساری بات سنی۔ اس سے آگے مولوی قطب الدین کہتے ہیں کہ میری بات سن کر۔ ”خلاف عادت مجھ سے معانقہ کیا۔

آپ کا معانقہ کرنا اور میرے دل کے وسوسوں کا دور ہونا، سبحان اللہ۔ وہی حلاوت، وہی لذت، وہی ذکر اور وہی برکات پھر عود کر آئیں۔"

مولوی قطب الدین سے گفتگو کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ صوفیہ کے چار سلسلے مشہور ہیں، وہ ہیں نقشبندی، سہروردی، قادری اور چشتی۔ ان کے نام علیحدہ علیحدہ ہیں۔ جن حضرات کی طرف یہ سلسلے منسوب ہیں، وہ متبع قرآن وحدیث تھے۔ بہت بڑے متقی اور ہر وقت اللہ کا ذکر کرنے والے، لیکن ان کے جاہل عقیدت مندوں نے ان کی تعلیمات کو بگاڑ دیا اور ان کے طریق عمل وعبادت میں ایسی چیزیں ڈال دیں، جن سے ان بزرگانِ دین کا کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ وہ ان کی شدید مخالفت کرتے تھے۔ وہ تمام عمر اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام پر عمل پیرا رہے اور لوگوں کے لیے اسی کی تلقین کو اپنا شیوہ بنائے رکھا۔ وہ اللہ کے پاک باز اور عبادت گزار بندے تھے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ وہ لوگ تھے۔

﴿ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا﴾ (حٰم سجدہ: 13)

"جنھوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے، پھر اس پر ہمیشہ قائم رہے۔"

اس کے بعد مولانا نے مولوی قطب الدین کو اپنے حلقۂ بیعت میں داخل کر لیا اور فرمایا کہ آج تم نماز عصر کے بعد کھبیکی جاؤ گے تو وہ شیطان تمھیں راستے میں پھر ملے گا، لیکن ان شاء اللہ تم پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، وہ جا رہے تھے کہ وہ اسی جگہ کھڑا تھا، جہاں گزشتہ روز کھڑا تھا۔ اس نے ان کو بلایا اور یہ اس کی آواز سن کر رک گئے۔ وہ ان کے پاس گیا اور کہا کہ تمھارا مرشد بہت زور دار ہے۔ تم جاؤ۔ چنانچہ یہ کھبیکی کو روانہ ہو گئے۔

صبح کو جب واپس مولانا کے پاس قلعہ اسلام آئے تو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے مسکرا کر فرمایا، اب اس کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

مولوی قطب الدین نے مولانا سے عرض کیا کہ اگر وہ شیطان ہے تو (احکام الٰہی کے مقابلے میں) اس کا اتنی جلدی کیوں اثر ہوتا ہے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ان عبادی لیس لك علیهم سلطان﴾ (بنی اسرائیل :65)

''کہ میرے بندوں پر تم غلبہ نہیں پاسکو گے۔''

فرمایا: تمھاری بات ٹھیک ہے، لیکن جب انسان اللہ کے بندوں میں داخل ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ شیطان کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ شیطان اس سے ڈر کے بھاگتا ہے، جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھاگتا تھا۔[1]

(۳۸) قلعہ اسلام کے رہنے والے ایک شخص کا نام بڈھا کشمیری تھا۔ وہ پہلوان تھا اور اس کا کاروبار کھڈیوں پر کپڑا بُننا تھا۔ بدمعاشی اور بدتمیزی میں وہ خاص شہرت رکھتا تھا۔ مولانا غلام رسول کے گھر اور مسجد کے درمیان اس کا مکان تھا اور وہیں اس کی کھڈیاں تھیں۔ ایک دن مولانا مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ خلافِ معمول بڈھا کشمیری کی کھڈیوں کے پاس رک گئے اور بڈھا سے پوچھا کہ کبھی تم روئے بھی ہو یا نہیں؟

اس نے جواب دیا: ایک مرتبہ کشتی لڑتے ہوئے میرا بازو ٹوٹ گیا تھا اور شدید درد کی وجہ سے میں بے اختیار رو پڑا تھا۔

مولانا نے فرمایا: میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کبھی اللہ

---

[1] سوانح حیات مولانا غلام رسول ص 116 تا 121۔

کے خوف سے تم روئے ہو یا نہیں؟

اس نے جواب دیا: میں جانتا ہی نہیں کہ اللہ کیا ہے اور اس سے خوف کا کیا مطلب ہے؟

فرمایا: دیکھو اگر دیوار پر کیچڑ مارا جائے تو بے شک وہ گر جائے لیکن اس کا نشان دیوار پر باقی رہتا ہے۔

مولانا کی یہ بات سنتے ہی وہ اللہ اکبر کہتا ہوا کھڈی سے باہر نکلا اور بے ہوش ہوگیا۔ دو روز بے ہوش رہا۔ جب ہوش آیا تو قبرستان کی طرف بھاگ گیا۔ اس کے والدین یا کوئی اور اس کے پاس جاتا تو وہ زور زور سے پکارتا کہ خنزیر آگئے، خنزیر آگئے۔ یہ کہتا ہوا پھر بھاگ جاتا۔

اس کے والدین نہایت پریشانی کی حالت میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے، جس کی کمائی سے ہماری گزراوقات ہوتی ہے اور اس کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کی دین داری کا سلسلہ بھی جاری رہے اور وہ اپنا کام بھی کرے۔

مولانا نے فرمایا: جاؤ اسے میرے پاس لاؤ۔

انھوں نے کہا: ہمارے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ ہماری بات نہیں سنتا۔ ہمیں دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔

مولانا نے فرمایا: اس سے میرا نام لو کہ وہ تمھیں بلاتے ہیں۔ چنانچہ وہ گئے، مولانا کا نام لیا اور وہ ان کا نام سنتے ہی ان کے ساتھ چل پڑا اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ مولانا نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا جاؤ۔ والد اور والدہ کی

خدمت کرو۔ اسی میں دین اور دنیا کی سعادت ہے اور یہی کامیابی کا ذریعہ ہے۔
بڈھا کشمیری اسی وقت اٹھا اور کھڈیوں پر کپڑا بنانے کا کام کرنے لگا۔ اب اللہ کا
خوف ہر وقت اس پر طاری رہتا تھا اور اس کے ڈر سے اس کی آنکھوں سے آنسو
جاری ہو جاتے تھے۔ پھر اس کی پوری زندگی اسی طرح گزری۔ اسے مولانا غلام
رسول کی کرامت سمجھئے یا ان کی زبان کا اثر قرار دیجیے۔

(۳۹) قلعہ اسلام کا ایک شخص بوٹا بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ مولانا نے موضع فیروز والا
سے بہ طور ایندھن جلانے کے لیے ایک بیری کا درخت لیا۔ وہ بیری ایک خانقاہ پر
تھی اور بہت بڑی تھی۔ وہاں پوجا پاٹ کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی لیے وہ اسے لینا
چاہتے تھے تاکہ یہ سلسلہ ختم ہو۔ مولانا نے زمین کے مالک سے بات کی تو اس
نے کہا یہ بیری خانقاہ کے فقیر کی ہے، ہم تو اسے نہ کٹوا سکتے ہیں، نہ استعمال کر سکتے
ہیں۔ آپ میں ہمت ہے تو کٹوا لیجیے اور لے جائیے۔ مولانا نے بیری کٹوائی اور
بوٹا سدو کو پیغام بھجوایا کہ گڈا لے کر فیروز والا پہنچو۔ وہ حسب حکم فیروز والا پہنچ گیا۔
بیری اتنی بڑی تھی کہ اس کا تیسرا حصہ گڈے پر لادا گیا اور وہ قلعہ میہاں سنگھ کو روانہ
ہو گئے۔ یہ صرف دو آدمی تھے، خود مولانا اور گڈے والا بوٹا۔

گوجراں والا سے آگے نکل کر قلعہ میہاں سنگھ کے راستے پر آئے تو گڈا الٹ
گیا اور تمام لکڑیاں زمین پر گر گئیں۔ نہایت پریشانی ہوئی کہ اب کیا کیا جائے، نہ
قریب کوئی گاؤں ہے، نہ آدمی ہیں۔ راستے میں کھڑے ہیں۔

مولانا نے بوٹا سے کہا آؤ، گڈا سیدھا کرنے کے لیے تم بھی زور لگاؤ، میں بھی لگاتا
ہوں۔ لیکن بوٹا خاموش کھڑا رہا۔ مولانا نے پھر کہا کہ آؤ، گڈا سیدھا کریں۔

اس نے کہا حضرت فیروز والا سے تو تقریباً سو آدمیوں نے لکڑیاں لدوائیں اور ہمیں روانہ کیا۔ اب ہم دو آدمی کس طرح لادلیں گے۔؟

فرمایا اللہ قادر ہے، کیا عجب کہ وہ سو آدمیوں کا کام ہم دو آدمیوں سے لے لے۔ آؤ بسم اللہ کر کے گڈے کو ہاتھ لگاؤ۔ بوٹا کہتا ہے: ''میں نے گڈے کو فقط ہاتھ ہی لگایا، وہ بھی حیرانی کے عالم میں۔ مولانا کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ انھوں نے زور لگایا یا نہیں لگایا۔ لیکن گڈا سیدھا ہو گیا اور لکڑیاں صحیح طور سے اس پر لد گئیں اور ہم گاؤں کو روانہ ہو گئے۔''

مولانا نے فرمایا: ''گاؤں جا کر کسی سے یہ واقعہ بیان نہ کرنا''۔ وہ کہتا ہے:

''ان کی زندگی میں کسی سے یہ واقعہ میں نے بیان نہیں کیا۔ ان کی وفات کے بعد اس کا ذکر کیا ہے۔''

(۴۰) فیروز والا کے ایک شخص بوٹا بڑ بیان کرتے ہیں کہ جب مولانا غلام رسول بیری کٹوانے کے لیے فیروز والا آئے، وہ چیت کا مہینا تھا۔ جس خانقاہ سے بیری کٹوائی گئی، اس کا کنواں اس کے قریب تھا۔ مولانا غلام رسول گھوڑی پر سوار تھے۔ انھوں نے آتے ہی گھوڑی چھوڑ دی اور وہ سیدھی ان کے گندم کے کھیت میں چلی گئی۔ اس کھیت میں نئی آب پاشی ہوئی تھی اور چند روز تک اس کی کٹائی ہونے والی تھی۔ اب گھوڑی گندم کھا رہی تھی اور بوٹا اور ان کا بیٹا اسے دیکھ رہے تھے۔ مولانا ان کے پاس بیٹھے تھے اور انھیں ایک مجذوب کا واقعہ سنا رہے تھے کہ وہ مجذوب لوگوں کے کم زور اور بھوکے گدھے زمینداروں کے کھیتوں میں چراتا پھرتا تھا، جتنے پاؤں ان گدھوں کے کسی زمیندار کے کھیت میں پڑتے، اس زمیندار کا

اتنے ہی مانی غلہ ہوتا۔ اگر کوئی زمیندار گدھوں کو چرنے سے روکتا تو اس کا غلہ بہت کم ہوتا۔ جب لوگوں کو اس مجذوب کے متعلق پتا چل گیا تو انھوں نے خود مجذوب سے کہنا شروع کر دیا کہ وہ گدھے ان کے کھیتوں میں لائے اور چرائے۔

مولانا غلام رسول سے مجذوب کا یہ قصہ سن کر کھیت کے مالک بوٹا بٹر نے ان سے کہا کہ آپ کی گھوڑی سیدھی میرے گندم کے کھیت میں آئی اور اس نے اس کے خوشے کھانا شروع کر دیے۔ میں بھی گنتا ہوں کہ اس نے کتنے خوشے کھائے اور اس کے کتنے قدم زمین میں پڑے۔ مولانا نے فرمایا، تمھارا جی چاہتا ہے تو گن لو۔ اگر اللہ کو میری عزت رکھنا منظور ہوگی تو رکھ لے گا۔ بوٹا بٹر کہتا ہے کہ میں نے گھوڑی کے قدم گنے جو میری زمین میں پڑے، 84 تھے۔ میری کاشت کل دس گھماؤں تھی۔ جب گندم کاٹی گئی اور غلہ نکلا تو پوری 84 مانی گندم ہوئی۔ یہ مولانا کی کرامت یا ان کی دعا کا نتیجہ تھا۔

(۴۱) یہیں فیروز والا کا ایک شخص آ گیا۔ اس نے عرض کیا کہ میری چچی بیوہ ہے اور مال دار ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میں نے اسے نکاح کے لیے کہا تو وہ مجھ سے سخت کلامی سے پیش آئی۔ مولانا نے فرمایا تم اپنی چچی کو میری طرف سے کہو کہ آج شام کو وہ مجھے کھانا کھلائے۔ اس نے اسے مولانا کا یہ پیغام دیا تو وہ بہت خوش ہوئی اور اسی شخص سے کھانے کی چیزیں منگوائیں اور تمام انتظام اسی کے سپرد کر دیا۔ جب کھانا کھا چکے تو اس عورت نے مولانا سے کہا کہ میرا اس شخص سے نکاح کر دیں۔ شاید آپ کے نکاح پڑھانے اور مبارک قدموں کی وجہ سے کوئی بیٹا پیدا ہو جائے۔ چنانچہ مولانا نے نکاح پڑھا دیا اور وہ میاں بیوی بیٹوں

والے ہوئے۔

(۴۲) ایک اور شخص کا قصہ سنیے، اس کا نام بھی بوٹا تھا اور وہ قلعہ اسلام کا رہنے والا تھا، کشمیری برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ نہ نماز پڑھتا تھا، نہ روزہ رکھتا تھا۔ ایک دفعہ رمضان شریف میں مسجد میں آکر کنوئیں سے پانی نکالا اور پانی لوٹے میں ڈال کر پینے لگا۔ مولانا غلام رسول وہیں تھے۔ انھوں نے فرمایا کیا کر رہے ہو؟ کہا: پانی پی رہا ہوں۔ فرمایا یہ تو بڑی بے حیائی کی بات ہے کہ مسجد کا ڈول اور مسجد ہی کا لوٹا، پھر رمضان کا مہینا۔ مسجد میں کھڑے ہو کر تو میرے سامنے اقرار کرتا ہے کہ پانی پی رہا ہوں۔ اس نے مولانا کی یہ بات سن کر پانی سے بھرا ہوا لوٹا زمین پر پھینک دیا اور وہ ٹوٹ گیا۔

مولانا نے فرمایا: کم بخت جس طرح تو نے مسجد کا لوٹا توڑا ہے، اللہ تعالیٰ اسی طرح تجھے توڑے گا۔

اس کے بعد وہ گھر گیا اور جاتے ہی سخت بیمار ہوگیا۔ اس کا ایک رشتے دار محمد صدیق کشمیری تھا جو بہت نیک آدمی تھا اور مولانا غلام رسول کا مرید تھا۔ اسے اس کی تکلیف کا علم ہوا تو عیادت کے لیے آیا اور کہا کہ تم تو اچھے بھلے تھے، اچانک کیا معاملہ ہوا؟ اس نے سارا واقعہ بیان کیا اور کہا کہ کسی حکیم کو لاؤ اور اس سے دوا لو۔ محمد صدیق نے کہا یہ حکیم کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ مولانا کی کرامت ہے۔ وہی دعا فرمائیں گے تو تمھیں آرام آئے گا۔ چنانچہ محمد صدیق سمیت سب رشتے دار اسے مولانا کی خدمت میں لے گئے۔ اس کی جوان بیوی بھی بچے کو اٹھا کر لے گئی۔ لوگوں نے دعا کے لیے عرض کیا اور بیوی نے روتے ہوئے بچہ مولانا کی گود میں

رکھ دیا اور کہا: حضور میری جوانی کو دیکھیے اور اس بچے کو دیکھیے۔اس کے لیے دعا فرمایئے کہ یہ تندرست ہو جائے۔ دوسرے لوگوں نے بھی اسی قسم کے الفاظ کہے۔

مولانا نے فرمایا: میری ذاتی طور پر نہ اس سے کوئی ناراضی ہے اور نہ اس پر کوئی غصہ ہے۔ یہ نماز پڑھے، روزے رکھے، زکوٰۃ دے، جو اللہ نے اس پر فرائض عائد کیے ہیں، وہ ادا کرے، اللہ تعالیٰ اسے صحت عطا فرمائے گا۔اگر ایسا نہیں کرے گا تو

﴿ان بطش ربك لشديد﴾ (سورہ بروج: 12)

''بے شک تیرے رب کی پکڑ بہت سخت ہے۔''

چنانچہ اس نے سب کے سامنے اپنے گزشتہ گناہوں سے توبہ کی اور آئندہ نماز روزے کی ادائیگی کا اقرار کیا اور اللہ نے صحت عطا فرما دی۔

ایک سال وہ اس عہد کا پابند رہا اور اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ایک سال کے بعد اس نے نماز چھوڑ دی تو پھر اسی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ پھر نماز شروع کر دی تو پھر تندرست ہو گیا۔

چوتھی دفعہ نماز چھوڑ دی تو مولانا نے فرمایا: یہ شخص اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتا ہے۔ اب اس کا کوئی علاج نہیں۔ چنانچہ اسی بیماری کی حالت میں اس کی موت واقع ہوگئی۔

(۴۳) قلعہ اسلام کے قریب ایک گاؤں کا نام ''مان'' ہے۔ وہاں کا نمبردار فضل دین ایک دفعہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا کہ میں فلاں ساہوکار (بنیے) کا مقروض ہوں۔ اصل رقم بہت کم ہے، باقی سب سود ہی ہے جو میں نے ادا کرنا ہے۔ ساہوکار مطالبہ کر رہا ہے کہ یا تو دو چار روز میں نقد روپے کی صورت

میں قرض ادا کردو یا اس کے بدلے میں زمین دو، ورنہ عدالت میں تم پر دعویٰ دائر کیا جائے گا۔ فضل دین نے مولانا سے کہا اگر معاملہ عدالت میں گیا تو زمین بھی جائے گی اور نمبرداری بھی ختم ہوجائے گی۔

مولانا نے پوچھا: قرض کتنا ہے؟

جواب دیا: بارہ سو روپے۔

فرمایا: فلاں فلاں آدمی کو ساتھ لے کر اس بنیے کے پاس جاؤ اور جو چھوٹی سی گائے تمھارے پاس ہے، وہ اسے دے کر حساب بے باق کردو۔ تمھارے ذمے کل بارہ روپے ہیں۔

فضل دین نمبردار نے کہا: حضرت مجھے اچھی طرح معلوم ہے، قرض بارہ سو روپے ہے، لیکن ہے سود ہی۔

فرمایا: تم جاؤ قرض خواہ سے ملو۔ اللہ فضل کرے گا۔

حسب ارشاد فضل دین نمبردار چند آدمیوں کو ساتھ لے کر قرض خواہ کے پاس گیا اور کہا میں حساب کرنے کے لیے آیا ہوں۔ قرض خواہ بنیے نے بہی کھولی، اس میں لکھا تھا، بقایا قابل وصول رقم بارہ روپے۔

اب قرض خواہ بھی حیران اور فضل دین نمبردار بھی متعجب۔ چھوٹی سی گائے اسے دی اور معاملہ صاف ہوگیا۔

یہ کیا قصہ ہے؟ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

(۴۴) اسی طرح ایک شخص آیا۔ اس نے عرض کیا کہ میرے پاس صرف ایک بوڑھی بھینس ہے، وہ بھی ''گابھن'' نہیں ہے۔ فرمایا: وہ تو ''گابھن'' ہے۔ جاؤ اللہ تعالیٰ اس

میں برکت فرمائے گا۔ اس کے بعد کئی دفعہ اس نے کٹے اور کٹیاں دیں۔ اسی کا دودھ اور گھی بیچ کر وہ شخص آسودہ حال ہوگیا۔

(۴۵) موضع مان (متصل قلعہ اسلام) کا ایک شخص اسماعیل کشمیری بڑا مال دار تھا، اور وہیں کا رہنے والا ایک شخص شرف الدین تھا جو نہایت نیک آدمی تھا اور مولانا غلام رسول کا ارادت مند تھا۔ مولانا کے بیٹے مولوی عبدالقادر کی شادی ہونے والی تھی اور اس کے لیے مولانا کو ایک سو روپے کی ضرورت تھی۔ وہ موضع مان گئے اور اپنے مرید شرف الدین کو بھیج کر اسماعیل کشمیری کو بلایا اور اس سے ایک سو روپیہ قرض مانگا۔ اسماعیل نے کہا میرے پاس سو روپیہ نہیں ہے۔ مولانا نے پھر کہا کہ مجھے عبدالقادر کی شادی کے سلسلے میں سو روپے کی ضرورت ہے، تم دے دو۔ میں یہ قرض جلد ہی تمھیں ادا کردوں گا۔ اسماعیل نے اب بھی یہی کہا کہ میرے پاس سو روپیہ نہیں ہے۔ شرف الدین نے بھی اسے سو روپیہ دینے کو کہا، اس نے اسے بھی یہی الفاظ کہے کہ میرے پاس سو روپیہ نہیں ہے۔

مولانا نے شرف الدین سے کہا، اب اس سے سو روپیہ نہ مانگو۔ اس کے پاس نہیں ہے۔ اسماعیل کے انکار کرنے پر مولانا واپس قلعہ اسلام تشریف لے گئے اور شرف الدین نے کسی سے سو روپیہ ادھار لے کر مولانا کے گھر پہنچا دیا۔ مولانا نے اس کے لیے دعا کی اور تھوڑے عرصے میں وہ اس قدر آسودہ حال ہوگیا کہ زکوٰۃ دینے لگا۔ لیکن اسماعیل بالکل مفلس ہوگیا اور پھر اسی صدمے سے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ موت تک اس کی زبان پر یہی الفاظ رہے کہ نہ میں نے کسی کی شادی کی، نہ میرا روپیہ چوری ہوا، نہ میں نے کسی کو ادھار دیا۔ میرا پیسا کدھر گیا۔

افسوس میں نے مولوی صاحب کو سو روپیہ قرض نہ دیا اور میری یہ حالت ہوگئی۔

(۴۶) ایک دن ستراہ سندھواں کے حاجی خدایار نے جو مولانا کے مرید تھے، عرض کیا کہ ان کے گاؤں کا ذیل دار فیض بخش بڑا عیاش اور غلط رو ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی بہت بااثر اور فراخ دست بھی ہے۔ اگر وہ سدھر جائے اور اسلامی احکام پر عمل کرنے لگے تو گاؤں کے تمام لوگ صراط مستقیم پر گام زن ہو جائیں۔ اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا ممدوح ستراہ سندھواں تشریف لے گئے۔ ذیل دار فیض بخش سے ملاقات ہوئی تو مولانا نے فارسی کا یہ شعر پڑھا۔

بیا با نیک خواہاں متفق باش غنیمت دان امور اتفاق

''آؤ نیکی کے خواہش مندوں کے ہم نوا ہو جاؤ۔ ان اتفاقی معاملات کو غنیمت جانو۔''

شعر سنتے ہی ذیل دار کے دل کی حالت بدل گئی اور اس پر عجیب قسم کی واردات طاری ہوگئیں۔ مولانا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور وہ ان کے حلقۂ عقیدت منداں میں شامل ہوگیا۔ اب وہ خود بھی احکامِ اسلامی کا پابند تھا اور اس کی وجہ سے اور بھی بے شمار لوگوں نے اسلام کی سیدھی راہ اختیار کر لی۔

(۴۷) انھی حاجی خدایار نے جو مولانا کے سعادت مند مرید اور مردِ صالح تھے، اپنی ہدایت یافتگی کا واقعہ بیان کیا کہ وہ ذیل دار فیض بخش کے منشی تھے۔ دیگر آمدنی کے علاوہ انھیں رشوت کی آمدنی سے ذیل دار دس روپے فی صد کے حساب سے دیتا تھا۔ یعنی اگر سو روپے رشوت کے ذیل دار کو ملتے تو ان میں سے دس روپے حاجی خدایار کو دیے جاتے۔ ایک دن وہ ایک مقدمے کے سلسلے میں ذیل دار کے ساتھ گوجراں

والا آئے تو انھیں حساب کے مطابق پندرہ روپے رشوت سے حصہ ملا۔ ان کا تعلق اہل علم کے کسی گھرانے سے تھا اور انھوں نے سواری کے لیے گھوڑی رکھی تھی۔ مقدمے سے فارغ ہو کر اور اپنے حصے کے پندرہ روپے رشوت جیب میں ڈال کر انھوں نے ذیلدار سے کہا کہ میں آج مولانا غلام رسول کی زیارت کے لیے قلعہ اسلام جانا چاہتا ہوں۔ سنا ہے وہ بہت بڑے بزرگ ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ اس بزرگ کو سلام کیا جائے۔ ذیلدار نے ان کو وہاں جانے سے روکنے کی کوشش کی اور کہا چھوڑو ان بزرگوں اور مولویوں کو۔ اس قسم کے ہم نے بہت لوگ دیکھے ہیں۔ لیکن حاجی خدایار نے ان کی بات نہیں مانی اور وہ شام کے قریب قلعہ اسلام پہنچ گئے۔ اس وقت مولانا غلام رسول مسجد سے باہر کھڑے تھے اور ان کے ساتھ درویش محمد ابراہیم تھا۔ اس سے پہلے نہ حاجی خدایار نے مولانا کو دیکھا تھا اور نہ مولانا نے حاجی خدایار کو۔ دونوں کی آپس میں کوئی جان پہچان نہ تھی۔

اب مولانا نے ان کو آتے ہوئے دیکھا تو محمد ابراہیم درویش سے کہا کہ اس گھوڑی والے شخص کا تعلق ستراہ کے علما سے ہے۔ اس سے گھوڑی پکڑ کر باندھو اور اسے چارہ کھلاؤ۔ میں کنوئیں پر جا رہا ہوں۔ حاجی صاحب سے مولانا کی تھوڑی سی سلام دعا ہوئی اور وہ اپنے کنوئیں پر چلے گئے۔ ابراہیم درویش نے ان سے گھوڑی پکڑی اور اسے چارہ کھلایا۔

مولانا ممدوح مغرب کے وقت آئے اور نماز پڑھائی۔ پھر عشا کی نماز پڑھائی۔ لیکن خدایار کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ وہ سخت پریشان ہوئے اور مولانا پر غصہ بھی آیا ہوگا۔ جی میں آیا کہ ذیلدار ٹھیک کہتا تھا۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے

تھا۔ اسی خفگی کے عالم میں سو گئے۔

مولانا سحری کے وقت مسجد میں آئے تو خدایار کو جگایا۔ فرمایا تم عالم ہو یا چوہڑے؟ انھوں نے کہا: حضرت مجھ میں چوہڑوں والی کون سی بات ہے؟ فرمایا: ذیل دار کا ساتھ چھوڑ دو اور آئندہ کے لیے اپنی کوتاہیوں سے توبہ کرو۔

خدایار اس پر سخت حیران کہ انھیں کیسے پتا چلا کہ میرا تعلق ذیل دار سے ہے اور میں اس کی رشوت سے حصہ لیتا ہوں۔ وہ اس پر بھی حیران کہ انھیں کس طرح معلوم ہوا کہ میرا تعلق علماً کے خاندان سے ہے۔

بہر حال مولانا کے کہنے سے انھوں نے ذیل دار کا ساتھ چھوڑ دیا اور ملازمت ترک کردی۔ ذیل دار نے ان کو اپنے ساتھ رہنے اور ملازمت کا سلسلہ جاری رکھنے پر بہت اصرار کیا۔ یہ بھی کہا کہ رشوت کے پیسوں میں سے پینتیس روپے فی صد لے لیا کرو۔ مگر یہ نہیں مانے۔ مولانا کی یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ ''ذیل دار کا ساتھ چھوڑ دو اور گزشتہ کوتاہیوں سے تائب ہو جاؤ'' وہ اس پر عامل ہو گئے۔

(۴۸) قلعہ اسلام سے بارہ کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں ''دائیاں والی'' ہے۔ وہاں ایک صوفی صاحب رہتے تھے، جن کا نام پیر کیسر شاہ تھا اور وہ احکامِ شرع کے پابند نہ تھے۔ ایک دن ان کے ایک مرید مولانا غلام رسول سے ملاقات کی غرض سے پیر کیسر شاہ کے ہاں سے روانہ ہوئے تو پیر صاحب نے کہا کہ مولوی غلام رسول کا امتحان کرتے آنا۔ عصر کی نماز پڑھی جارہی تھی کہ وہ مرید آ گیا۔ نماز کے بعد وہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور گفتگو کرنے لگا۔ آدھ گھنٹے کے بعد اس نے مولانا سے رخصت کی اجازت مانگی۔ مولانا نے فرمایا بیٹھ جاؤ، ابھی بہت وقت

ہے۔ اس نے عرض کیا دائیاں والی یہاں سے بارہ کوس (تقریباً اٹھارہ کلو میٹر) کے فاصلے پر ہے؟ اب اجازت دیجیے۔ مولانا اسے رخصت کرنے کے لیے مسجد سے باہر آئے اور فرمایا اپنے پیر کو میری زبانی یہ شعر سنا دینا۔

خلافِ پیغمبر کسے رہ گزید — کہ ہر گز بمنزل نخواہد رسید

''جو شخص اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ ہر گز منزل کو نہیں پہنچ سکے گا۔''

وہ شخص بیان کرتا ہے کہ مولانا نے اسے رخصت کرتے وقت اس سے مصافحہ اور معانقہ کیا اور وہ وہاں سے چل پڑا۔ ابھی سورج اسی حالت میں تھا کہ وہ دائیاں والی پہنچ گیا۔ کیسر شاہ سے ملا اور انھیں مولانا کا پیغام دیا۔

انھوں نے پوچھا قلعہ اسلام سے کب روانہ ہوئے تھے؟ بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل وہاں سے چلا تھا۔ نہ مجھے سفر کی تکان ہے اور نہ کسی قسم کی بے آرامی ہے۔!

اس روز سے وہ مولانا کا معتقد ہوگیا اور کہنا شروع کیا کہ اس وقت صالحیت کی رو سے دنیا میں کوئی شخص مولانا غلام رسول کا ہم سر نہیں۔ پھر اس نے کیسر شاہ سے بیعت کا سلسلہ ختم کیا اور مولانا ممدوح کے حلقۂ بیعت میں شامل ہوگیا۔

(۴۹) کوٹ بھوانی داس کے ایک بزرگ میاں عبدالعزیز، مولانا غلام رسول کے شاگرد اور ارادات مند تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ قلعہ اسلام سے قریب کے ایک گاؤں موضع ''دھاری وال'' کا بڑھئی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ سکھوں کا مزارع ہے اور چار مانی گندم بہ طور ٹھیکا ان کو دینی ہے۔ لیکن جو گندم زمین کی کاشت سے اسے حاصل ہوئی ہے، وہ بہ مشکل ڈیڑھ یا دو مانی ہوگی۔ ظاہر

ہے زمین کے مالک کو پوری گندم نہیں دی جا سکے گی۔ گھر میں کھانے کے لیے بھی گندم کی ضرورت ہے۔ اس صورت حال سے وہ بڑھئی سخت پریشان تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ پوری گندم نہ دی گئی تو زمین کا مالک سکھ اس کی بے عزتی کرے گا۔ اس نے اس پریشانی سے نجات کے لیے مولانا سے دعا کی درخواست کی۔ مولانا اس وقت غسل کر رہے تھے۔ انھوں نے غسل کے بعد جس کپڑے سے جسم صاف کیا، وہ کپڑا اسے دیا اور فرمایا یہ کپڑا گندم کے ڈھیر پر ڈال دو اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر اسے تولنا شروع کرو، میں بھی تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔

مولانا وہاں گئے تو گیارہ مانی گندم تولی جا چکی تھی جو مزارع نے اپنے گھر رکھنی تھی۔ مولانا نے ڈھیر پر سے کپڑا اٹھایا تو دیکھا کہ ابھی اتنی ہی گندم پڑی ہے، جتنی پہلے تھی۔ یہ دیکھ کر مولانا اس بڑھئی مزارع پر خفا ہوئے اور فرمایا پورا حساب کرنے کے بعد اپنے گزارے کے لیے رکھ لیتے۔ اتنا لالچ کرنا اچھی بات نہیں۔

(۵۰) اب ایک شخص پیر میر حیدر مرحوم کا واقعہ سنیے۔ وہ خان پور گکھڑاں ضلع راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور یہی ان کے آباواجداد کا مسکن تھا۔ انھیں شکار کا بہت شوق تھا۔ 35 سال کے خوب صورت جوان تھے۔ ایک دن شکار کھیلنے کے بعد گھوڑے پر سوار تھے اور گھر جا رہے تھے کہ بازار میں ایک لکڑہارے نے آواز دی اور کہا میر حیدر تھوڑی دیر یہاں بیٹھ جاؤ۔ لیکن انھوں نے اس کی پروا نہ کی اور چلے گئے۔ دوسرے روز پھر شکار سے واپس آتے ہوئے وہاں سے گزرے تو اسی لکڑہارے نے بلایا اور کچھ دیر بیٹھنے کے لیے کہا، لیکن انھوں نے اب بھی اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور چلے گئے۔ حسب معمول تیسرے روز وہاں سے گزرے تو لکڑہارے

نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑی اور انھیں نیچے اتار لیا۔ مصافحہ بھی کیا اور بغل گیر بھی ہوا۔

اسی وقت میر حیدر کی دنیا بدل گئی۔ شکار کا شوق دل سے نکل گیا اور حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔ گھوڑا اور باز ملازموں کو دیے کہ اسے گھر لے جائیں اور لکڑ ہارے کے پاس بیٹھ گئے۔ اہل و عیال کا خیال دل سے رخصت ہوا اور ذکر الٰہی اور یاد خدا میں مصروف ہو گئے۔ اس کے علاوہ کسی چیز سے کوئی تعلق نہ رہا۔ ان کے بھائی، بچے اور رشتے دار لینے کے لیے آتے، لیکن یہ انھیں کسی نہ کسی طرح گھر بھیج دیتے اور ہر وقت لکڑ ہارے کے پاس بیٹھے اللہ کی عبادت کرتے رہتے۔

ایک دن صبح نیند سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ لکڑ ہارا غائب ہے۔ نہ اس کا سامان، نہ بستر، کچھ بھی نہیں ہے۔ سخت پریشانی کی حالت میں اس کی تلاش میں نکل پڑے۔ طویل عرصے تک اسے تلاش کیا، مختلف مقامات میں ڈھونڈنے کی کوشش کی، لیکن وہ نہیں ملا اور کسی نے اس کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ اسی پریشانی کے عالم میں ہری پور ہزارہ پہنچے اور وہاں ایک شخص حیات گل سے ملاقات ہوئی۔ حیات گل نے ان کا حال سن کر انھیں حضرت سید عبداللہ غزنوی کے پاس بھیج دیا۔ وہاں سے بھی اس لکڑ ہارے کا سراغ نہ ملا۔

پھرتے پھراتے ایک دفعہ گوجراں والا پہنچ گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک بزرگ نبی بخش سراج سے ہوئی۔ انھوں نے ان کی کیفیت قلبی کا اندازہ کر کے پوچھا ،آپ کون ہیں؟ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ اب کہاں کا قصد ہے؟ ان کے ان سوالات سے انھیں کچھ تسکین ہوئی۔ دل میں مسرت کی لہر اٹھی اور اس کے پاس

بیٹھ گئے۔ گفتگو کرتے ہوئے اس سے پوچھا آپ کس کے مرید ہیں؟

جواب دیا: مولوی صاحب کے۔

پوچھا: کون مولوی صاحب؟

جواب ملا: مولوی غلام رسول قلعہ اسلام والے کے۔

یہ نام سنتے ہی ان کا جی مطمئن ہوگیا اور بے چینی اور پریشانی کافی حدتک ختم ہوگئی۔ ذہن پر دستک ہوئی کہ مولوی صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا چاہیے۔ آتشِ شوقِ دیدار اس قدر بھڑکی کہ نبی بخش سراج سے کہا مجھے ابھی قلعہ اسلام کا راستہ بتاؤ۔ انھوں نے کہا کچھ دیر ٹھہرو، روٹی کھاؤ، پھر چلے جانا۔ لیکن یہ ایک لمحے کے لیے بھی وہاں ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ دل مولانا کے پاس پہنچنے اور ان سے ملنے کے لیے انتہائی بے تاب تھا۔

اب نبی بخش سراج انھیں قلعہ اسلام کا راستہ بتانے کے لیے اٹھے تو چلتے چلتے ان کے ساتھ ہی قلعہ اسلام پہنچ گئے۔ مولانا اس وقت گھر میں تشریف فرما تھے۔ وہ اسی وقت ان دونوں کے لیے کھانا اٹھائے تشریف لائے۔ السلام علیکم کہا، مصافحہ کیا اور فرمایا: میر حیدر خوش ہوجاؤ۔ لیکن میر حیدر اس کا جواب دینے کے بجائے رو پڑے۔ فرمایا صبر کرو، ان شاء اللہ تمھارا مقصد پورا ہوگا۔ پھر ان کی بے صبری اور روٹی نہ کھانا دیکھ کر فرمایا: میر حیدر! تمھارا پیر لکڑ ہارا ابدال تھا۔ تمھاری اصلاح کی خاطر اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہاں مقیم تھا۔ جب تمھارا حصہ تمھیں مل گیا تو وہ چلا گیا اور لکھنؤ پہنچ کر فوت ہوگیا۔ تمھارا باقی حصہ اس عاجز کے پاس ہے۔ مولانا کے یہ الفاظ سن کر میر حیدر مطمئن ہوگئے۔

پھر وہ ایک مدت تک مولانا کی خدمت میں رہے۔ مولانا گھوڑی پر سوار ہوتے وہ گھوڑی کی پالان پکڑ کر پیچھے دوڑتے، جس سے انھیں بے حد سرور حاصل ہوتا۔ اس زمانے میں انھوں نے بہت روحانی فیض پایا۔ وہ وہیں رہنا چاہتے تھے لیکن مولانا نے انھیں نصیحت کی کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی رو سے بیوی، بچوں، بہن بھائیوں اور باقی رشتے داروں کے بھی آپ پر کچھ حقوق ہیں، انھیں پورا کرنا ضروری ہے۔ اس قسم کی نصیحتیں کر کے مولانا نے ان کو ان کے گھر روانہ کر دیا۔

(۵۱) مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے ایک شاگرد کا نام احمد الدین تھا اور احمد الدین کے والد کا نام تھا چودھری حاکم وڑائچ ۔ یہ ضلع گوجراں والا کے قصبہ لدھے والا وڑائچ کے رہنے والے تھے۔ مولانا کے مخلص ترین مرید۔ ایک مرتبہ گھوڑی فروخت کرنے کے لیے امرتسر گئے۔ وہاں مویشیوں کی منڈی لگتی تھی۔ کئی دن واپس نہ آئے تو ان کے بیٹے احمد الدین نے مولانا سے کہا کہ میرے والد بہت دنوں سے امرتسر گئے ہیں، واپس نہیں آئے۔ میں ان سے بہت اداس ہو گیا ہوں۔ یہ بات انھوں نے مولانا سے سبق پڑھتے ہوئے کہی۔

مولانا نے اس سے فرمایا اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج ان شاء اللہ تمھارے والد آجائیں گے اور اسی راستے سے آئیں گے اور تمھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ احمد الدین بیان کرتے ہیں کہ عصر کے وقت واقعی میرے والد آ گئے۔ ان کا ملازم بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں انھیں دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اجازت لے کر والد کے ساتھ ہی گاؤں کو روانہ ہو گیا۔

میں گھوڑی پر والد کے پیچھے بیٹھا تھا۔ راستے میں میں نے والد کو بتایا کہ دورانِ سبق مولانا نے فرمایا تھا کہ آج تمھارے والد آئیں گے اور تم بھی ان کے ساتھ جاؤ گے۔

میری بات سن کر والد نے ملازم سے کہا: سن لی مولوی غلام رسول کے بارے میں احمد الدین کی بات۔ لوگ کہتے ہیں کہ حاکم معلوم نہیں مولوی صاحب کا اتنا عاشق اور معتقد کیوں ہے۔ میں ان کی اسی قسم کی باتوں سے ان کا عاشق اور معتقد ہوں۔ لیکن یہ معمولی بات ہے جو احمد الدین نے مولوی صاحب کے بارے میں بتائی ہے۔ میں ان کے بے شمار کشفوں اور کرامتوں کا مشاہدہ کر چکا ہوں۔ ان کی صالحیت اور پاک بازی کی وجہ سے میرا مال و جان سب کچھ ان کے لیے حاضر ہے۔

۵۲ ضلع گوجراں والا کے موضع مرالی والا میں ایک شخص مولوی سلطان احمد سکونت پذیر تھے جو بڑے متمول تھے۔ ان کا ہمسایہ ایک لوہار تھا جو اس علاقے کا مشہور چور تھا۔ سلطان احمد وفات پا گئے تو ان کی بیوہ اور بچوں کو وہ چور تنگ کرنے لگا اور کوشش کرتا کہ ان کے گھر کا سب کچھ لوٹ لیا جائے۔ مولوی سلطان احمد مرحوم کی بیوہ نے مولانا غلام رسول سے اس پریشانی کا ذکر کیا۔ انھوں نے خاتون کو کچھ پڑھنے کے لیے بتایا اور فرمایا کہ یہ پڑھنے کے بعد بے فکر ہو کر سو جایا کرو۔ ان شاء اللہ وہ کتا خود ہی بھونک بھونک کر چلا جایا کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا۔ وہ چوری کی غرض سے آتا اور سچ مچ بھونک کر چلا جاتا۔ اس سے تھوڑا عرصہ بعد مولانا فوت ہو گئے۔

وہ چور خود بیان کرتا ہے کہ مولوی سلطان احمد کی وفات کے بعد اس نے ان کے گھر میں چار دفعہ نقب لگائی۔ جب اندر جاتا تو کتے کی شکل ہو جاتی اور کتے ہی کی طرح بھونکتا ہوا باہر نکل آتا۔ ایک مرتبہ نقب لگا کر اندر گیا۔ گھر کی مالکہ خاتون جاگ رہی تھی۔ میری شکل مسخ ہوتے دیکھ کر اس نے کہا: بھائی تیری شکل مسخ ہونے سے تعجب ہوتا ہے۔ لیکن جس کی زبان سے تیرے متعلق یہ کلمات نکلے ہیں، اس کی زبان سیف الرحمٰن ہے۔ جو کچھ انھوں نے کہا وہ ضرور ہوگا اور آئندہ بھی ان شاء اللہ ہوتا رہے گا۔ اس کے بعد اس نے چوری سے توبہ کر لی تھی۔۔۔ یہ واقعہ مولانا کی بہت بڑی کرامت ہے۔

۵۳ قلعہ اسلام کا باشندہ بوٹا سندھو بیان کرتا ہے کہ وہ کھلیان میں غلہ نکال رہے تھے۔ دیکھا کہ سخت آندھی آئی۔ ان کے والد چودھری خیر محمد گھبرائے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آندھی کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا۔ فرمایا: جاؤ کام کرو۔ اللہ حافظ ہے۔ یہ لوگ کام میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ایسی زور دار آندھی آئی کہ بڑے بڑے درخت جڑوں سے اکھڑ گئے، لیکن ان کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔

۵۴ موضع مان کے رہنے والے بوٹا اور فضل دین سخت مالی پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ مولانا کی خدمت میں آئے اور ان سے اپنی غربت کا اظہار کیا۔ مولانا نے ان کو زراعت کے لیے دو بیل لے دیئے۔ انھوں نے زراعت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن جب فصل کاٹ لی اور بھوسہ اور غلہ الگ الگ کرنے لگے تو شدید آندھی کے آثار پیدا ہو گئے۔ بوٹا کھیتوں سے دوڑتا ہوا مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور

آندھی سے بچاؤ کے لیے دعا کی درخواست کی۔ مولانا نے فرمایا کچھ فکر نہ کرو اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا اور تمھارا نقصان نہیں کرے گا۔ چنانچہ بڑی سخت آندھی آئی، لیکن ان کا ذرہ بھر نقصان نہیں ہوا۔

۵۵ ایک مرتبہ گوجراں والا سے ایک سکھ تھانیدار جوگندر سنگھ کسی مخبری کی بنا پر سرکاری حیثیت سے قلعہ اسلام آیا۔ یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا اور انگریزی سرکار کو اطلاع پہنچی تھی کہ جمعہ میں دو ہزار آدمی جمع ہوتے ہیں۔ مولانا غلام رسول حکومت کے خلاف تقریر کرتے ہیں اور وہ لوگ حکومت کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ اس مخبری کی وجہ سے تھانیدار سرکاری کتوں کے ساتھ آیا اور کتوں سمیت مسجد میں داخل ہو گیا۔ مولانا نے فرمایا یہ مسجد ہے اور اللہ کا گھر ہے، اس سے تم خود بھی نکل جاؤ اور کتوں کو بھی نکال لو۔ لیکن تھانیدار نہیں مانا اور گستاخی سے پیش آیا۔ مولانا نے بڑے جوش و جذبے کے ساتھ قرآن کے یہ الفاظ پڑھے:

﴿ان بطش ربك لشديد﴾ (سورہ بروج: 12)

”تیرے رب کی پکڑ بہت سخت ہے۔“

اگر میں برا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے پکڑے گا۔ اگر تم غلط کار ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمھیں سختی سے پکڑے گا۔

اب تھانیدار نے حاضرین کی گنتی شروع کی تو کل گیارہ آدمی شمار میں آئے۔ بار بار گنتی کی لیکن گیارہ ہی رہے۔ حالاں کہ لوگ بہت زیادہ تھے۔ لیکن اللہ نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اسے گیارہ ہی نظر آئے اور اس نے اپنی رپورٹ میں گیارہ ہی لکھے۔

اس واقعہ پر چند روز گزرے تھے کہ اس تھانیدار پر کوئی مقدمہ قائم ہوگیا اور اسے معزول کر دیا گیا۔ اس مقدمے پر اتنا روپیہ خرچ ہوا کہ وہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا اور سخت ذلیل ہو کر گوجراں والا سے نکلا۔

۵۶ ایک دن مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے بڑے بھائی حکیم غلام محمد نے ان سے کہا کہ ہم حکام کی باز پُرس سے تنگ آ گئے ہیں۔ آئے دن حکومت کا کوئی نہ کوئی آدمی آ دھمکتا ہے اور کہنا شروع کر دیتا ہے کہ تم نے فلاں موقع پر حکومت کے خلاف فلاں بات کہی اور فلاں موقع پر تقریر میں یہ کہا۔ بہتر ہے کہ ہم یہاں سے کسی اور جگہ چلے جائیں یا کسی ریاست کو اپنا مسکن بنالیں۔

مولانا نے فرمایا: بھائی جان آپ کا فرمان بجا ہے، لیکن میں مجبور ہوں۔ میں ایک دن مسجد میں سویا ہوا تھا کہ ایک شخص نے آ کر مجھے جگایا اور کہا کہ میرے ساتھ چلو، تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلا رہے ہیں۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ گاؤں سے باہر نکلا تو دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پالکی پڑی ہے۔ میں نے حاضر خدمت ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا۔ آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: غلام رسول! ہم تمھاری مسجد میں جانا چاہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑے رکھا اور پالکی والوں نے پالکی اٹھالی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں تشریف لا کر اسی طرح پکڑے ہوئے ہاتھ سے مجھے منبر پر بٹھایا اور فرمایا وعظ کیا کرو۔ تمھارے وعظ سے لوگوں کو ہدایت ہوگی۔ تمھاری یہی جائے بود و باش ہے۔

یہ خواب سنا کر فرمایا: بھائی صاحب! میں تو مامور ہوں۔ اس جگہ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔

(۵۷) موضع پپینا کھہ ، قلعہ اسلام سے بجانب شمال پانچ یا چھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ایک دن وہاں کا ایک زمیندار مسمّٰی دارا مولانا کے پاس آیا اور کہا کہ ہم نے ایک کنواں کھدوایا تھا، جس پر کافی روپیہ خرچ ہوا۔ اب وہ کنواں شکستہ ہوگیا ہے۔ میں پہلے ہی مقروض ہو چکا ہوں، دعا فرمایے اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔

مولانا اس کے ساتھ تشریف لے گئے اور کنوئیں پر جا کھڑے ہوئے۔ فرمایا: چودھری دارا کنوئیں کو دیکھو یہ تو بالکل صحیح سالم ہے۔ تمھیں کنواں دیکھنے میں غلطی لگی ہوگی۔ دارا نے عرض کیا حضور مجھے غلطی نہیں لگی۔ یہ سب آپ کی دعا برکت اور کرامت ہے کہ آپ کے تشریف لاتے ہی اللہ تعالیٰ نے کنواں صحیح سالم کردیا ہے۔

(۵۸) موضع ''مان'' کے ایک شخص پر غربت نے غلبہ پالیا اور وہ مقروض ہوگیا۔ زمین رہن ہوگئی اور کچھ باقی نہ رہا۔ ایک شخص نظام الدین اسے مولانا کی خدمت میں لے گیا اور سارا قصہ بیان کیا۔ فرمایا: تمھارے پاس کوئی بیل ہے؟ اس نے عرض کیا، سب کچھ بک گیا، ایک بھینس باقی رہ گئی ہے۔ فرمایا: جاؤ کاشت کرو، اللہ برکت دے گا۔ اس کا بیان ہے کہ اللہ کے فضل وکرم سے وہ ایک سال میں مال دار ہوگیا۔ قرض بھی اتر گیا، زمین بھی قبضے میں آگئی، گاؤں کا نمبردار بھی ہوگیا۔ وہ کہتا ہے کچھ پتا نہیں کہ اتنا مال کہاں سے ملا اور کیسے ملا۔

(۵۹) ایک دفعہ مولانا اپنی گھوڑی پر ساہو والا کی طرف جا رہے تھے۔ اس وقت ان کی حالت دگرگوں تھی اور گھوڑی کی باگ ہاتھ سے گر گئی تھی۔ اُدھر سے ایک ہندو چودھری بھی گھوڑی پر آ رہا تھا۔ اس نے مولانا سے کہا: میاں گھوڑی والے! گھوڑی

کی باگ سنبھالو۔ فرمایا: سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن نفس بڑا سرکش ہے مانتا نہیں۔ ہندو نے کہا کیا کہتا ہے۔ فرمایا: لا الہ الا اللہ کے معنی کما حقہ نہیں مانتا۔ اس کے بعد انھوں نے اس انداز سے کلمہ پڑھا کہ اس سے متاثر ہو کر ہندو چودھری بھی کلمہ پڑھنے لگا اور مسلمان ہو گیا۔ مولانا نے اس کا نام عبداللہ رکھا۔

⑥⓪ موضع درگا ہی والا کا ایک شخص اللہ دتا تھا، جو بعد میں اللہ الصمد کے عرف سے معروف ہوا۔ پہلے وہ ایک سکھ مجسٹریٹ دیال سنگھ کی عدالت میں ملازم تھا اور بڑا راشی تھا۔ پھر حالات بدلے، اس نے مولانا کی بیعت کی اور ان کا مرید ہو گیا۔ پھر کچھ تنگ دستی میں گھر گیا۔ مولانا نے کچھ پڑھنے کے لیے بتایا اور فرمایا اپنے مصلے کے نیچے سے دو روپے روزانہ نکال لیا کرو۔ لیکن یہ سرِّ الٰہی ہے، کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ دو روپے روزانہ آمدنی اس وقت بہت بڑی بات تھی۔ اس آمدنی سے گھر میں آسودگی ہوئی اور حالت بدلی تو اس کی بیوی نے آسودگی کی وجہ پوچھی۔ کچھ عرصہ تو وہ وجہ بتانے سے گریز کرتا رہا، لیکن بیوی نے زیادہ اصرار کیا تو بتا دیا۔ اس کے بعد دو روپے والی آمدنی بند ہو گئی۔

جمعے کے روز یہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولانا نے فرمایا: واہ بھئی اللہ دتا۔ تم سے ایک چھوٹی سی چیز بھی ہضم نہ ہو سکی۔ اب اللہ الصمد پڑھنے کے لیے فرمایا۔ اس نے اتنا کثرت سے اللہ الصمد پڑھا کہ لوگوں میں اس کا نام ہی اللہ الصمد مشہور ہو گیا۔

⑥① یہی شیخ اللہ دتا بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ اسے کچھ روپے کی ضرورت پڑی۔ وہ مولانا کی خدمت میں دعا کے لیے حاضر ہوا۔ مولانا نے فرمایا: تم بھی دعا کرو، میں

بھی دعا کرتا ہوں۔ دعا کرانے کے بعد وہ چلا گیا، راستے میں رفع حاجت کے لیے بیٹھا تو وہاں ایک چھوٹا سا سیاہ رنگ کا کپڑا پڑا تھا۔ اسے کھولا تو اس میں اتنے روپے تھے، جتنے کی اسے ضرورت تھی۔

شیخ اللہ دتا کہتا ہے کہ مجھے مختلف مقامات میں جانے اور بے شمار لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، لیکن مولانا غلام رسول جیسا آدمی کہیں نہیں دیکھا۔ جو کوئی ان کے پاس آیا خالی ہاتھ نہ گیا۔ جو انھوں نے اللہ سے مانگا، اللہ نے دیا، ان کا کام، ان کا لباس، ان کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا سب رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق تھا۔

(٦٢) قلعہ اسلام کے رہنے والے ایک شخص بڈھا کشمیری کا کہنا ہے کہ ایک دن میں نے مولانا سے عرض کیا کہ میں مالی اعتبار سے بہت تنگ ہوں۔ آپ دعا فرمایے کہ میری تکلیف رفع ہو۔ فرمایا: میاں بڈھا فجر کی نماز کے بعد روزانہ ایک مرتبہ سورہ یٰسین پڑھا کرو۔ ان شاء اللہ کسی نہ کسی صورت میں ایک روپیہ تمھیں روزانہ مل جایا کرے گا۔ کچھ دن اس نے یہ عمل کیا اور روزانہ ایک روپیہ ملتا رہا۔ ایک دن اس کے جی میں آیا کہ روزانہ دو دفعہ سورہ یٰسین پڑھ کر دیکھوں کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اس نے روزانہ دو دفعہ پڑھنا شروع کی تو دو روپے روزانہ ملنے لگے۔ پھر تین دفعہ پڑھنے لگا تو تین روپے روزانہ آمدنی ہوگئی۔ اس کے بعد چار اور پھر پانچ دفعہ پڑھنا شروع کی تو پانچ روپے ملنے لگے۔ پانچ دفعہ کا عمل ایک یا دو دن ہی کیا تھا کہ مولانا نے اسے بلا کر فرمایا میاں بڈھا تو بہت لالچی ہوگیا ہے۔ جو تمھیں کہا گیا تھا تو اس پر شاکر نہیں رہا۔ آئندہ اس مطلب کے لیے سورہ یٰسین نہ پڑھنا۔ اس کے بعد اس نے بیس بیس دفعہ روزانہ سورہ یٰسین پڑھی، لیکن حاصل ایک روپیہ بھی

نہ ہوا۔

⑥③ قلعہ اسلام کا عبدالعزیز درزی کہتا ہے کہ بچپن میں اس کے پیر پر لوہاروں کی آہرن گری، جس سے اس کا پاؤں زخمی ہوگیا اور اتنا شدید درد ہونے لگا کہ نہ چل سکتا تھا اور نہ کوئی کام کرسکتا تھا۔ اس کی والدہ اسے اٹھا کر مولانا کے پاس لے گئی۔ انھوں نے اس کے زخمی پیر پر تھوک لگایا اور اسے فوراً آرام آ گیا۔

⑥④ ہدایت اللہ پنجابی کے مشہور شاعر تھے جو لاہور (چینیاں والی مسجد کے قریب) رہتے تھے۔ پنجابی نظم میں ان کی ایک کتاب ''سی حرفی ہدایت اللہ'' کسی زمانے میں بہت پڑھی جاتی تھی۔ ان کے بقول ان کے ''والد نمازی تھے مگر بدعتی اور مشرک تھے''۔ ایک مرتبہ مولانا غلام رسول چینیاں والی مسجد میں تشریف لائے، ہدایت اللہ کے والد ان کی زیارت کو گئے۔ ہدایت اللہ کا یہ بچپن کا زمانہ تھا۔ یہ بھی والد کے ساتھ چلے گئے۔ ان کے گلے میں چاندی کی بنی ہوئی ہنسلیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ مولانا نے ان کے والد سے نہایت نرم الفاظ میں پوچھا بچے کے گلے میں یہ کیا ڈال رکھا ہے؟ والد نے بتایا کہ میرے کئی بچے چھوٹی عمر میں فوت ہوگئے ہیں۔ سنا ہے کہ سات سال کی عمر تک کے بچے کے گلے میں چاندی کی ہنسلیاں ڈالی جائیں تو بچے زندہ رہتے ہیں، چنانچہ بچے کی زندگی کے لیے یہ اس کے گلے میں ڈالی گئی ہیں۔ مولانا نے فرمایا: موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ان ہنسلیوں میں کیا پڑا ہے۔ یہ کسی کو زندگی عطا نہیں کرسکتیں، انھیں اتار دو۔ چنانچہ ان کے والد نے ہنسلیاں وہیں اتار دیں۔ گھر آئے تو ہدایت اللہ کی والدہ اور دادی چیخنے چلانے لگیں کہ یہ کیا ظلم کیا، ہنسلیاں کیوں اتار دیں؟ لیکن ان کے والد نے ان کی کوئی

پروانہ کی اور ہنسلیاں گلے میں نہیں ڈالیں۔ مولانا چلے گئے۔ اس کے بعد ہدایت اللہ بیمار ہو گئے اور چھ مہینے بیمار رہے، اس اثنا میں ایک ہاتھ بھی سوکھ گیا۔ چھ مہینے کے بعد مولانا پھر لاہور تشریف لائے اور ہدایت اللہ کے والد انھیں ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ جس دن سے اس بچے کے گلے سے ہنسلیاں اتاری ہیں، اسی دن سے یہ بچہ بیمار ہے اور اس کا ایک ہاتھ بھی سوکھ گیا ہے۔

ہدایت اللہ بتاتے ہیں: ''مولوی صاحب نے میرے ہاتھ پر اپنا لب مبارک لگایا اور دم کیا۔ میں بالکل تندرست ہو گیا اور اب تک درزیوں کا کام کرتا ہوں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ایسے کاموں پر عقیدہ رکھنے کے لیے شیطان اس قسم کی اذیتیں دیا کرتے ہیں۔''

یہ مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی چونسٹھ (64) کرامات یا ان کی قبولیت دعا کے واقعات ہیں جو ان کے بڑے صاحب زادے اور سوانح نگار مولانا عبدالقادر نے تحریر فرمائے ہیں۔[1]

یقیناً اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہوں گے جن تک فاضل سوانح نگار کی رسائی نہیں ہو سکی۔ اب مولانا غلام رسول قلعوی کے متعلق ایک واقعہ اور ملاحظہ فرمایے۔ یہ واقعہ مجھے فیصل آباد سے مکتبہ دارِ ارقم کے مالک جناب محمد اشرف جاوید صاحب نے ارسال کیا ہے جو سوہدرہ کے رہنے والے جماعتِ اہل حدیث کے معروف طبیب حکیم محمد عبداللہ نصر علیگ مرحوم نے ہفت روزہ ''المنبر'' (فیصل آباد)

[1] ''سوانح حیات حضرت مولانا غلام رسول'' صفحہ 99 تا 150

کے شمارہ مورخہ 9۔ جون 1967ء کے ایک مضمون میں تحریر فرمایا:

حکیم صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

کسی زمانے میں ہمارے گاؤں (علاقہ) سوہدرہ ضلع گوجراں والا کے اکثر لوگ شیر گڑھ کے پیروں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پیر صاحب اپنے لاؤ لشکر اور مریدوں کے ساتھ اپنے سالانہ دورے پر نکلے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاں بھی تشریف فرما ہوئے۔ بیس پچیس بیل گاڑیاں، دس پندرہ اونٹ، چالیس پچاس گھوڑیاں اور دوسو کے قریب مریدوں کا جتھا ساتھ تھا۔

باہر لبِ سڑک ڈیرا تھا۔ زیادہ وقت اپنے خلیفہ کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں گزارتے، دوپہر کے وقت حسب معمول شطرنج کھیل رہے تھے کہ شہر سے کھانے کا بلاوا آ گیا۔ آپ مریدوں سمیت روانہ ہوئے اور بساط اسی طرح بچھی چھوڑ گئے اور محافظ کو ہدایت کر گئے کہ اس طرف خیال رکھنا، کوئی ہاتھ نہ لگائے۔

پیر صاحب کے جانے کے بعد ایک نو وارد شخص سفید ریش دوسوتی کا کرتہ پہنے، نیلا تہبند باندھے، ہاتھ میں عصا لیے ڈیرے میں وارد ہوئے تو محافظ سے پوچھا یہ ڈیرا کس کا ہے؟ اس نے کہا قدوۃ السالکین، حضرت سید قطب الاقطاب پیر ومرشد سید شیر گڑھ شریف والوں کا ڈیرا ہے۔ نو وارد نے پوچھا یہ شطرنج کون کھیل رہا تھا؟ محافظ نے جواب دیا پیر صاحب اپنے خلیفہ کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ نو وارد نے بساط کو چاروں کونوں سے پکڑا اسے اکٹھا کیا اور قریب کی نالی میں پھینک کر عصا سے اس کے اوپر کیچڑ ڈال دیا کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

محافظ نے اٹھ کر نو وارد کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ میں اب تمھیں حضرت پیر صاحب کے آنے تک جانے نہیں دوں گا۔ نو وارد نے کہا میں نہیں جاتا اور وہیں قریب ایک طرف ہو کر زمین پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پیر صاحب تشریف لائے۔ محافظ سے بساط کے متعلق دریافت کیا کہ کدھر گئی۔ اس نے نو وارد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس نے نالی میں پھینک کر کیچڑ میں دبا دی ہے۔

پیر صاحب جلال میں آ گئے اور نو وارد سے فرمانے لگے کیوں بے بھنگی!

یہ تو نے کیا کیا؟ نو وارد مود بانہ کھڑے ہو کر کہنے لگا بے شک میں سادات کے گھرانے کا بھنگی ہوں، بھنگی کا کام یہ ہے کہ مالک کے گھر سے جو کوڑا کرکٹ دیکھے اسے جھاڑ کر صاف کر دے۔ پیر صاحب بے ہوش ہو کر گر پڑے گھنٹا بھر کے بعد ہوش میں آئے۔

اٹھے، کپڑے جھاڑے اور دست بستہ عرض پرداز ہوئے کہ اے پیر مرد، مجھے اللہ تعالیٰ کے واسطے معاف کر دو۔ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ پیری مریدی نہ کروں گا۔

اس کے بعد سے آج تک پیر صاحب ادھر تشریف نہیں لائے۔ یہ نو وارد پیر مرد کون تھے؟ یہ تھے مولانا غلام رسول رحمہ اللہ قلعہ اسلام والے۔

ہم لوگوں کے ذہن وفکر پر مادیت نے غلبہ پا لیا ہے اور روحانیت کا معاملہ ختم ہو گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر اس قسم کے واقعات کی صحت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح کے ہم ہیں، اسی طرح کے وہ ہوں گے۔ ہماری یہ سوچ غلط ہے۔

میں نے حضرت مولانا غلام رسول قلعوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات لکھنے کا ارادہ کیا تو اخبار میں بھی اعلان کیا اور بہت سے لوگوں سے ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے بھی رابطہ کیا۔ خود بھی بعض حضرات سے ملا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس ولی اللہ کے حالات سے آگاہی ہوئی اور جو کچھ کسی صاحب نے بتایا، ان کے حوالے سے کتاب میں درج کر دیا۔ بتانے والوں کا تعلق مختلف مقامات سے ہے۔ بلکہ جیسا کہ ''حرفے چند'' میں عرض کیا دوسرے ملکوں (کویت اور دہلی) سے بھی اس مردِ جلیل کے متعلق اطلاعات پہنچیں۔

ایک نوجوان کا جنازہ

ایک دن کراچی سے ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ انھیں مولانا غلام رسولؒ کے بارے میں بعض واقعات کا علم ہے۔ اس سے چند روز بعد وہ خود تشریف لے آئے اور فرمایا کہ انھوں نے کراچی کے ایک اخبار میں ان کے متعلق مضمون پڑھا تھا، وہ اخبار میں نے تلاش کیا، لیکن ملا نہیں، ملا تو بھیج دیا جائے گا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد کراچی سے جناب عرفان ملک صاحب کا خط بھی آیا اور مضمون بھی موصول ہوا۔ یہ مضمون کراچی کے روزنامہ ''امت'' میں چھپا ہے۔ مضمون نگار کا اسم گرامی عبدالرشید شاہد ہے۔ عرفان ملک صاحب نے 2۔نومبر 2010ء کو کراچی سے مضمون بھیجا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''مولانا غلام رسول کے متعلق یہ مضمون دو سال قبل روزنامہ ''امت'' میں شائع ہوا تھا۔ تلاش بسیار کے بعد آج اچانک مل گیا، جو پیش خدمت ہے۔'' اس مضمون میں ایک بڑا عجیب وغریب واقعہ درج ہے جو ایک زندہ نوجوان کا جنازہ پڑھانے کے

متعلق ہے۔ بعض لڑکوں نے ازراہ مذاق ایک نوجوان کو چار پائی پر لٹایا اور مولانا سے کہا کہ یہ ایک میت ہے، اس کا جنازہ پڑھا دیں۔ مولانا نے ان سے چند باتیں پوچھیں اور پھر جنازہ پڑھا دیا اور وہ شخص واقعتاً مر گیا۔

میں نے اس واقعہ کے متعلق مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کے پڑپوتے ملک عصمت اللہ سے ٹیلی فون پر بات کی تو انھوں نے بتایا کہ یہ واقعہ انھوں نے اپنے خاندان کے بعض بزرگوں سے سنا ہے۔

اب روزنامہ ''امت'' کراچی میں عبدالرشید شاہد کا تحریر کردہ واقعہ پڑھیے۔

وہ لکھتے ہیں کہ مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے توحید پر عمل اور اس کی تبلیغ کی وجہ سے کچھ لوگ ان کے خلاف ہو گئے تھے، کیوں کہ ان لوگوں کی مقبولیت میں کمی آرہی تھی، جو انھیں ناگوار گزرتی تھی۔ لیکن ان کی مخالفتوں اور باتوں سے بے نیاز ہو کر مولانا ممدوح اللہ کی وحدانیت کا درس دیتے اور خلق خدا کی رہنمائی فرماتے رہے۔

ایک دن مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کسی سفر سے واپس گاؤں آرہے تھے۔ مولانا کے مخالف چند نوجوان راستے میں کھڑے تھے۔ ان نوجوانوں کو شیطان نے بہکایا اور انھوں نے شرارت کے طور پر ایک لڑکے کو چار پائی پر لٹا کر اس کے اوپر چادر ڈال دی۔ یہ مولانا غلام رسول کے مخالفین کا ایک منصوبہ تھا، جس سے مولانا کو رسوا کرنا مقصود تھا۔ مولانا غلام رسول قریب پہنچے تو ان لڑکوں نے اپنے چہروں پر افسردگی طاری کر لی اور مولانا سے کہا کہ اس کا جنازہ پڑھا دیں۔

مولانا نے پوچھا: ''یہ کس کا جنازہ ہے''۔

لڑکوں نے جواب دیا: ''یہ فلاں زمیندار کا لڑکا ہے''۔

مولانا نے پوچھا: ''اس لڑکے کا باپ جنازے میں کیوں شریک نہیں ہے؟''

لڑکوں نے جواب دیا: ''وہ اپنے بیٹے کے غم میں ہوش وحواس کھو چکا ہے، اس لیے وہ جنازے میں نہیں آسکا۔''

لڑکے شرارت پر پوری طرح آمادہ تھے اور ہر سوال کا جواب دے رہے تھے۔

مولانا نے کہا: ''ٹھیک ہے میں جنازہ پڑھا دیتا ہوں لیکن اس کا جو نتیجہ نکلے گا، اس کی کوئی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوگی۔''

جنازہ پڑھا دیا گیا۔ لڑکے اب پوری طرح کھل کر سامنے آگئے تھے۔ ان کا مقصد مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کو رسوا کرنا تھا کہ دیکھو مولانا نے ایک زندہ شخص کا جنازہ پڑھا دیا۔ وہ ہنس رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ مولانا ان کی شکلیں دیکھ رہے تھے جو طنزیہ انداز میں مولانا کے سامنے انھیں رسوا کرنے کی غمازی کر رہی تھیں۔ ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر چارپائی پر لیٹے لڑکے کے اوپر سے چادر ہٹا دی اور بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی اور کہا اب اٹھ جاؤ۔ لیکن لڑکا ٹس سے مس نہ ہوا۔ لڑکوں کے چہروں سے ہنسی غائب ہوگئی اور اس کی جگہ تشویش نے لے لی۔ سب لڑکے اس نئی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ انھوں نے لڑکے کو اٹھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ تو ہلنے جلنے سے قاصر تھا۔ ایک لڑکا بھاگا اور حکیم صاحب کو لے آیا۔ حکیم نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ ''لڑکے کی موت واقع ہو چکی ہے۔'' ایک کہرام مچ گیا۔ لڑکے کے ماں باپ بھی آگئے اور مذاق نے سنگین صورت حال اختیار کر لی۔

والدین نے مولانا غلام رسول سے کہا: ''آپ نے جنازہ کیوں پڑھایا؟''

انھوں نے جواب دیا: ''مجھے ایک میت کا جنازہ پڑھانے کے لیے کہا گیا تھا، سو میں نے پڑھا دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ چادر کے نیچے ایک میت رکھی ہے یا کوئی زندہ شخص ہے، اس میں میرا کوئی قصور نہیں، اس کا جنازہ ہو چکا ہے۔ بہتر ہے کہ اسے جلد از جلد دفنا دو۔''

بات تھانے کچہری تک جا پہنچی۔ کچھ عرصہ مقدمہ چلتا رہا۔ بالآخر انگریز جج نے مولانا غلام رسولؒ کو بری کر دیا۔

مولانا غلام رسولؒ کی زبان میں بڑی تاثیر تھی۔ وہ ولی اللہ تھے۔ ان کی زبان سے ایک خاص کیفیت میں جو نکل جاتا وہ پورا ہو جاتا۔ اس طرح کے کئی واقعات ان سے وابستہ ہیں۔

عبدالرشید شاہد اس سے آگے لکھتے ہیں۔

مولانا غلام رسولؒ کی آخری آرام گاہ قلعہ اسلام ضلع گوجراں والا میں ہے۔ ان کی اولادیں اور خاندان کے لوگ ایک احاطے میں مدفون ہیں۔ خلق خدا ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوتی ہے۔ ان کے خاندان والوں نے ان کی یاد میں ''ویلفیئر سوسائٹی مولانا غلام رسولؒ'' بنا دی ہے جس سے خدمت خلق کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

کرامات کے ظہور کی وجہ

مولانا غلام رسول سے بہ کثرت کرامات کا ظہور کیوں ہوا اور ان کی دعا دربار

خداوندی میں اتنی جلدی کیوں شرفِ قبولیت حاصل کرتی تھی؟ اس کے متعلق ان کے ایک شاگرد اور مرید مولوی قطب الدین بیان کرتے ہیں کہ ایک روز وہ مولانا کی خدمت میں حاضر تھے، عرض کیا:

''حضرت! آپ سے اس درجہ بہ کثرت کرامات کے صدور کا سبب کیا ہے؟ پہلے بھی بہت سے بزرگ ہو گزرے ہیں، اب بھی کئی متدین اور متقی لوگ موجود ہیں۔ بلا شبہ ان سے بھی کرامات کا ظہور ہوتا رہا ہے، لیکن اتنی کثرت سے نہیں، جتنا کہ آپ سے۔''

مولانا نے جواب دیا: ''جب سے مجھے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اس وقت سے کرامات ظہور میں آ رہی ہیں۔''

بے شک مولانا غلام رسول اپنے عہد کی عظیم شخصیت تھے۔ پیکرِ صالحیت اور سراپا تدین۔ انھوں نے جو مانگا اللہ نے دیا اور جس کی طرف نگاہ اٹھائی، وہ تقوے کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ وہ صحیح معنوں میں عالمِ باعمل تھے۔ کتاب و سنت کے شیدائی اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے دل و جان سے پابند۔ نیکی ان کا شعار تھا اور خیر ان کی پہچان۔ لوگوں سے ان کی وابستگی بھی اللہ کے لیے تھی اور ان سے انقطاع بھی اللہ کی خاطر تھا۔ انھوں نے زندگی کے ہر قدم میں دین کو دنیا پر ترجیح دی اور ہر معاملے میں رضائے الٰہی کو مقدم رکھا۔ وہ اسی دنیا کے باشندے تھے اور اسی زمین کی مٹی سے ان کا ہیولا بنایا گیا تھا، لیکن ان کی روحانیت کی پرواز بہت بلند تھی اور ان کا علمی مقام بڑا رفیع تھا۔ وہ گفتار کے ماحول میں رہتے تھے، لیکن کردار کی فضا ان کا مسکن تھا۔ وہ فرشتہ صفت انسان تھے اور اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت

گزاری ان کا معمول تھا۔ اللہ ان کی دعائیں قبول فرماتا اور ان کی التجاؤں کو شرفِ قبول بخشتا تھا۔ اس قسم کے پاکیزہ اوصاف لوگ ہمیشہ پیدا نہیں ہوتے ۔ ان کی پیدائش کا بھی شاید ایک دور اور ایک موسم ہوتا ہے۔

اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور وہ تا قیامِ قیامت اس کے سایۂ رحمت میں رہیں۔ آمین یا رب العالمین۔

انیسواں باب

مولانا غلام رسول کے چند معاصرین

معاصرین کا لفظ اصطلاح میں ان دو یا دو سے زیادہ افراد پر بولا جاتا ہے جو علم و عمل، درس وتدریس، تصنیف و تالیف، تقریر وخطابت یا کسی اور اہم معاملے میں ایک دوسرے کے برابر اور ہم پلہ ہوں اور ایک ہی زمانے سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایک دوسرے کی خدمات سے باخبر بھی ہوں۔ ان معنوں میں مولانا غلام رسول کے معاصرین بہت بڑی تعداد میں تھے۔ کچھ حضرات نے طالب علمی کے دور میں ان کی شراکت میں علم حاصل کیا۔ بعض لوگوں نے ان کی رفاقت میں تقریری و خطابتی خدمات سرانجام دیں۔ کچھ عالی بخت بزرگوں نے ان کی معیت میں تھوڑے یا زیادہ عرصے کے لیے سلسلۂ تدریس جاری رکھا۔ جس زمانے میں وہ موضع بگہ کے اساتذہ کرام (مولانا غلام محی الدین بگوی اور مولانا احمد الدین بگوی) سے تحصیل علم میں مشغول تھے، اس زمانے میں یقیناً بعض ایسے طلبا ان کے ہم جماعت یا ہم درس ہوں گے، جنھوں نے آگے چل کر کسی نہ کسی علمی شعبے میں خدمات سرانجام دی ہوں گی۔ دہلی کے دورِ طالب علمی میں بھی ایسے حضرات سے ان کا رابطہ رہا ہوگا جنھوں نے تعلیم

سے فراغت کے بعد میدانِ عمل میں تگ و تاز کی، لیکن ہمیں اس سلسلے کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ اس کتاب میں یہ ہمارا اصل موضوع نہیں ہے۔ بس چلتے چلتے اس کی طرف چند اشارے کرنا مقصود ہے۔ البتہ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔

مولانا نے ایک خاص انداز سے سلسلۂ خدمتِ دین جاری رکھا۔ نہ کسی کی مخالفت کو کوئی اہمیت دی اور نہ شہروں اور قصبوں میں جا کر اپنے عہد کے اہل علم سے ملاقات کرنے کی زیادہ ضرورت محسوس کی۔ وہ گاؤں میں رہتے تھے اور دین کی تبلیغ ان کا وظیفۂ حیات تھا، جو اس ماحول اور حالات کے مطابق کامیابی سے جاری تھا۔

ان کا زیادہ تعلق غزنوی علماء سے رہا۔ موضع کوٹھا میں سید امیر صاحب کے دربارِ صالحیت میں حضرت سید عبداللہ غزنوی سے ان کے جو قلبی مراسم پیدا ہوئے، وہ دہلی جا کر اور مضبوط ہو گئے۔ پھر امرتسر بھی ان کی آمدورفت رہی، جس سے ان مراسم کو تقویت پہنچی۔ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے صاحب زادۂ عالی قدر حضرت الامام عبدالجبار غزنوی سے بھی ان کے تعلقات استوار ہوئے اور دونوں نے مل کر حضرت سید عبداللہ غزنوی کی سوانح عمری لکھی۔ مولانا سید محمد غزنوی اور سید عبداللہ بن عبداللہ غزنوی سے بھی سلسلۂ مراسم بڑھا۔ امرتسر ہی میں ان کی ملاقات حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے ہوئی۔ بہر حال آئندہ سطور میں ان کے چند معاصرین کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

① حافظ عبدالمنان وزیر آبادی

سب سے پہلے حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کا ذکر خیر ملاحظہ فرمایے، جن سے مولانا غلام رسول کے فرزندانِ گرامی (مولانا عبدالقادر اور مولانا عبدالعزیز) نے تعلیم حاصل کی۔ حافظ صاحب کے مفصل حالات تو ان شاء اللہ بشرط زندگی ''چمنستان حدیث'' میں بیان کیے جائیں گے، لیکن یہاں اختصار کے ساتھ ان سے متعلق وہ واقعات بیان کیے جاتے ہیں جو انھوں نے خود بیان کیے اور ان کے شاگرد مولانا سلطان احمد (ساکن نت کلاں) نے انھیں پنجابی نظم میں منتقل کیا۔

مولانا غلام رسول قلعوی کی طرح حافظ عبدالمنان بھی اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ موضع کرولی تحصیل پنڈ دادن خاں ضلع جہلم میں 1267ھ (1851ء) کو پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر ہوئی تو سکول میں داخل کرادیے گئے۔ سکول میں دوسرا سال تھا اور عمر نو سال کی تھی کہ آنکھوں سے پانی اترنا شروع ہوا، جسے مرضِ ''نزول الماء'' کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں نظر بند ہوگئی۔ بارہ سال کی عمر ہوئی تو والدہ وفات پاگئیں۔ اب وہ حصول علم کے لیے گھر سے نکلے اور دریائے جہلم کے کنارے ایک گاؤں کا نام احمد آباد ہے، وہاں چلے گئے۔ اس گاؤں میں مولانا قادر بخش سے علم صرف کی دو ابتدائی کتابیں (صرف بہائی اور صرف میر) پڑھیں۔ احمد آباد سے بھلوال کا قصد کیا۔ وہاں سید فاضل شاہ سے فقہ کی کنز الدقائق اور قدوری پڑھیں۔ وہاں سے موضع سروچہ پہنچے۔ سروچہ میں مولانا برہان الدین حطاروی سے مراح الارواح، شرح مائۃ عامل، ہدایت النحو، کافیہ، شافیہ اور شرح ملا جامی پڑھیں۔ علم منطق کے چند رسالے بھی ان سے پڑھے۔ اس کے بعد ضلع بنوں کے موضع ''چکی شیخ'' کو روانہ ہوئے۔

وہاں مولانا قل احمد (یا گل احمد) سے ملا حسن اور خیالی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ نابینا ہونے کے باوجود پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے معقولات کی تقریباً تمام درسی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ یہ ان کی بے پناہ ذہانت کی دلیل ہے۔

اس کے بعد ان کے دل میں حج بیت اللہ کے شوق نے کروٹ لی۔ اب وہ کالا باغ تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں اس نواح کے لوگ کالا باغ سے بذریعہ کشتی کراچی جایا کرتے تھے۔ حافظ صاحب کا بھی یہی ارادہ تھا۔ کالا باغ وہ دو مہینے ایک مسجد میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں ایک دن صبح کے وقت وضو کے لیے دریا پر گئے تو پاؤں پھسل گیا اور دریا کا پانی انھیں بہا کر لے گیا۔ آگے چل کر پانی نے ان کو کنارے پر پھینک دیا۔ کچھ ہوش آیا اور اٹھ کر روانہ ہوئے تو مرغ کی آواز کانوں میں پڑی۔ خیال گزرا یہاں کوئی بستی ہے، جہاں سے مرغ کی آواز آرہی ہے۔ تھوڑا سا آگے بڑھے تو ایک دیوار سے ٹکرائے۔ حسنِ اتفاق سے یہ اسی مسجد کی دیوار تھی، جس میں وہ قیام فرماتے اور جس سے نکل کر دریا پر وضو کرنے گئے تھے۔

دو مہینے کے بعد وہاں سے بذریعہ کشتی سندھ کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈیرہ اسماعیل خاں سے تقریباً پچاس میل دور تھے کہ کشتی بھنور میں پھنس گئی۔ حافظ صاحب نے دعا کی یا اللہ ہم لوگوں کو اس مشکل سے نجات دلا۔ یہ دعا سن کر ایک پشاوری پٹھان نے انھیں چپت ماری اور کہا: ایسے موقع پر پیر صاحب کو پکارنا چاہیے۔ یہ اللہ کے بس کا کام نہیں، پیر کا کام ہے۔ (نعوذ باللہ)۔ بہرکیف اللہ تعالیٰ نے کشتی کو بھنور سے نکال دیا اور وہ بخیر وعافیت سندھ پہنچ گئے۔ وہاں شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے ایک بزرگ پیر محفوظ اللہ صاحب فروکش تھے۔ کچھ دن ان کے ہاں قیام رہا۔

پیر محفوظ اللہ صاحب نے اپنے بیٹوں کی تعلیم کے لیے ایک عالم کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ واقعی عالم دین تھے۔ لیکن ایک دن علم نحو کی کتاب کافیہ پڑھا رہے تھے کہ ایک عبارت کی غلط تشریح کی۔ حافظ صاحب نے یہ غلطی سنی تو ان سے کوئی نحوی سوال کیا، مگر وہ صحیح جواب نہ دے سکے۔ پیر صاحب بھی وہیں تھے۔ انھوں نے حافظ صاحب سے کہا کہ بچوں کو یہ سبق آپ پڑھائیں۔ حافظ صاحب کے طریق تدریس پر پیر صاحب بہت خوش ہوئے اور تعجب بھی کیا کہ اس چھوٹی عمر میں نابینا ہونے کے باوجود اللہ نے ان کو بڑی قابلیت سے نوازا ہے۔ اب پیر محفوظ اللہ صاحب نے حافظ صاحب کو اپنے بیٹوں کا باقاعدہ معلم مقرر کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد پیر صاحب انھیں میر مراد علی والی خیر پور کے پاس لے گئے۔ ان کے دربار سے معقولات کے ایک عالم مولوی عبداللہ کشمیری وابستہ تھے جو شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے حافظ صاحب سے امتحاناً چند سوالات پوچھے۔ حافظ صاحب نے ان کے صحیح جواب دیے، جس سے وہ بہت خوش ہوئے۔ نواب میر مراد علی خاں علم اور علما دوست تھے، اس لیے وہ حافظ صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ انھوں نے سواری کے لیے حافظ صاحب کو ایک اونٹنی دی اور ایک یا دو خادم ان کے لیے مقرر کر دیے۔ حافظ صاحب ایک سال ان کے پاس رہے۔ پھر ان سے حج بیت اللہ کے لیے جانے کی اجازت طلب کی۔ نواب صاحب نے اس نیک کام کے لیے حافظ صاحب کو پانچ سو روپے اور ایک بیش قیمت خلعت دے کر روانہ کیا اور وہ کراچی جا کر بحری جہاز پر سوار ہو گئے۔ یہ جہاز کراچی سے بمبئی جا رہا تھا اور بمبئی سے دوسرے جہاز پر سوار ہو کر حافظ صاحب جدے جانا چاہتے تھے۔

جہاز میں ملتان کا رہنے والا ایک شخص جس کا نام احمد علی تھا، حافظ صاحب کا رفیقِ سفر بن گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ان کے پاس پانچ سو روپے کی رقم ہے۔ اس نے یہ روپے جہاز ہی میں چوری کر لیے۔ جہاز بمبئی پہنچا تو حافظ صاحب نے اس کی اطلاع پولیس والوں کو دی۔ پولیس والوں نے الٹا حافظ صاحب کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔ تین دن وہ حوالات میں رہے۔ چوتھی رات نماز تہجد کے لیے اٹھے تو نہایت غم ناک اور افسردہ لہجے میں عربی کا یہ شعر پڑھا۔

صبت علی مصائب لو انہا
صبت علی الایام صرن لیا لیا

”مجھ پر ایسی مصیبتیں آپڑی ہیں کہ اگر وہ دنوں پر آتیں تو دن راتیں ہوجاتے۔“

حوالات کے محافظ نے یہ شعر سنا تو نہایت متاثر ہوا۔ اس نے حافظ صاحب سے اصل بات پوچھی تو حافظ صاحب نے اسے حقیقت بتائی اور اس نے حافظ صاحب کو بے گناہ سمجھ کر حوالات سے نکال دیا۔

اب حافظ صاحب بمبئی سے چلے اور شہر سورت کو روانہ ہوگئے۔ راستے میں ایک اور شہر آیا جس کا نام ”دمن“ تھا، وہاں رات بسر کی۔ صبح کو آگے چل پڑے اور اکلہڑہ کے مقام پر پہنچے۔ وہ شیعہ حضرات کا مسکن تھا۔ انھیں پتا چلا کہ حافظ صاحب سنی ہیں تو انھیں وہاں رات نہیں رہنے دیا، گاؤں سے نکال دیا۔ حافظ صاحب کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ برسات کا موسم تھا اور بونداباندی ہورہی تھی۔ یہ تینوں شہر سے ایک میل باہر ایک سنسان سڑک پر لیٹ گئے۔ رات کو ریاست سکھ چین کا نواب اپنے قافلے

کے ساتھ ادھر سے گزر رہا تھا کہ اندھیری رات میں ان میں سے ایک شخص دوسرے کے پاؤں کی ٹھوکر سے گر پڑا۔ وہاں حافظ صاحب اور ان کے ساتھی لیٹے ہوئے تھے۔ قافلہ والوں نے ان کو چور سمجھا۔ شور ہوا تو نواب صاحب بھی آ گئے اور وہ لوگ حافظ صاحب اور ان کے دونوں ساتھیوں کو پکڑ کر لے گئے۔ صبح کو نواب صاحب نے حکم دیا کہ رات کو جو تین آدمی گرفتار کیے گئے تھے، انھیں پیش کیا جائے۔ جب یہ گرفتار شدگان نواب کی کچہری میں پہنچے تو وہاں ایک عالم وعظ کر رہا تھا۔ اثنائے وعظ میں اس کی ایک نحوی غلطی پر حافظ صاحب نے اسے ٹوکا۔ نواب کو جب پتا چلا کہ یہ شخص نابینا ہونے کے باوصف عالم فاضل ہے تو ان تینوں کو چھوڑ دیا اور پچاس روپے سفر خرچ دے کر انھیں احترام کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ تینوں سورت شہر پہنچ گئے۔

سورت میں ان کی بعض اہل علم سے ملاقات ہوئی۔ ایک دن مسجد میں ایک عالم سے کسی مسئلے کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ انھیں پتا چلا حافظ صاحب غیر مقلد ہیں۔ انھوں نے ان کو مسجد سے نکال دیا۔ چنانچہ وہ وہاں سے ایک بستی میں آ گئے، جس کا نام ”راندھیر“ ہے۔ راندھیر کے ایک سیٹھ اسماعیل نے مدرسہ جاری کیا تھا۔ حافظ صاحب اس مدرسے میں آ گئے۔ سیٹھ صاحب نے بھی انھیں غیر مقلد ہونے کی وجہ سے مدرسے سے نکال دیا۔ اب وہ سمندر کے کنارے ایک گاؤں میں چلے گئے، جس کا نام ”بھاؤنگر“ تھا۔ وہاں وہ ایک مسجد میں ٹھہرے۔ یہ جمعے کا دن تھا۔ حافظ صاحب نے جمعہ پڑھایا۔ ان کی تقریر سے لوگ بہت خوش ہوئے اور بڑی عزت سے پیش آئے، لیکن ان کی غیر مقلدیت نے یہاں بھی اپنا ہاتھ دکھایا اور لوگوں نے ان کو مسجد سے نکال دیا۔ لیکن ایک حجام جس کا نام عثمان تھا، انھیں اپنے گھر لے گیا اور ایک

مہینہ ان کو اپنے پاس رکھا۔

اس بستی میں بچھو بہت تھے جو سخت زہریلے تھے اور بڑے بڑے تھے، جسے کاٹتے وہ مشکل ہی سے زندہ رہ سکتا تھا۔ ایک شخص کو بچھو نے کاٹا۔ اسے حافظ صاحب کے پاس لایا گیا۔ انھوں نے بسم اللہ پڑھ کر لب لگایا اور اس کا درد ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سب لوگ ان کا احترام کرنے لگے۔

ایک دن حافظ صاحب صبح کی نماز ایک ندی کنارے پڑھا رہے تھے۔ ان کے دو ساتھی ان کے مقتدی تھے۔ نماز میں وہ اس خوش الحانی سے قرآن پڑھ رہے تھے کہ بہت سے لوگ وضو کر کے نماز میں شامل ہو گئے۔ سلام پھیرا تو بتایا گیا کہ مقتدیوں کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔ یہاں اللہ نے حافظ صاحب کو بڑی تکریم سے نوازا۔ ایک دن یہاں کے رئیس نے ان سے کہا کہ اس کا ماموں عربی پڑھنا چاہتا ہے، وہ اسے عربی پڑھا دیا کریں، لیکن حافظ صاحب نے کسی وجہ سے انکار کر دیا۔ وہ رئیس ان سے خفا ہو گیا اور انھیں وہاں سے نکال دیا۔ ابھی وہ دور نہیں گئے تھے کہ کچھ لوگ ان کے پیچھے دوڑے جو ایک شخص کو ڈولی میں اٹھائے ہوئے لا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ اسے بچھو نے کاٹا ہے۔ حافظ صاحب نے اسے دم کیا اور وہ اللہ کے فضل سے تندرست ہو گیا۔ پھر وہ لوگ منت سماجت کر کے حافظ صاحب کو واپس لے گئے۔ اب یہ لوگ حافظ صاحب کا بے حد احترام کرنے لگے۔ ان کے پاس کافی روپے بھی جمع ہو گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے وہاں سے حج بیت اللہ کا قصد کیا۔

سورت کا ایک تاجر اللہ رکھا بھی حافظ صاحب کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ دونوں سورت سے بمبئی پہنچے اور بمبئی سے بحری جہاز پر سوار ہوئے۔ گیارھویں

دن جدہ کی بندرگاہ پر اترے۔ وہاں سے دو دن میں مکہ مکرمہ پہنچے۔ فریضہ حج ادا کر کے مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ دس دن وہاں رہے۔ پھر واپس مکہ مکرمہ آئے۔ مکہ مکرمہ سے جدے آئے۔ جدے سے جہاز پر سوار ہوتے وقت حافظ صاحب سمندر میں گر گئے۔ ملاحوں نے جلدی سے پکڑ کر انھیں سمندر سے باہر نکالا اور جہاز پر سوار کیا۔ چند روز میں بمبئی پہنچ گئے۔ اس وقت حافظ صاحب کی عمر سترہ (17) برس کی تھی۔

بمبئی میں ایک شخص مولوی نظام الدین تھے جو مدرسہ حمیدیہ کے بانی مولانا حمید الدین کے بھائی تھے۔ نہایت مخلص اور ملنسار آدمی۔ حافظ صاحب کا قیام انہی مولوی نظام الدین کے پاس رہا۔ بمبئی سے حیدرآباد (دکن) چلے گئے۔ وہاں وہ سر سالار جنگ کے مہمان تھے۔ چند روز کے بعد حیدرآباد سے مدراس کو روانہ ہوئے۔ مدراس سے مالابار کا عزم کیا۔ مالابار میں وہ سیٹھ ابوبکر کے مکان پر ٹھہرے۔ وہاں کے لوگ زیادہ تر چاول کھاتے تھے، لیکن حافظ صاحب کے لیے گندم کی روٹی پکائی جاتی تھی۔ ایک روز حافظ صاحب بالاخانے میں بیٹھے تھے کہ بھیک مانگنے والے دو پنجابی آئے جو پنجابی کے شعر پڑھ کر مانگ رہے تھے۔ حافظ صاحب نے ان کو اپنے پاس بلایا اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ سیٹھ ابوبکر نے محسوس کیا کہ حافظ صاحب کا دل اپنے وطن پنجاب جانے کے لیے بے قرار ہے۔ انھوں نے بڑے احترام کے ساتھ انھیں روانہ کیا۔

مدراس میں حافظ صاحب کی متعدد علمائے کرام سے ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک عالم دیں مولانا عبدالشکور محلّہ مچھلی بندر والے تھے جو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن پانی پتی، مولانا بشارت اللہ کابلی، مولانا

ہدایت اللہ مدراسی اور مولانا عبدالحق بنارسی سے ملاقات کا موقع ملا۔ مولانا عبدالحق بنارسی اپنے عہد کے بہت بڑے عالم تھے اور علامہ محمد بن علی شوکانی کے شاگرد تھے۔ حافظ صاحب نے ان سے استفادہ کیا اور سند لی۔ انھوں نے حضرت نواب صدیق حسن خاں کے نام ایک خط لکھ کر حافظ صاحب کو دیا کہ انھیں بھوپال کے مدرسے میں بہ طور معلم مقرر کیا جائے۔ حافظ صاحب سے انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ جو علوم آپ نے پڑھے ہیں، وہ اصل مقصود نہیں، اصل مقصود علمِ حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ترین تعلق علمِ حدیث ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

ایک دن حافظ صاحب ایک مسجد میں بیٹھے تھے، جہاں مولانا محمد سہارن پوری طلبا کو پڑھاتے تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ مسجد کی چھت سے ایک عجیب سی شکل کا جانور آیا، جس کا طول وعرض انگوٹھے کے برابر تھا۔ اس کا تعاقب کیا گیا تو وہ غائب ہوگیا۔ مولانا محمد سہارن پوری نے فرمایا کہ یہ جن ہے جو کبھی کبھی مسائل دریافت کرنے کے لیے آتا ہے۔ آپ لوگوں کا شور سن کر غائب ہوگیا۔ اس کا نام عبدالجبار ہے اور جبل عرفات میں رہتا ہے۔ مجھ سے اس نے تین مرتبہ صحیح بخاری پڑھی ہے۔ جنات کے بہت سے مقدمات کے تصفیے کے لیے بھی یہ کئی بار آیا ہے۔

بمبئی میں حافظ صاحب کی ملاقات ایک شخص سلیمان شریف یمنی سے ہوئی۔ اسے پوری صحیح بخاری حفظ تھی۔ حافظ صاحب کو مولانا عبدالحق بنارسی نے علم حدیث پڑھنے کی تاکید فرمائی تھی۔ اس کے بعد ان کی ملاقات چند دیگر علماے حدیث سے ہوئی تو علم حدیث پڑھنے کا شوق مزید بڑھ گیا۔ مولانا سلیمان یمنی نے حافظ صاحب کو حدیث کی کتاب مشارق الانوار دی، جو دو ہزار سے زیادہ احادیث کا مجموعہ ہے۔ حافظ صاحب

نے اسے اکتالیس روز میں حفظ کرلیا، حالاں کہ وہ اسے حفظ کرنے پر روزانہ ایک گھنٹا صَرف کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے صرف اکتالیس گھنٹوں میں اس ضخیم کتاب کو زبانی یاد کرلیا۔

دورانِ حفظ میں حافظ صاحب کو تین مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لب مبارک ان کے منہ میں ڈالا۔ دوسری مرتبہ انھیں اپنے سینۂ بابرکت سے لگایا۔ تیسری مرتبہ زیارت کا سبب یہ ہوا کہ حافظ صاحب نے کسی معاملے میں ایک نومسلم کو ڈانٹا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں فرمایا:

«فلا تغضب عليه وارفق به فانه حديث عهد بجاهلية»

''اس پر ناراض نہ ہو، اس سے نرمی کا برتاؤ کرو، کیوں کہ یہ ابھی نیا نیا دائرۂ جاہلیت سے نکلا ہے۔''

علم حدیث حاصل کرنے کے شوق میں حافظ صاحب جونا گڑھ میں مولانا سلیمان جوناگڑھی کی خدمت میں گئے۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ کچھ عرصہ وہاں رہے اور مولانا سلیمان سے استفادہ کیا۔ پھر وہاں سے رخصت ہوگئے۔ اس وقت یہ تین آدمی تھے۔ سومنات کے قریب ایک جگہ ''کلاں پور'' ہے۔ وہاں شہر کے باہر ایک بہت بڑے گنبد والی مسجد تھی۔ رات کو یہ تینوں اس مسجد میں پہنچے تو ساتھیوں نے دیکھا کہ ایک بزرگ جو مسجد کے گنبد جتنے ہی لمبے ہیں، سفید چادر پر نماز پڑھ رہے ہیں۔ حافظ صاحب اس بزرگ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کے دونوں رفقائے سفر خوف زدہ ہوگئے اور انھوں نے وہاں سے چلنے پر اصرار کیا۔ حافظ صاحب کو ان کا

ساتھ دینا پڑا اور وہ اس مسجد میں رات نہیں رہے اور چل پڑے۔

اس کے بعد بذریعہ بحری جہاز بمبئی آئے۔ وہاں ایک عرب عالم دین سے ملاقات ہوئی۔ وہ تاجر تھا اور اس کا اپنا بحری جہاز تھا۔ اس نے حافظ صاحب سے عرب جانے کے لیے کہا۔ حافظ صاحب تیار ہو گئے، لیکن اس عرب عالم کو جہاز کے لیے کسی اور جگہ کا سامان مل گیا جسے لاد کر اس نے ادھر کا رخ کر لیا۔ مگر حافظ صاحب بمبئی ہی میں رہے اور محلّہ ناگ پاڑہ کی ایک مسجد میں درس دینے اور بچوں کو قرآن پڑھانے لگے۔

ایک دن حافظ صاحب کے ایک بنگالی شاگرد نے ان سے پوچھا کہ رات آپ کے پاس کون عورت آئی تھی؟ حافظ صاحب نے جواب دیا مجھے کسی عورت کے آنے کا پتا نہیں۔ اس نے کہا آپ کی چار پائی پر ایک عورت کی انگیا پڑی ہے۔ حافظ صاحب نے وہ انگیا قبضے میں کی اور اسے فروخت کرنے بازار گئے تو دکان دار نے کہا یہ مالا بار کے علاقے کی بہت قیمتی اور بڑھیا انگیا ہے۔ دکان دار نے اس کے دس روپے دیے اور حافظ صاحب نے ان دس روپے سے تفسیر معالم التنزیل خریدی۔

انگیا کا واقعہ حافظ صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آدھی رات کو انھیں رفعِ حاجت کے لیے اٹھنا پڑا۔ جب وہ بیت الخلا کی طرف جا رہے تھے تو ان کے کندھے سے کسی کا کندھا ٹکرایا۔ دو تین مرتبہ اسی طرح ہوا۔ وہ حیران تھے کہ یہ کون شخص ہے۔ جب بیت الخلا میں گئے تو کسی نے باہر سے دروازے کو کنڈی لگا دی۔ اندر سے انھوں نے کنڈی کھولنے کے لیے آواز دی تو کسی عورت کے ہنسنے کی آواز آئی اور کنڈی کھول دی گئی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اس کا دروازہ کھولنے لگے تو اندر سے کنڈی لگا دی گئی۔ کنڈی کھولنے کے لیے کہا تو عورت کے ہنسنے کی آواز آئی اور کنڈی

کھل گئی۔ جب وہ لیٹے تو وہ ان کی ٹانگیں دابنے لگی، لیکن ہاتھوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ موجود نہ تھا۔ دراصل وہ جنات میں سے تھی اور جاتے وقت انگیا چھوڑ گئی۔

ان دنوں حافظ صاحب بمبئی کے مختلف علاقوں میں وعظ کیا کرتے تھے۔ گوجراں والا کے مولانا علاء الدین بھی وہیں تھے، جو مولانا غلام رسول قلعوی کے شاگرد تھے۔ وہ بھی وعظ فرمایا کرتے تھے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں مجھے کچھ فخر سا ہوگیا تھا کہ میں بہت بڑا عالم ہوں۔ چنانچہ ایک دن ان سے ایک شخص نے کہا کہ حافظ صاحب کچھ اور علم پڑھ لو تو فرمایا میں کافی کچھ پڑھ چکا ہوں۔ دوسرے دن وہی شخص اصول فقہ کی ابتدائی کتاب اصول شاشی لایا اور کہا کہ یہ کتاب وہ انھیں پڑھا دیا کریں۔ حافظ صاحب نے اسے پڑھانا شروع کردیا۔ وہ دورانِ سبق میں کسی مسئلے کے متعلق سوال کرتا اور حافظ صاحب اس کا جواب دیتے۔ ایک دن اس نے کچھ ایسے سوال کیے کہ حافظ صاحب ان کا جواب نہ دے سکے۔ اب حافظ صاحب سے اس نے کہا کہ آپ کے پڑھنے کا وقت ہے، کچھ اور پڑھ لو۔

اس شخص کے کہنے سے حافظ صاحب کو اپنی علمی کمی کا احساس ہوا تو مزید تعلیم کے لیے وہ دہلی کو روانہ ہوئے۔ راستے میں ناگ پور شہر آیا، دو مہینے وہاں رہے اور وعظوں کا سلسلہ شروع کردیا۔ بڑی عزت افزائی ہوئی۔ ان کے وعظ کے دوران ہی میں ایک ہندو پہلوان نے قبولِ اسلام کا اعلان کیا۔ ناگ پور سے چلے تو راستے میں ایک جگہ رات گزاری۔ وہاں ایک لمبے بالوں والے شخص نے ان کے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ حافظ صاحب نے اسے پکڑ لیا اور اپنے ساتھی کو جگایا۔ اس نے اسی شخص کی پگڑی سے اس کو باندھ دیا۔ اس سے بار بار پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں کے رہنے والے ہو؟

لیکن نہ اس نے کسی سوال کا جواب دیا اور نہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ یہ اسی طرح اسے بندھا ہوا چھوڑ کر اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔

حافظ صاحب کی اگلی منزل جبل پور تھی۔ وہاں ایک عالم مولانا نصر اللہ صاحب قیام فرما تھے۔ کچھ دن ان کے پاس رہے۔

جبل پور سے بھوپال کو روانہ ہوئے۔ بھوپال کا معاملہ یہ تھا کہ کوئی شخص ٹکٹ کے بغیر شہر میں نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ حافظ صاحب کئی دن شہر سے باہر ایک سرائے میں مقیم رہے۔ پھر کسی طرح شہر میں چلے گئے۔ وہاں ایک بہت بڑی مسجد تھی، جس میں مولانا عبدالجبار ناگ پوری ترجمۂ قرآن پڑھاتے تھے اور طلبا خاصی تعداد میں ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایک روز حافظ صاحب کو علم نحو کے کسی مسئلے کے متعلق مولانا عبدالجبار سے بات کرنے کا موقع ملا تو انھیں پتا چلا کہ حافظ صاحب عالم دین ہیں، چنانچہ وہ انھیں ریاست بھوپال کے مدارالمہام (یا وزیراعظم) مولانا جمال الدین صاحب کے پاس لے گئے۔ گفتگو ہوئی تو وہ حافظ صاحب کی علمی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ پچیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور ایک آدمی خدمت کے لیے دیا۔ اس وقت بھوپال کو علما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ والیہ بھوپال بیگم شاہ جہان سے نواب صدیق حسن خاں کی شادی پر چند روز ہی گزرے تھے۔ مولانا عبدالحی بڈھانوی کے فرزند گرامی مفتی عبدالقیوم بھی وہیں تھے جو حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے داماد تھے۔ حافظ صاحب ایک سال بھوپال رہے۔ وہاں ان کی ملاقات نواب صدیق حسن خاں سے بھی ہوئی جنھوں نے ان سے بڑے احترام سے باتیں کیں۔

بھوپال سے حافظ صاحب دہلی کو روانہ ہوئے۔ دوران سفر کان پور پہنچے تو وہاں

مولانا شہید الدین صاحب سے ملے۔ انھوں نے حضرت میاں سید نذیر حسین کے نام سفارشی خط دیا۔

حافظ صاحب دہلی جا کر حضرت میاں صاحب کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے اور ان سے علمِ حدیث پڑھنے لگے۔ صحاح ستہ کی سند حافظ صاحب نے حضرت میاں صاحب سے حاصل کی۔

حصولِ سند کے بعد دہلی سے وطن کو روانہ ہوئے۔ راستے میں میرٹھ مولانا محمد قاسم صاحب سے ملے۔ ان کے پاس صحیح بخاری کا قلمی نسخہ تھا جو وہ لکھ کر علما کو عنایت فرماتے تھے۔ اس کے لیے حافظ صاحب نے حضرت میاں صاحب سے مولانا محمد قاسم کے نام سفارشی رقعہ لیا تھا۔ یہ رقعہ انھوں نے مولانا کو دیا اور انھیں صحیح بخاری کا قلمی نسخہ مل گیا۔

وہاں سے حافظ صاحب انبالے گئے اور انبالہ سے نابھہ پہنچے۔ وہاں ریاست نابھہ کے وکیل عبدالرحیم صاحب کے ہاں قیام رہا۔ کچھ دن گجرات (پنجاب) ٹھہرے۔ وہاں کے بعض علماء سے مسئلہ تقلید پر بحثیں ہوئیں۔ دہلی سے چل کر تین مہینے کے بعد وہ اپنے گاؤں موضع کرولی (ضلع جہلم) پہنچے۔ وہاں اس نواح کے اصحاب علم مولانا غلام نبی، مولانا قل احمد اور مولانا غلام حسین وغیرہ سے تقلید شخصی پر بالعموم سلسلۂ گفتگو جاری رہتا۔

کچھ دن وہ اپنے گاؤں رہے۔ پھر لاہور آئے اور ایک سال مسجد چینیاں والی میں درس دیتے رہے۔ لاہور سے امرتسر گئے۔ وہاں دو سال حضرت سید عبداللہ غزنوی کے حلقۂ درس میں شامل رہے۔ وہاں مولانا حبیب اللہ پشاوری اور قاری عبدالعلی سے بعض مسائل پر گفتگو رہتی تھی۔ وہیں مولانا غلام رسول قلعوی سے ملاقات ہوئی۔ حافظ

صاحب کے بقول ''وہ بہت متواضع اور متخشع تھے۔'' امرتسر میں ان کی بہت سے اہل علم بزرگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، جن میں مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی اور مولانا عبدالرحمٰن بنارسی شامل ہیں۔

حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے مولانا غلام رسول قلعوی کی وفات کے بعد خواب دیکھا کہ ''وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر میرے قریب آئے اور میرے منہ سے شہد کا چشمہ جاری ہوگیا، جس سے مولانا صاحب نے سیرابی حاصل کی لیکن ان کی پیاس نہ بجھی۔'' اس خواب سے حافظ صاحب پریشان تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی تعبیر کیا ہے۔ لیکن جلد ہی تعبیر سامنے آگئی۔ مولانا غلام رسول قلعوی کے دونوں ہاتھ جو انھوں نے حافظ صاحب کی طرف پھیلائے تھے، وہ دراصل ان کے دونوں صاحب زادے مولانا عبدالقادر اور مولانا عبدالعزیز تھے، جنھوں نے وزیر آباد جا کر حضرت حافظ صاحب سے تحصیل علم کا سلسلہ شروع کیا اور شہد سے مراد علم دین تھا، جس کے متعلق حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ''میں نے ایک دفعہ خواب میں مولانا سید نذیر حسین صاحب کو دیکھا کہ مجھے سخت پیاس لگی ہے اور میاں صاحب نے اپنا منہ میرے منہ پر رکھ دیا۔ ان کے منہ سے شہد کا چشمہ جاری ہوا اور میں اس سے سیراب ہوتا رہا۔''

حافظ صاحب فرماتے ہیں: انھی دنوں مجھے ایک اور خواب آیا۔ خواب سے پہلے ایک واقعہ سنیے! امرتسر میں ان دنوں مسئلۂ صفات باری پر مباحثے ہو رہے تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت انسان کے ساتھ بالذات ہوتی ہے اور بعض کہتے تھے کہ بالعلم ہوتی ہے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں: ''ایک دن میں نے خواب میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ ﷺ کے دائیں بائیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مولانا عبداللہ غزنوی اور سید نذیر حسین بیٹھے ہیں۔ میں نے معیت کے بارے میں پوچھا تو نبی ﷺ نے فرمایا: معیت سے مراد معیت بالعلم ہے، بالذات نہیں ہے۔"

امرتسر سے حافظ صاحب بمباں والا تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے وزیر آباد آئے اور وزیر آباد میں مدرسہ جاری کر کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ بیالیس برس وہاں خدمات سرانجام دیں۔ شروع شروع میں بہت تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں۔ پھر آہستہ آہستہ سب معاملات ٹھیک ہو گئے۔ 1907ء میں حافظ صاحب نے اپنی سوانح عمری خود لکھوائی اور یہ بھی لکھوایا کہ "تینتیس (33) سال میں ساٹھ مرتبہ صحاح ستہ پڑھا چکا ہوں۔" اس کے بعد نو سال زندہ رہے اور کتبِ حدیث باقاعدہ پڑھاتے رہے۔ ان سے بے شمار علما و طلبا نے تعلیم حاصل کی۔ ان حضرات میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا عطاء اللہ لکھوی، قاضی عبدالرحیم قاضی کوٹی، مولانا عبداللہ کھپیاں والی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، میاں محمد باقر، مولانا عبدالقادر قلعوی، مولانا عبدالعزیز قلعوی، شیخ احمد دمشقی (شامی) شیخ علی نجدی، مولانا عبداللہ یاغستانی، مولانا عبدالحمید سوہدروی، مولانا عبدالمجید سوہدروی، مولانا عمر دین وزیر آبادی اور دیگر لاتعداد لوگ شامل ہیں۔

حضرت حافظ صاحب کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ فجر کی نماز کے بعد قرآن کا ترجمہ پڑھاتے۔ اس کے بعد صحیح بخاری، صحیح مسلم اور حدیث کی دوسری کتابیں پڑھاتے۔ یہ

سلسلہ دوپہر تک چلتا۔ کھانا کھا کر ظہر کی نماز پڑھتے اور پھر عصر تک مختلف اسباق پڑھاتے۔ عصر کے بعد بھی تدریس ہوتی۔ کبھی کبھی تفسیر قرآن پڑھاتے۔

مغرب کے بعد مسجد میں وظائف واوراد کا سلسلہ چلتا۔ عشا کے قریب گھر جا کر کھانا کھاتے اور عشا کے بعد جلد سو جاتے۔

مشکوٰۃ شریف ہر طالب علم کو الگ الگ پڑھاتے۔ پھر حدیث کی دوسری کتابیں طلبا کی اکٹھی جماعت کو پڑھاتے۔ اکثر چھ مہینوں میں صحیح بخاری ختم کرا دیتے۔

16 / رمضان المبارک 1334ھ (18 / جولائی 1916ء) کو منگل کے روز غروبِ آفتاب سے قبل 67 برس عمر پا کر سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ عالم کبیر اور محدث جلیل مولانا غلام رسول قلعوی کے ہم عصر تھے اور دونوں ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے۔

حافظ صاحب کے حالات چوں کہ میرے نزدیک بہت دلچسپ ہیں، اس لیے میں نے ان کا ذکر خاصی تفصیل سے کیا ہے۔ ان شاء اللہ کتاب ''چمنستانِ حدیث'' میں ان کے واقعاتِ حیات مزید تفصیل سے بیان کیے جائیں گے۔

اللھم اغفر لھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم

حضرت حافظ صاحب کی وفات کے بعد ان کے شاگرد مولانا سلطان احمد نے پنجابی نظم میں ان کے حالات لکھے تھے۔ اردو میں سب سے پہلے ان کے نواسے اور شاگرد مولانا عبدالمجید سوہدروی نے ان کے سوانح حیات تحریر فرمائے۔ پھر ملک عبدالرشید عراقی اور مولانا منیر احمد سلفی نے الگ الگ کتابی صورت میں ان کے تذکار

قلم بند کیے۔ پھر ایک کتاب جناب خواجہ عطاء الرحمٰن اختر ایم اے (گوجراں والا) نے لکھی۔ یہ کتاب 16۔30۔20 سائز کے اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے جس میں مولانا نور حسین گھر جاکھی، مولانا علاء الدین اور حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے سوانح حیات لکھے گئے ہیں۔ کم وبیش بیس سال پیشتر مجھے یہ چھوٹی سی کتاب میرے مرحوم دوست مولانا خالد گھر جاکھی نے عنایت کی تھی۔

② مولانا رحیم بخش لاہوری

مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ کے معاصرین میں مولانا رحیم بخش لاہوری کا نام نامی بھی شامل ہے۔ وہ دراصل ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ کے ایک گاؤں ''ملوال'' کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام عبداللہ تھا اور ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے گاؤں میں سید احمد شہید کی جماعت کے ایک فرد مولوی حیدر علی نے سکونت اختیار کر لی تھی، جن سے مولانا رحیم بخش کے بڑے بھائی حافظ محمد اسماعیل نے بیعت کی۔ خود مولانا رحیم بخش نے ابتدائی تعلیم انہی مولوی حیدر علی سے پائی۔ ملوال کے پٹھان مولوی حیدر علی کا بے حد احترام کرتے تھے۔ مولانا رحیم بخش فرماتے ہیں:

> ''میں نے ایسا کوئی عالم متبع سنت وشریعت نہیں دیکھا...... اس خاک سار پر مولوی صاحب کے بڑے احسان ہیں۔ جو کچھ میں نے پڑھا ہے، اس میں ان کی مدد رہی ہے۔ افغانانِ ملوال سلطان خاں صاحب، سکندر خاں صاحب، جمال الدین خاں صاحب آپ (مولوی حیدر علی) کی بڑی عزت کرتے۔ اس عاجز کے برادر حافظ محمد اسماعیل صاحب بجائے خلیفہ کے تھے''۔[1]

① سرگزشت مجاہدین تصنیف مولانا غلام رسول مہر ص 546 بحوالہ اسلام کی دسویں کتاب مصنفہ مولانا رحیم بخش ص252۔

ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا رحیم بخش گھر سے نکلے اور مختلف مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، جن میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا عبدالحق خیر آبادی، حضرت حافظ محمد لکھوی اور شیخ الکل میاں سید نذیر حسین دہلوی شامل ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور آئے اور پھر اسی شہر کو اپنا مسکن بنالیا، یہیں شادی کی اور لاہوری کی نسبت سے شہرت پائی۔ چینیاں والی مسجد کے امام و خطیب مقرر کیے گئے۔ یہاں انھوں نے ''اسلام کی کتاب'' چودہ حصوں میں مکمل کی۔ اسلام کی کتاب پہلا حصہ، اسلام کی کتاب دوسرا حصہ، اسلام کی کتاب تیسرا حصہ۔ اس طرح یہ سلسلہ چودہ حصوں تک چلتا ہے اور یہ بہت بڑی دینی خدمت ہے جو انھوں نے سرانجام دی۔ کسی زمانے میں یہ کتاب بہت پڑھی جاتی تھی۔ گھروں میں بچوں اور بچیوں کو باقاعدہ پڑھائی جاتی تھی۔ علماء بھی اس سے استفادہ کرتے اور تقریروں میں اس کے حوالے دیتے تھے۔

مولانا رحیم بخش لاہوری خاموش طبع، منکسر المزاج اور تہجد گزار تھے۔ مسلکی جھگڑوں سے دامن کشاں رہتے اور اپنی بات مثبت انداز میں کرتے۔ صبح و شام مسجد میں قرآن و حدیث کا درس دیتے اور طلبا ان سے تعلیم حاصل کرتے۔ کسی شاگرد سے کوئی کام کراتے تو اس کا معاوضہ ادا کرتے۔ صرف چالیس برس عمر پائی۔ 18 رصفر 1314ھ (29 رجولائی 1896ء) کو فوت ہوئے۔ ان کی وفات سے کئی سال بعد اس مسجد کی خطابت و امامت کے منصب پر مولانا عبدالواحد غزنوی کو فائز کیا گیا۔

مولانا رحیم بخش کی نرینہ اولاد میں سے ایک بیٹے مولانا عبدالرحیم تھے اور دوسرے مولوی عبدالرحمٰن تھے۔ عبدالرحمٰن نے اسلامیہ کالج میں ایف اے تک تعلیم پائی اور محکمۂ انہار میں ضلعدار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ افسوس ہے جوانی میں

وفات پا گئے۔

مولانا عبدالرحیم 1885ء میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے پوری مروجہ تعلیم حاصل کی۔ قرآن، حدیث اور تاریخ سے خاص طور پر شغف تھا۔ اپنے والد کی تصانیف اور دوسری دینی کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا، جس کا نام ''عبدالرحیم عبدالرحمٰن تاجران کتب لاہور'' رکھا۔ اس زمانے کے لاہور میں کتابوں کی اشاعت وتجارت کا مرکز کشمیری بازار تھا۔ یہ ادارہ بھی کشمیری بازار میں قائم کیا گیا تھا۔ پھر 1914ء کے آخر یا 1915ء کے شروع میں مولانا عبدالرحیم سرحد پار مرکزِ مجاہدین میں چلے گئے اور وہاں ان کا عرفی نام محمد بشیر رکھا گیا۔ اصل نام عبدالرحیم لوگوں کے ذہن سے نکل گیا اور وہ مولانا محمد بشیر کے نام سے مشہور ہو گئے۔ جماعت مجاہدین میں انھوں نے بہت کام کیا اور ان کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ اس مردِ مجاہد کو ایک شخص عبدالحلیم نے اواخر اکتوبر 1934ء کی رات کو مرکزِ مجاہدین چمرکنڈ میں شہید کر دیا تھا۔

مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری نے اپنی کتاب ''فیوض محمدیہ'' (از صفحہ 189 تا 191) میں مولانا غلام رسول قلعوی کی دو فارسی نظمیں درج کی ہیں جو انھوں نے مولانا رحیم بخش کی وفات پر لکھیں۔ یہ نظمیں مولانا رحیم بخش کی ''اسلام کی کتاب'' کے دسویں حصے سے نقل کی گئی ہیں۔ پہلی نظم حسب ذیل پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔

آن عالم علم دین برحق

فرماں بردار رب مطلق

آں فاضل متقن و موحد

گر دیدہ براستی موفق

ماحی البدعہ بقول الیق

حامی السنہ بلفظ اصدق
تفسیر وحدیث را مدرس
سابق بکمال بلکہ اسبق
بکشا د زباں بدرس و تدریس
بربستہ میاں بجل مُغلق
از لغو کلام کردہ تجرید
پوشیدہ ز زہد ورع یلمق
آں دافع شر شرک و الحاد
آں رافع ضرمن تزندق
بشاس وحلیم و نیک سیماء
خوش خلق وکریم طبق والیق
پاکیزہ لباس و پاک طینت
خوش صورت وخوب وضع وارشق
تصنیفا تش بخانہ دیں!
چوں نور چراغ دا دہ رونق
فیضش خانہ بخانہ در ملک
چوں پر تو مہر گشتہ مشرق
در مسجد چینی از امامت
دلہا کردہ بخود معلق

آوخ کہ بعمر کامرانی
عیشش شدہ ناگہاں معوق
اولاد وعیال او ازیں حال
در آتش غم شدند محرق
تاریخ وفات اوخرد خواند
ماواش جوار رحمت حق

(1314ھ)

ان اشعار میں مولانا رحیم بخش کی نیکی اور ان کے علم وعمل کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ فاضل، بزرگ، موحد، اللہ کے فرماں بردار تھے۔ نرم الفاظ میں بدعات کو ختم کرنے کا درس دیتے اور صحیح طریقے سے سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت فرماتے۔ تفسیر، حدیث اور تمام علوم دین کے مدرس تھے۔ مشکل مسائل کو آسان طریقے سے حل فرماتے۔ بے مقصد باتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے۔ شرک والحاد کے شر سے لوگوں کو بچانے کی کوشش فرماتے۔ حلیم الطبع، نیک سیرت، خوش خلق اور کریم النفس تھے۔ پاکیزہ لباس، پاک طینت، خوب صورت اور بہترین عادات کے مالک تھے۔ ان کی تصانیف دین کے سلسلے میں نورِ ہدایت ہیں۔ ہر گھر میں ان کا فیض پہنچا ہے اور سورج کی طرح ملک میں اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ چینیاں والی مسجد میں ان کی امامت کا سلسلہ جاری تھا اور لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچے جاتے تھے۔ اچانک ان کی کامیاب زندگی کا خاتمہ ہوگیا اور ان کی اولاد غم واندوہ میں ڈوب گئی۔ ان کی تاریخِ وفات ہے ماواش جوارِ رحمتِ حق (1314ھ)۔

یہ مولانا رحیم بخش کے متعلق مولانا غلام رسول قلعوی کی پہلی فارسی نظم کے پندرہ اشعار کا خلاصہ ہے۔

مولانا رحیم بخش لاہوری کے متعلق مولانا غلام رسول قلعوی کی دوسری فارسی نظم تیئیس (23) اشعار کی ہے جو حسب ذیل ہے۔

آن سراج منیرِ راہِ ہدیٰ
نور بخش سرای دین خدا
عالم با عمل نکو اخلاق
صاحب زہدو ورع حلم وحیاء
بر مصلائے مسجد چینی
فرض ہر پنج وقت کردہ ادا
بستہ عقدِ جماعتِ اسلام
بوجود مبارکش صد جا
در امام نماز و جمع کثیر
اقتداء کردہ صف بصف بقضا
بے گماں مسجد چینی مشہور
با مام چنیں بود زیبا
واعظ خوش بیاں کہ تقریرش
کردہ تاثیر تام در دلہا
بود پاکیزہ صورت وسیرت

روز و شب فیضِ بخشِ خلق خدا

درس تفسیر باحدیث ہمہ

کار اِو بود ہر صباح و مسا

واں تصانیف او کہ در دیں کرد

رونقِ دین فز و د د ر دنیا

قریہ وشہر ملک زیں فیضش

پُر شدہ ہمچو فیضِ مہرِ سما

ناگہاں عزم کرد راہِ سفر

سوئے دارالبقازِ دارِ فنا

از صفر بو دروزِ شانز دہم

کیں سفر پیش آمدش از قضا

عقد تسبیح آں جماعہ گسست

گم شد از درمیاں امام اورا

اہلِ دین را ازیں مصیبت سخت

دل شکستہ شدست وپشت دو تا

ایں زیاں را تدار کست محال

لیک رب قدیر بے ہمتا

از پئے ما تلافی مافات

می کند از کرم ہمیشہ عطا

چشم بر لطف او کہ روحش را
درمیاں بہشت بخشد جا
بنعیم قدیم حُور و قصور
دار دش خوش بخورمی ابدا
ہم امام چنیں بہ ایں مسجد
ساز داز فضلِ عام خود برپا
یاالٰہی بخاک او ہر دم
ابرِ رحمت ببار سرتا پا
نامِ او یا دمی کنم بدعاء
یاغفور ورحیم بخش اورا
بہر تاریخ وصلِ او ہاتف
گفت درمیغ رفت مہر ہدیٰ

(1314ء)

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ مولانا رحیم بخش لاہوری راہِ ہدایت کے روشن چراغ تھے۔ اللہ کے دین کا نور پھیلانے والے تھے۔ باعمل عالم، نیک خو، زہدو ورع کے اوصاف سے موصوف اور حلم وحیا کی نعمت سے مالا مال تھے۔ چینیاں والی مسجد کے پانچ وقت کی فرض نماز کے امام تھے۔ ان کی اقتدا میں کثیر تعداد میں صف بہ صف لوگ نماز ادا کرتے تھے۔ بے شک یہ مسجد بھی مسلمانوں میں مشہور تھی اور اس کے امام کو بھی (تقوے کی وجہ سے) شہرت حاصل تھی۔ وہ خوش بیان واعظ تھے۔ ان کی تقریر لوگوں

کے دلوں میں خاص اثر پیدا کرتی تھی۔ وہ پاکیزہ صورت اور پاکیزہ سیرت تھے۔ خلقِ خدا کو ان سے دن رات فیض حاصل ہوتا تھا۔ اس عالم دین کے صبح وشام تفسیر وحدیث کے درس میں صَرف ہوتے تھے۔ انھوں نے دینی تعلیم کو عام کرنے کے لیے جو کتابیں تصنیف کیں، ان سے دنیا میں اللہ کے دین کو ترقی ہوئی۔ ملک کے بلاد وقصبات اور دیہات کے لوگوں کو ان سے بڑا فیض پہنچا۔ اس عالم دین نے اچانک سفرِ آخرت کا عزم کیا اور اس دنیاے فانی سے عالم بقا کو روانہ ہوئے۔ ماہِ صفر کی اٹھارھویں تاریخ کو انھیں موت کا سفر پیش آیا۔ (ان کی موت سے) مسلمانوں کی جماعت کی تسبیح سے اس کا امام گم ہوگیا۔ اہل دین کے لیے یہ سخت تکلیف کا معاملہ ہے اور اس سے دل ٹوٹ گیا۔ بہ ظاہر اس نقصان کی تلافی محال معلوم ہوتی ہے، لیکن اللہ کی تقدیر بے مثال ہے۔ وہ اپنے بے پناہ کرم سے ہمیشہ نقصان کی تلافی کردیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس عالم دین پر لطف وکرم کی نظر فرمائے اور اسے بہشت میں جگہ عطا فرمائے۔ اپنی نعمت خاص سے اس کو حور وقصور سے نوازے اور بہترین مقام اس کا ٹھکانا ہو۔ اسی طرح اپنے فضل عام سے اس مسجد کا امام بھی عالی کردار ہو۔ اے اللہ! اس عالم دین کی قبر پر ہر وقت اپنی رحمت نازل فرما۔ میں اس کا نام اس دعا کے ساتھ یاد کرتا ہوں، یا غفور ورحیم اسے بخش دے۔

ان کی تاریخ وفات کے لیے ہاتف نے کہا: دریغ رفت مہر ہدیٰ (1314ھ)

③ امام سید عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ

مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ کے ایک معاصر حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی

تھے جو حضرت سید عبداللہ غزنوی کے فرزند عالی مرتبت تھے۔ مولانا غلام رسول اور حضرت امام صاحب دونوں نے حضرت سید عبداللہ صاحب کی سوانح عمری لکھی تھی۔ دونوں کے درمیان گہری الفت تھی۔ دونوں حضرت میاں صاحب کے شاگرد تھے اور ان سے سندِ حدیث لی تھی۔ حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی 1268ھ (1852ء) کو غزنی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد محترم حضرت عبداللہ صاحب سے اخذِ فیض کیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے بھائیوں مولانا سید محمد غزنوی اور مولانا سید احمد غزنوی سے حاصل کی۔ پھر دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت میاں سید نذیر حسین کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے اور ان سے کتب حدیث پڑھیں اور سند حاصل کی۔ نہایت ذہین تھے۔ ہر وقت مطالعہ کتب میں مصروف رہتے۔ زہد وعبادت میں بھی اللہ نے ان کو حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ صالح تریں باپ کے صالح تریں فرزند تھے۔ دنیا اور اہل دنیا سے اپنے آپ کو منقطع کر لیا تھا۔ بیس برس کی عمر میں علوم مرجبہ کی تعلیم سے فارغ ہو گئے تھے۔

افغانستان کے حکمرانوں نے جب کلمۂ حق بلند کرنے کے جرم میں حضرت سید عبداللہ غزنوی کو شدید سزائیں دیں اور جیل میں بند کیا تو مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کو بھی گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ ان حضرات کے لیے یہ نہایت آزمائش کا دور تھا، جس میں اللہ نے ثابت قدم رکھا۔ اس خاندان کے چھوٹے بڑے تمام مرد وزن اذیت کی مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے امرتسر آ گئے تھے۔ امرتسر میں انھوں نے جس محلے میں سکونت اختیار کی اسے محلّہ غزنویہ کہا جانے لگا، جو مسجد بنائی، وہ مسجد غزنویہ کے نام سے موسوم ہوئی اور جو مدرسہ قائم کیا، اس نے مدرسہ غزنویہ کے نام سے شہرت پائی۔ اس مدرسے میں حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی، مولانا

عبدالواحد غزنوی، مولانا عبدالرحیم غزنوی، مولانا عبدالغفور غزنوی، مولانا عبدالاول غزنوی، مولانا محمد داؤد غزنوی اور دیگر غزنوی اصحابِ علم سے بے شمار علما و طلبا نے تحصیل علم کی۔ تدریس کے علاوہ ان حضرات نے تصنیف و تالیف اور تراجم کے سلسلے میں بھی بے حد خدمات سرانجام دیں۔ مولانا غلام رسول قلعوی کے پاک باز معاصر مولانا سید عبدالجبار غزنوی نے 27۔ اگست 1913ء (25۔ رمضان 1331ھ) کو جمعتہ المبارک کے روز وفات پائی۔

حضرت مغفور و مرحوم کے شاگردوں کی وسیع جماعت میں ایک شاگرد مولانا عبدالکریم گرنتھی فیروز پوری تھے۔ وہ غزنوی علمائے کرام کے اتنے قریب تھے کہ "امین خاندانِ غزنویہ" کہلائے۔ پنجابی کے مشہور شاعر تھے۔ استاذِ عظیم المنزلت کی وفات کے بعد انھوں نے پنجابی میں ان کا مرثیہ لکھا جو نہایت دردناک تھا۔ دس بارہ صفحات کا یہ مرثیہ پورے خاندانِ غزنویہ کی علمی تاریخ ہے۔ کئی دفعہ چھپا اور کسی زمانے میں بہت پڑھا گیا۔ لوگ پڑھتے تھے اور روتے تھے۔ اس کتاب یا مرثیے کا نام تھا "جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی"۔ اس کے دو بند یہاں درج کیے جاتے ہیں

جاندیاں راہیاں کو لوں پُچھاں میں رو کے
ماہی دے گل ہنجو ہار پرو کے
دس تے جاناں ذرہ کول کھلو کے
ٹھیک تیار ہوگئی ساڈے سرکار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لوائی چھٹی آ گئی سرکار دی

حضرت امام سید عبدالجبار غزنوی کے بڑے فرزند اور جانشین مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے، اس مرثیے میں مولانا عبدالکریم گرنتھی فیروز پوری، مولانا داؤد غزنوی کے متعلق فرماتے ہیں۔

دو رِ داؤ دی کجھ قابلِ تسلی اے
سارے گھرانے دی ایہ پونی تے چھلی اے
ایھدی بدولت نہر علم دی چلی اے
عمر دراز قومی خدمت گزار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی

مولانا سید داؤد غزنوی جولائی 1895ء کے آخری ہفتے یا اگست 1895ء کے پہلے ہفتے میں امرتسر میں پیدا ہوئے اور 16۔ دسمبر 1963ء کو لاہور میں وفات پائی۔

④ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی رحمہ اللہ

مولانا غلام رسول قلعوی کے معاصرین میں ایک نہایت نمایاں نام مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا ہے جو حضرت سید عبداللہ غزنوی کے مریدِ خاص اور مفسرِ قرآن حضرت حافظ محمد لکھوی کے فرزندِ گرامی تھے۔ وہ 1253ھ (8۔1837ء) کو بمقام لکھوکے (ضلع فیروز پور مشرقی پنجاب) پیدا ہوئے۔ قرآن مجید سمیت صرف ونحو کی بعض کتابیں اپنے گھر لکھوکے میں والدمکرم حافظ محمد لکھوی سے پڑھیں۔ پھر دہلی گئے۔ وہاں مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا بشیرالدین قنوجی، مولانا نوازش علی اور بعض دیگر حضرات سے اکتسابِ علم کیا۔ کتبِ حدیث اپنے والد عالی قدر حافظ محمد لکھوی سے پڑھیں اور ان سے سندِ حدیث لی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔

اس کے بعد اپنے آبائی مدرسے میں طلبا کو پڑھانا شروع کیا۔ متعدد حضرات نے ان سے کسبِ علم کیا۔ نہایت متقی اور صالح عالم دین تھے۔ غزنی جا کر حضرت سید عبداللہ صاحب کے حلقہء ارادت میں شامل ہوئے۔

حج بیت اللہ کی تیاری کی تو ان کے چند عقیدت مند بھی اس مبارک سفر میں ان کے ساتھ گئے۔ مدینے شریف جا کر بیمار ہو گئے اور 15 / ذیقعدہ 1312ھ (10 مئی 1895ء) کو بروز جمعۃ المبارک مسجد نبوی میں وفات پائی۔ جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔

5۔ مولانا غلام نبی سوہدروی رحمہ اللہ

مولانا غلام نبی سوہدروی علم و صالحیت اور حسنِ اخلاق کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھے۔ 4۔ ستمبر 1847ء (23۔ رمضان 1263ھ) کو سوہدرہ (ضلع گوجراں والا) میں پیدا ہوئے۔ علوی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور عالم دین مولانا عبدالمجید سوہدروی کے جدامجد تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی محبوب عالم سے حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا قادر بخش فقیہ وزیر آبادی ،مولانا عبدالباقی جلال پوری اور مولانا غلام مرتضٰی سیالکوٹی سے استفادہ کیا۔ حدیث کی کتابیں لکھوکے (ضلع فیروز پور) میں حضرت حافظ محمد لکھوی سے پڑھیں۔ حضرت میاں سید نذیر حسین رحمہ اللہ کی خدمت میں دہلی گئے اور ان سے سندِ حدیث لی۔

سوہدرہ میں ککے زئی برادری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے مولد سوہدرہ میں درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ ککے زئی برادری کی طرف سے انھیں بے حد تکریم کے مستحق سمجھا گیا اور ان کے طریق تبلیغ سے وہ

لوگ نہایت متاثر ہوئے۔

مولانا غلام نبی نے امرتسر میں حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان کے دائرۂ بیعت وارادت میں شریک ہوئے۔

مولانا مرحوم پنجابی کے شاعر بھی تھے اور پنجابی نظم میں انھوں نے تین کتابیں تصنیف کیں ① تحفۃ الوالدین ② تحفة المعجزات فی تاکیدالصلوٰۃ اور ③ تحفة العجلاء المعروف نصیحة النساء

مولانا غلام نبی سوہدروی نے 4۔ذی الحجہ 1348ھ (3 مئی 1930ء) کو سوہدرہ میں وفات پائی۔

⑥ مولوی غلام احمد رحمہ اللہ

یہ بزرگ ضلع گوجراں والا کے ایک گاؤں دلاور چیمہ کے رہنے والے تھے اور مولانا عبدالقادر قصوری کے والد محترم تھے۔ مولانا غلام رسولؒ کے مخلص تریں دوست تھے۔ دونوں بزرگوں نے اس علاقے میں اسلام کی بڑی تبلیغ کی۔ مولانا عبدالقادر قصوری 1863ء کے لگ بھگ دلاور چیمہ میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر کو پہنچے تو ان کی پڑھائی کا آغاز یا افتتاح دلاور چیمہ آکر مولانا غلام رسولؒ نے کیا تھا، جسے ''رسم بسم اللہ'' کہا جاتا ہے۔ مولانا عبدالقادر قصوری نے ملک کی تحریکات آزادی میں بڑی شہرت پائی۔ تدین وتقویٰ میں بھی ان کا مقام بڑا بلند تھا۔ وہ میاں محمود علی قصوری اور مولانا محی الدین احمد قصوری کے والد مکرم تھے۔ 16 ر نومبر 1942ء کو لاہور میں فوت ہوئے اور قصور میں دفن کیے گئے۔

مولانا غلام رسول قلعوی کے معاصرین میں اور بھی بے شمار اہل علم شامل ہیں۔ لیکن یہاں ان کے صرف پانچ معاصرین کا ذکر کیا گیا ہے۔ معاصرین سے پتا چلتا ہے کہ جس شخص کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، اس کے رفقا علم و عمل میں کس حیثیت کے مالک تھے اور باہم ان کے کس قسم کے مراسم تھے۔ بلاشبہ مولانا غلام رسول قلعوی اپنے عہد کے رفیع المرتبت حضرات سے تعلق رکھتے تھے۔

تلامذۂ کرام

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کا اپنے گاؤں میں سلسلۂ تدریس جاری تھا۔ ان کے جاری کردہ مدرسے کا نام اشاعۃ التوحید والسنہ تھا۔ اس مدرسے میں ان سے بے شمار طلبا نے تحصیل علم کی ہوگی، لیکن مجھے ان کے صرف بائیس تلامذہ کرام کا پتا چل سکا ہے۔ ان سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے میں نے اخبارات میں اعلان کرائے اور ان کے نام لکھ کر درخواست کی کہ ان کے بارے میں کسی کو کچھ علم ہو تو ازراہِ کرم مجھے مطلع کیا جائے، یا ان کے ورثاء میں سے کسی کے مطالعہ میں یہ اعلان آئے تو ان کے کوائفِ حیات کی اطلاع دی جائے۔ بذریعہ ٹیلی فون بھی ان حضرات سے رابطہ کیا جن کے متعلق مجھے خیال تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہوں گے۔ اس ضمن میں مجھے جو کچھ حاصل ہو سکا وہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

① مولانا محمد علی خاں واعظ بوپڑوی

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کے تلامذہ کی فہرست میں ایک عالم دین مولانا محمد علی خاں واعظ بوپڑوی کا نام درج ہے۔ وہ پیدائشی طور پر ضلع گوجراں والا کے موضع بوپڑہ سے

تعلق رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا غلام رسول نے حضرت سید عبداللہ غزنوی کے نام خط لکھ کر مولانا محمد علی واعظ بوپڑوی کو دیا تھا کہ وہ اسے حضرت ممدوح کی خدمت میں پہنچا دیں۔ مولانا بوپڑوی تمام عمر مرزا غلام احمد قادیانی کی شدید مخالفت کرتے رہے۔ اس کا ذکر مختلف پیرایوں میں مرزائی لٹریچر میں ملتا ہے۔ خود مرزا غلام احمد نے اپنی تصانیف میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس کی دست یاب مثالیں ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

❁ مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک تصنیف ''انجام آتھم'' ہے جو مطبع ضیاء الاسلام قادیان میں شائع ہوئی۔ اس کے صفحہ 69 سے 72 تک ان لوگوں کے نام خود مرزا صاحب نے لکھے ہیں جن کو انھوں نے مباہلے کے لیے مخاطب کیا۔ یہ 109 نام ہیں۔ صفحہ 70 کی تیسری سطر میں سولھویں نمبر پر مولانا محمد علی بوپڑوی واعظ کا نام ہے۔

❁ مرزا صاحب نے ''تحفہ گولڑویہ'' کے صفحہ 176 سے 178 تک بعض علما کے نام تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب کے صفحہ 176 کی سطر تیرہ اور صفحہ 178 کی سطر دو میں مولانا محمد علی بوپڑوی واعظ کا نام مرقوم ہے۔

❁ مرزائیوں کی ایک کتاب کا نام ''مکتوبات احمد'' ہے۔ اس کی دوسری جلد ان 277 مکتوبات کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں مرزا غلام احمد قادیانی نے حکیم نورالدین بھیروی اور بعض دوسرے لوگوں کو لکھے۔ اس کتاب کی جلد دوم کے مکتوب نمبر 59 صفحہ 93 کی آخری سطر اور صفحہ 96 کی سطر چار میں مولانا محمد علی بوپڑوی واعظ کا نام درج ہے۔ مرزا صاحب نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مولوی نہیں ہیں، واعظ ہیں۔

❁ مرزائیوں کی ایک کتاب ''پاکٹ بک احمدیہ' ہے۔ اس کے مرتب کا نام ملک

عبدالرحمٰن خادم ہے۔ اس کے صفحہ 563 پر مولانا محمد علی بوپڑوی کا نام درج ہے اور مرزا صاحب کی مخالفت کے سلسلے میں مولانا کے رسالے ''صوت ربانی بر سر دجال قادیانی'' کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی مخالفت مولانا محمد علی بوپڑوی نے نہ صرف تقریری صورت میں کی بلکہ تحریری شکل میں بھی وہ اس کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔

مندرجہ بالا چاروں کتابیں مجھے مولانا محمد داؤد ارشد (نارنگ منڈی) نے عنایت فرمائیں اور جس کتاب کے جس مقام پر مرزا غلام احمد نے مولانا محمد علی واعظ بوپڑوی کا نام لکھا ہے، اس کی نشان دہی کی۔ مولانا محمد داؤد ارشد جماعت اہل حدیث کے معروف مناظر اور خطیب ہیں۔ وہ ہر جمعرات کو لاہور تشریف لاتے اور جامعہ قدس اہل حدیث کے طلبا کو مناظرے کے موضوع پر لیکچر دیتے ہیں۔ مناظر کے لیے حاضر جواب ہونا ضروری ہے، نیز حریف کی نفسیات کو سمجھنا اور موضوع کے بارے میں اس کی معلومات کا اندازہ کرنا خاص اہمیت رکھتا ہے اور مولانا محمد داؤد ارشد کا ذہن اس باب میں بڑا تیز ہے۔ وہ فوراً بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری مدد فرمائی اور کتابیں لے کر خود میرے پاس تشریف لائے۔

مولانا محمد علی واعظ بوپڑوی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنے دیرینہ دوست مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری (مقیم حجرہ شاہ مقیم ضلع اوکاڑہ) سے بھی رابطہ کیا۔ وہ متحدہ پنجاب کے قدیم دور کے علمائے کرام کے بارے میں خاص طور سے معلومات رکھتے ہیں۔ ازراہ کرم وہ 6۔ مئی 2010ء کو لاہور تشریف لائے اور مولانا محمد علی واعظ بوپڑوی کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔ 6/

اکتوبر 1922 کے اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) میں شائع شدہ ایک مضمون کی فوٹو کاپی عنایت کی، جس سے معلوم ہوا کہ بعض مسائل کی تعبیر میں ان کے اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے درمیان کچھ اختلاف تھا۔

31 رمئی 2010ء کو مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری نے اپنے صاحب زادے کے ہاتھ چند مزید معلومات ارسال فرمائیں جو درج ذیل ہیں۔

❁ مولانا محمد علی بوپڑوی پٹھان تھے اور انھیں مولانا محمد علی خاں میر واعظ بوپڑوی کہا جاتا تھا۔

❁ مولانا موصوف پنجابی، فارسی اور عربی کے شاعر تھے۔ ان کی بعض تحریریں تقسیم ملک سے پہلے ایک ناشر کتب فضل حق پرانی منڈی پتوکی نے شائع کی تھیں۔ پتوکی اس وقت تحصیل چونیاں ضلع لاہور کا قصبہ تھا۔ اب خود تحصیل ہے اور ضلع قصور میں واقع ہے۔ ناشر کتب فضل حق مشہور مدرس و عالم مولانا عبدالرحیم مرحوم (حسین خاں والا) کے بزرگوں میں سے تھے۔

❁ مولانا محمد علی کا مولد موضع بوپڑہ ضلع گوجراں والا تھا۔ لیکن وہ تعلیم سے فراغت کے کچھ عرصہ بعد امرتسر چلے گئے تھے اور وہاں انھیں مسجد خراسیاں واقع سفید کٹڑہ کے خطیب مقرر کرلیا گیا تھا۔

❁ مولانا بوپڑوی نے رحلۃ (سفرنامہ) مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی پر اردو میں تقریظ لکھی۔ اس تقریظ میں انھوں نے مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی، ان کے والد مکرم حضرت حافظ محمد لکھوی اور جدِ امجد حافظ بارک اللہ لکھوی کے علم و فضل اور تقوی و تدین کا ذکر کیا ہے اور اختتام پر لکھا ہے۔

الراقم العائذ باللہ المستعان محمد علی خان عفا عنہ الرحمٰن ساکن گوجراں والا

حال وارد پٹیالہ ریاست، مکان غوث محمد خاں صاحب مجسٹریٹ

18۔ جمادی الاخری 1313 ہجری

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے یہ تقریظ لکھی، اس وقت وہ اپنے مسکن سے باہر سابق ریاست پٹیالہ (مشرقی پنجاب) میں تھے۔

اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) کے حوالے سے لکھا گیا ہے: ''مولوی محمد علی صاحب میر واعظ پنجاب طویل سفر حج سے (واپس) آ کر عرصے تک دہلی میں رہے۔ جلسہ اہل حدیث کانفرنس ملتان میں شریک ہوئے۔ وہاں سے امرتسر آ گئے۔ پھر دہلی گئے۔ اب دہلی سے واپس آ کر امرتسر میں اپنی سابقہ مسجد میں قیام پذیر ہیں۔

''پتہ: امرتسر، قلعہ بھگتاں۔ مسجد خراسیاں۔''

(''اہل حدیث'' امرتسر۔ 16۔ جولائی 1920ء)

❁ مولانا محمد علی بوپڑوی نے امرتسر میں 20 رمضان 1342ھ (25۔ اپریل 1924ء) کو وفات پائی۔ اخبار ''اہل حدیث'' میں ان کی خبر وفات مندرجہ ذیل الفاظ میں چھپی۔

یاد رفتگان

'' مولوی محمد علی مرحوم کی پیدائش موضع بوپڑہ ضلع گوجراں والا میں ہوئی تھی۔ اب امرتسر میں مقیم تھے۔ مشہور واعظ، توحید و سنت کی بڑی تبلیغ کرنے والے۔ 20۔ رمضان کو بہ مرضِ طاعون فوت ہوئے۔ عمر غالباً 70 اور 80 سال کے درمیان ہوگی۔ مگر قویٰ سب اچھے تھے۔ ان کی جگہ مسجد (خراسیاں امرتسر) کی

امامت پر ان کے منجھلے بیٹے مولوی فضل الرحمٰن مقرر ہوئے۔"

"نوٹ: دیکھیے قادیان سے کیا الہام نکلتا ہے"

(اخبار "اہل حدیث" 2۔ مئی 1924ء (27۔ رمضان 1342ھ)

اوپر نوٹ میں جو الفاظ لکھے گئے ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ مولانا محمد علی بوپڑوی مرزا قادیانی اور اس کی جماعت کے سخت مخالف تھے اور مرزا صاحب کا جو مخالف وفات پا جاتا تھا، اس کے متعلق مرزا صاحب کا کوئی مخالفانہ "الہام" بیان کر دیا جاتا تھا۔ مولانا بوپڑوی کے متعلق کوئی "الہام" بیان ہوا یا نہیں۔ اس کا پتا نہیں چل سکا۔

میں مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری کا ممنون ہوں کہ وہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر لاہور آئے اور پھر اپنے صاحب زادے کو بھیجا اور مجھے مولانا محمد علی بوپڑوی کے متعلق وہ معلومات بہم پہنچائیں، جن سے وہ آگاہ تھے۔

اس سے قبل میں 17۔اپریل 2010ء کو فیصل آباد گیا۔ وہاں جامعہ سلفیہ کے استاذ اور ماہنامہ "ترجمان الحدیث" کے مدیر حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی سے ملا اور مولانا محمد علی بوپڑوی کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے مولانا محمد علی بوپڑوی کے بارے میں حصولِ معلومات کے لیے بذریعہ ٹیلی فون ان کے پڑپوتے حافظ محمد عثمان سے رابطہ قائم کیا، لیکن ان سے کسی قسم کی معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ 17/ اپریل کے بعد بھی ان سے بذریعہ ٹیلی فون بات ہوئی، مگر ان سے چھوٹی بڑی کسی بات کا پتا نہ چل سکا۔

افسوس ہے ہمارے اکثر علمائے کرام کو اپنے معروف اہل علم آبا و اجداد کے بارے میں بھی کچھ علم نہیں ہے اور وہ ان کے واقعاتِ زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

مولانا محمد علی بوپڑوی کو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے بھی شرفِ تلمذ حاصل

تھا۔ حضرت میاں صاحب کی ایک مشہور تصنیف ''معیار الحق'' ہے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ 1297ھ میں دہلی میں چھپی تھی۔ اس وقت حضرت میاں صاحب زندہ تھے۔ اس کے بعد 1337ھ میں دہلی ہی سے شائع ہوئی۔ تیسری مرتبہ 1384ھ میں پاکستان میں چھپی۔ اس پر حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم و مغفور نے مقدمہ تحریر فرمایا۔ مقدمے میں انھوں نے حضرت میاں صاحب کے بعض تلامذہ کا بھی ذکر کیا ہے، جن میں مولانا محمد علی بوپڑوی بھی شامل ہیں۔ مولانا سلفی نے لکھا ہے کہ مولانا بوپڑوی نے وعظ و خطابت کی صورت میں کتاب و سنت کی بڑی خدمت کی۔

حضرت میاں صاحب کی سوانح عمری ''الحیات بعد الممات'' میں ان کے بعض شاگردوں کی فہرست دی گئی ہے۔ حضرت کے امرتسر سے تعلق رکھنے والے شاگردوں میں مولوی محمد علی واعظ کا نام بھی درج ہے۔ لیکن مولانا محمد علی بوپڑوی کے اخلاف پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص کرم ہے کہ انھیں اپنے اس عظیم بزرگ کے متعلق کسی بات کا بھی علم نہیں۔ انھیں یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ ان کے مواعظ کی اثر آفرینیوں کے باعث انھیں پنجاب کے میر واعظ کہا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت لوگ ہیں، جو اپنے اسلاف کے حالات سے بالکل بے خبر ہیں۔

میں مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری کی خدمت میں عرض کروں گا کہ وہ محنت کر کے مولانا محمد علی خاں بوپڑوی پر مضمون تحریر کریں اور جماعت کے کسی اخبار میں چھپوائیں۔ یہ بڑی خدمت ہوگی۔ وہ مولانا غلام رسول قلعوی اور حضرت میاں نذیر حسین دہلوی کے شاگرد اور کتاب و سنت کے مبلغ تھے۔ قادیانیت کی مخالفت میں بھی ان کا بڑا حصہ ہے۔

میں مولانا محمد داؤد ارشد اور مولانا محمد ابراہیم خلیل فیروز پوری کا انتہائی شکر گزار ہوں

کہ انھوں نے مجھے مولانا محمد علی خان بوپڑوی کے حالات سے مطلع فرمایا۔ مولانا بوپڑوی کے پڑپوتے حافظ محمد عثمان کا بھی نہایت شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اپنے قابل احترام پڑدادے کے بارے میں حافظ فاروق الرحمان یزدانی کا اور میرا ٹیلی فون سننے کی زحمت گوارا فرمائی۔

② مولانا برہان الدین جہلمی

مولانا غلام رسول کے ایک شاگرد مولانا برہان الدین جہلمی تھے۔ ان کے حالات کا علم تو نہیں ہوسکا۔ البتہ انھوں نے عربی میں حضرت میاں صاحب کی تصنیف ''معیار الحق'' پر تقریظ لکھی تھی جو دہلی کے ایڈیشن میں چھپی۔ ناشر نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

صورۃ ماکتبہ وقرظہ العالم الکامل الفاضل ارشد الصلحاء واسعد الاتقیاء المولوی برھان الدین صاحب ادام اللہ تعالیٰ۔

مولانا محمد حسین بٹالوی نے مرزا غلام احمد کی تکفیر کے متعلق جو اولیں فتویٰ تحریر کیا تھا اس پر انھوں نے یہ لکھ کر دستخط کیے تھے کہ مرزا کافر ہے۔ لیکن پشاور اور گجرات وغیرہ کے مرزائیوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ مولانا برہان الدین جہلمی نے اپنے فتوے سے رجوع کر لیا تھا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ انھوں نے رجوع نہیں کیا تھا۔ وہ مدعی نبوت کو کافر ہی قرار دیتے تھے۔ مرزائی عام طور سے اس قسم کی کذب بیانی کرتے رہتے ہیں۔

③ مولانا عظیم اللہ (یا عبدالعظیم)

مولانا غلام رسول کے جن شاگردوں سے متعلق حصولِ معلومات کے لیے میں نے

اخبارات میں اعلان کرایا، ان میں ایک مولانا عظیم اللہ تھے جو موضع بڑبن کے رہنے والے تھے۔ یہ علاقہ موجودہ جغرافیائی اعتبار سے ضلع میر پور (آزاد کشمیر) میں واقع ہے۔ میرا اعلان مولانا عظیم اللہ کے پڑپوتے مولانا عبدالصمود کی نظر سے گزرا تو انھوں نے مجھے ٹیلی فون کیا اور بتایا کہ ان کے پڑدادا کے جن مختصر سے حالات کا انھیں علم ہے، وہ ان سے مجھے مطلع کریں گے۔ چنانچہ مطبوعہ صورت میں جو حالات انھوں نے ارسال کیے، وہ اپنے الفاظ میں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

مولانا عظیم اللہ (جنھیں مولانا عبدالعظیم بھی کہا جاتا ہے) موضع بڑبن (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ سالِ ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ مولانا غلام رسول کے حلقۂ شاگردی میں بھی رہے۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ کس زمانے میں انھوں نے مولانا سے کون سی کتابیں پڑھیں۔ ہندوستان جا کر مولانا محمد بشیر قنوجی اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے بھی استفادہ کیا۔ علم حدیث حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی سے حاصل کیا۔ مولانا محمد حسین بٹالوی اور گوجراں والا کے مولانا علاء الدین ان کے رفقائے درس میں سے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا عظیم اللہ اپنے گاؤں بڑبن آئے اور اسے مرکز بنا کر علاقے میں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ اپنے گاؤں میں مدرسہ بھی جاری کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہوئے۔ پورے علاقے میں بدعات کا زور تھا۔ لوگ اولیاء اللہ کی قبروں پر حاضری دیتے اور مشرکانہ رسوم پر عامل تھے۔ مولانا عظیم اللہ نے وعظ و تقریر کے ذریعے سے خالص کتاب و سنت کو مدارِ عمل ٹھہرانے کی مہم شروع کی۔ اس ضمن میں ان کو اہل بدعت کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ سرکار

دربار میں بھی ان کے خلاف شکایات کی گئیں اور ان پر مقدمے قائم کیے گئے اور کہا گیا کہ یہ کسی نئے مذہب کی اشاعت کر رہے ہیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے مولانا عظیم اللہ کی مدد فرمائی اور وہ کامیاب رہے۔

ان کے قائم کردہ مدرسے میں جن حضرات نے ابتدائی دور میں داخلہ لیا ان میں مشہور عالم دین اور استاذ الاساتذہ شیخ الحدیث مولانا نیک محمد بھی شامل تھے، جنھوں نے آگے چل کر امرتسر میں حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کے حلقۂ تلامذہ میں شمولیت فرمائی اور پھر مدرسہ غزنویہ (امرتسر) کی مسندِ درس حدیث پر متمکن ہوئے اور اپنے استاذِ مکرم مولانا سید عبدالجبار غزنوی کے جانشین قرار پائے۔ ان کے علاوہ ایک بزرگ مولانا عبدالرحمٰن کھوڑوی تھے جن کا شمار مولانا عظیم اللہ کے شاگردوں میں ہوا۔ اور بھی بہت سے حضرات نے ان سے اخذِ فیض کیا، لیکن افسوس ہے اس سلسلے کی تفصیل کا علم نہیں ہوسکا۔ علاقہ کشمیر میں ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا جو اضلاع میر پور، کوٹلی، پونچھ کے علاوہ جموں اور سانبہ تک پھیلا ہوا تھا۔ مولانا موصوف نے 1921ء کو اپنے مسکن بڑبن میں وفات پائی اور اپنے آبائی قبرستان بن مصراں میں دفن کیے گئے۔

مولانا عظیم اللہ کے فرزندِ گرامی مولانا عبدالحی تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر میں اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ پھر امرتسر گئے اور مدرسہ غزنویہ میں حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد اپنے والد کے قائم کردہ مدرسے میں سلسلۂ درس شروع کیا۔ ان

کے شاگردوں میں زیادہ تر تعداد علاقہ کشمیر کے علما وطلبا کی ہے، جن میں مولانا غلام دین پونچھوی، مولانا عبدالرحمٰن پونچھوی، مولانا ولایت شاہ راجوروی اور دیگر حضرات شامل ہیں۔ مولانا عبدالحی نے درس وتدریس کے ساتھ ساتھ وعظ وتقریر کے ذریعے بھی خدمات انجام دیں۔ وہ مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں:

① حدیث کی ابتدائی درسی کتاب بلوغ المرام پر حاشیہ

② رسالہ التراویح

③ حرف الضاد لیس بدال

④ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا قصہ

⑤ اجازت نکاح صغیر۔

مولانا عبدالحی کے تین بیٹے ہوئے اور وہ تھے مولانا عبدالقیوم، مولانا عبدالحلیم اور مولانا عبدالرؤف۔

مولانا عبدالقیوم نے حصول علم کا آغاز اپنے آبائی مدرسے میں کیا۔ پھر وزیر آباد گئے۔ وہاں حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگرد مولانا عمر دین فریضہ درس انجام دیتے تھے، ان سے کسبِ علم کیا۔ بعدازاں گوجراں والا میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ سے مستفید ہوئے۔ 1990ء میں سفرِ آخرت اختیار کیا اور چترپڑی (میرپور) کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مولانا عبدالحی کے دوسرے بیٹے مولانا عبدالحلیم نے گوجراں والا میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی سے تحصیل علم کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے فاضل عربی اور فاضل فارسی کے امتحانات پاس کیے۔ 1947ء میں جموں میں شہید کیے گئے۔

مولانا عبدالحیٔ کے تیسرے بیٹے مولانا عبدالرؤف نے بھی ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کر کے گوجراں والا کا قصد کیا۔ وہاں مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا عبداللہ سے فیض حاصل کیا۔ فراغت کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت کی اور میر پور کے علاقے میں ان کے مواعظ کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا عبدالرؤف کے بیٹے مولانا عبدالصمود ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں حاصل کی۔ پھر میٹرک کا امتحان دیا۔ بعدازاں گوجراں والا میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا ابوالبرکات احمد سے دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ 1977ء میں مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ چار سال وہاں کے کلیۃ الحدیث میں پڑھتے رہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی اور مظفر آباد آزاد کشمیر سے ایم اے اسلامیات کے امتحانات پاس کیے۔ اب اپنے آبائی علاقے میر پور میں خدمتِ دین میں مصروف ہیں۔ اپنے پڑدادا مولانا عظیم اللہ کے قائم کردہ مدرسے کا انتظام بھی ان کے سپرد ہے۔ اس کا نام انھوں نے جامعہ عظیمیہ سلفیہ رکھا ہے۔

④ مولانا علاء الدین

مولانا غلام رسول قلعوی کے ایک شاگرد مولانا علاء الدین تھے، جن کے آبا و اجداد کا اصل مسکن موضع اوج بھٹیاں (ضلع ملتان) تھا۔ وہ برہمن چندر بنسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نویں پشت میں ایک بزرگ غالب دین نے اسلام قبول کیا۔ ان کے اسلاف میں سے ایک شخص معلوم نہیں کب ضلع گوجراں والا کے ایک گاؤں پنڈوریاں (نزد جاملکے چٹھہ، تحصیل وزیرآباد) میں آبسے تھے۔ وہیں 1823ء میں

مولانا علاء الدین پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالواسع تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ والدین نے ایک کا نام اللہ دین اور ایک کا علم دین رکھا۔ پھر کچھ بڑے ہو کر اللہ دین نے خود ہی اپنا نام علاء الدین رکھ لیا۔

علاء الدین نے حصول علم کا آغاز قلعہ اسلام میں مولانا غلام رسول سے کیا اور مختلف علوم کی کتابیں ان سے پڑھیں۔ پھر مولانا موصوف نے خود ہی انھیں حضرت سید میاں نذیر حسین کی خدمت میں دہلی بھیج دیا۔ میاں صاحب سے انھوں نے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ فراغت کے بعد مختلف مقامات میں درس و تدریس اور وعظ و خطابت کی خدمت انجام دی۔ زیادہ عرصہ بمبئی رہے۔ وہیں ان سے حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کی ملاقات ہوئی۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ گوجراں والا کے مولوی علاء الدین بہت اچھا وعظ کہا کرتے تھے۔ وہ تقریباً 52 برس کی عمر تک اپنے مولد و مسکن سے باہر رہے۔ 1875ء کے قریب گوجراں والا آئے اور انھیں وہاں اونچی مسجد کمہاراں والی کے امام مقرر کیا گیا۔ مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے، لیکن اس معاملے میں بے حد احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اس کے باوجود مسجد کے نمازیوں نے ان کو ایک دن حالت نماز میں اٹھا کر مسجد کے باہر پھینک دیا۔ پھر اس عالم دین نے اس کے قریب ہی کھلے میدان میں خطبۂ جمعہ دینا شروع کر دیا۔

انھی دنوں ایک بزرگ پیر میر حیدر شاہ صاحب خان پوری گوجراں والا تشریف لائے تو انھوں نے چوک نیائیں میں سائیں رنگ علی سے کچھ جگہ لے کر مسجد کی بنیاد رکھی اور مولانا علاء الدین کو اس مسجد کے خطیب و امام مقرر کر دیا۔[1]

---

[1] پیر میر حیدر کا ذکر ''قبولیتِ دعا اور ظہور کرامات'' کے باب (کرامت نمبر 50) میں تفصیل سے آچکا ہے۔ یہ مولانا غلام رسول کے مرید تھے۔

پہلی بیوی کی وفات کے بعد مولانا علاء الدین نے گوجراں والا میں دوسری شادی کرلی تھی۔ اس خاتون کے بطن سے ان کے دو بیٹے پیدا ہوئے اور دو بیٹیاں۔ بڑے بیٹے کا نام مولوی عبدالعزیز تھا اور چھوٹے کا عبدالرشید۔ چھوٹا بیٹا اٹھارہ سال کی عمر میں وفات پا گیا تھا۔

جامع مسجد اہل حدیث چوک نیائیں کی بنیاد 1876ء کے لگ بھگ رکھی گئی تھی اور مولانا علاء الدین تقریباً چھبیس برس اس مسجد میں امامت و خطابت کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ 1908ء تک گوجراں والا میں اہل حدیث کی تین مسجدیں بن چکی تھیں، لیکن نمازِ جمعہ شہر کے تمام اہل حدیث چوک نیائیں کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ یہی جامع مسجد تھی۔ اس مسجد کے علاوہ دوسری مسجد محلّہ حاجی پورہ میں تھی اور تیسری گھنٹا گھر کے قریب مستری حاجی پیر بخش والی مسجد۔!

مولانا علاء الدین کے تذکرے کی مناسبت سے گوجراں والا کی جماعت اہل حدیث کے متعلق چند باتیں اور سنیے!

1914ء میں گوجراں والا میں ایک پادری جوالا سنگھ آیا۔ اس نے وہاں اسلام کے خلاف تقریروں کا سلسلہ شروع کیا اور مسلمانوں کو مناظرے کے لیے للکارا۔ اہل حدیث حضرات نے مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کو دعوت دی۔ مولانا تشریف لائے اور پادری صاحب سے مناظرہ کیا۔ پادری کو شکست ہوئی۔ اسی موقع پر وہاں انجمن اہل حدیث بنائی گئی، جس کے ارکان میں مولانا علاء الدین بھی شامل تھے۔ اس انجمن کا پہلا جلسہ عام 1915 میں بابو عطا محمد کی کوٹھی پر ہوا، جس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، مولانا محمد علی واعظ بوپڑوی، مولانا محمد ابراہیم

سیالکوٹی، مولانا عبدالعزیز بن مولانا غلام رسول قلعوی اور مولانا علاء الدین نے شرکت کی۔ اس کے بعد اس انجمن کے تین سالانہ جلسے ہوئے اور پھر یہ سلسلہ آگے بڑھا۔

1920ء میں انجمن اہل حدیث نے چوک نیائیں کی مسجد میں دینی مدرسہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ حضرت مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ کے فرمان کے مطابق 1921ء کے شروع میں مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ گوجراں والا تشریف لائے اور مسجد کے پہلے خطیب و امام مولانا علاء الدین نے ان کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی اس وقت پچیس سال کے جوان رعنا تھے۔ مدرسے کے اجرا سے چھ مہینے بعد 6/ستمبر 1921ء (3 محرم 1340ھ) کو منگل کے روز بعمر 98 برس مولانا علاء الدین نے وفات پائی اور بہ وقت وفات حسب ذیل وصیت کی۔

① میں مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھتا ہوں، اس لیے مجھے مولوی عبداللہ (حاجی پورہ والے) اور مولوی فضل دین اونچی مسجد والے غسل دیں۔

② نماز جنازہ مولانا غلام رسول قلعوی کے بیٹے مولوی عبدالعزیز پڑھائیں۔

③ میرے جنازے میں سورہ فاتحہ مع بسم اللہ پڑھی جائے۔

④ میری قبر پر پختہ اینٹ نہ لگائی جائے، نہ قبر پر فاتحہ خوانی کی جائے۔

مولانا علاء الدین کے شاگردوں کی جماعت میں مولانا نور حسین گھرجاکھی، مولانا فضل دین، مولانا حکیم محمد عبداللہ، مولانا امام الدین سکنہ کھیکی اور بعض دیگر حضرات شامل ہیں۔

مولانا علاء الدین نہایت رقیق القلب تھے، بڑے پیار سے لوگوں کو مسائل سمجھاتے تھے، طعنہ زنی سے بچتے اور حکمت و دانش سے تبلیغ دین کرتے تھے۔ وعظ میں عام طور سے پنجابی کے شعر پڑھتے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ انھوں

نے سورہ زلزال (اذا زلزلت الارض زلزالھا) پڑھ کر خطبہ جمعہ دیا۔ سننے والوں کو ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ واقعی زلزلہ آ گیا ہے اور زمین ہل رہی ہے۔ انھوں نے چھیالیس سال جامع مسجد چوک نیائیں میں امامت و خطابت کا سلسلہ جاری رکھا۔

مولانا علاء الدین کی وفات کے دس دن بعد انجمن اہل حدیث کا اجلاس ہوا، جس میں مولانا علاء الدین کے صاحب زادے مولانا عبدالعزیز بھی شامل تھے۔ اس اجلاس میں مولانا محمد اسماعیل سلفی کو باقاعدہ طور پر مسجد چوک نیائیں کے منصب خطابت وامامت پر متعین کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ مولانا اسماعیل صاحب نہ کسی کو رفع الیدین اور آمین بالجہر پر مجبور کریں گے اور نہ کوئی شخص کسی کو اس عمل سے روکے گا۔ مسجد کی آمدنی مولانا علاء الدین کے صاحب زادے مولانا عبدالعزیز لیں گے۔

مسجد کی نئی تعمیر کی ابتدا 18/ستمبر 1935ء کو ہوئی۔ اس وقت مولانا عبدالعزیز ریلوے آفس لاہور میں ملازم تھے۔ صدر انجمن کے کہنے سے مولانا محمد اسماعیل سلفی نے ان کو خط لکھا کہ آپ مقررہ تاریخ پر تشریف لا کر مسجد کا سنگ بنیاد رکھیں۔

مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے بھی چھیالیس سال اس مسجد کی خطابت اور درس و تدریس کے فرائض ادا کیے۔ انھوں نے 20/فروری 1968 کو وفات پائی اور گوجرانوالا میں بے پناہ دینی خدمات سرانجام دیں۔ اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم

⑤ حافظ ولی اللہ لاہوری رحمہ اللہ

کسی زمانے میں بے شمار مسلمان وادئ کشمیر سے لاہور اور پنجاب کے بعض دیگر

شہروں میں آ گئے تھے، انھی میں حافظ ولی اللہ لاہوری کے آباو اجداد کا شمار ہوتا ہے۔

حافظ ولی اللہ کی ولادت 1251ھ (36-1835ء) کو کشمیر میں ہوئی۔ کشمیر سے یہ خاندان مختلف مقامات سے گزرتا ہوا لاہور آیا۔ ولی اللہ کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی کہ انھیں چیچک کی بیماری لاحق ہوگئی اور وہ بصارت سے محروم ہوگئے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے والدین وفات پا گئے۔ یہ ان کے لیے نہایت اذیت کا دور تھا۔ انھی دنوں لاہور میں کسی طرح ان کی ملاقات مولانا غلام رسول قلعوی سے ہوئی تو وہ انھیں اپنے گاؤں قلعہ اسلام لے گئے۔ وہاں انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا اور مولانا سے علوم دینیہ کی کتابیں پڑھیں۔ بے حد ذہین تھے۔ مختلف مروجہ علوم کی کتابوں پر عبور حاصل تھا۔ مولانا احمد الدین بگوی اور بعض دیگر اساتذہ سے بھی استفادہ کیا۔

اس زمانے میں عیسائی پادریوں نے اسلام کی مخالفت کو اپنے لیے ضروری قرار دے رکھا تھا۔ حافظ ولی اللہ لاہوری نے عیسائیت کا مطالعہ کیا اور پادریوں سے بحث ومباحثے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ اس موضوع کے بہت بڑے مناظر و ماہر مانے گئے۔ اس موضوع پر انھوں نے کتابیں بھی لکھیں۔

ایک پادری کا نام عمادالدین تھا۔ اس نے ''تحقیق الایمان'' کے نام سے اسلام کے خلاف ایک نہایت دلآزار کتاب لکھی۔ حافظ ولی اللہ لاہوری نے ''صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیطان'' کے نام سے اس کتاب کا جواب دیا۔

1284ھ میں پادری عماد الدین سے ان کا مباحثہ بھی ہوا تھا۔ اس کی روداد انھوں نے ''مباحثہ دینی'' کے نام سے قلم بند کی۔ ان کی اور بھی تصانیف ہیں۔ پادری عماد الدین کے علاوہ پادری فورمین سے بھی ان کے زبانی اور تحریری مناظرے ہوئے۔

حافظ ولی اللہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ عرصہ لاہور کی مسجد وزیر خاں میں درس دیتے رہے۔ مئی 1873ء میں لاہور کی بادشاہی مسجد کے مدرسے میں انھیں مدرس مقرر کرلیا گیا تھا۔ وہ زندگی کے آخری دم تک اس خدمت پر مامور رہے۔ مولانا غلام رسول قلعوی کے اس لائق ترین شاگرد نے 24۔ جمادی الاولیٰ 1296ھ (24۔جولائی 1879ء) کو وفات پائی اور انھیں احاطہ شاہ ابوالمعالی میں دفن کیا گیا۔

⑥ مولوی محمد عثمان

مولانا غلام رسول کی شادی ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب) کے ایک قصبے فتح گڑھ چوڑیاں میں ہوئی تھی اور مولانا کے اس شاگرد مولوی محمد عثمان کا تعلق اسی قصبے سے تھا۔ یہ مولانا کی سسرالی رشتے داروں میں سے تھے اور ان کے داماد تھے۔ اپنی اہلیہ سمیت مولانا کے ساتھ حج پر بھی گئے تھے۔

مولانا غلام رسول قلعوی کے شاگردوں میں سے صرف انہی چھ حضرات کے متعلق تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوسکی ہیں۔ میں نے ان کے بائیس شاگردوں کے نام لکھ کر متعدد اخباروں میں ان کے حالات سے مطلع ہونے کے لیے اعلانات کرائے، لیکن افسوس ہے، بے حد کوشش کے باوجود ان کے علاوہ کسی کے متعلق علم نہ ہوسکا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کے مدارس میں طلبا کے داخلے وغیرہ کے رجسٹر رکھنے اور ان کے نام اور پتے محفوظ کرنے کا رواج نہ تھا، طلبا آتے، استاذ سے تعلیم حاصل کرتے اور چلے جاتے۔

تصنیف وتالیف کے بارے میں

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی زندگی دراصل دو کاموں میں بسر ہوئی اور یہی دو کام ان کی شہرت کا باعث اور لوگوں میں دین اسلام کی اشاعت کا سبب ہوئے۔ایک وعظ وتذکیر اور دوسرا درس وتدریس۔ان کے وعظ کی دور دور تک دھوم تھی۔جیسا کہ نزہۃ الخواطر کے مصنف شہیر حکیم سید عبدالحی حسنی نے بیان کیا،وہ راسخ فی العلم عالم دین، یگانۂ روزگار مدرس اور عمل وکردار اور حسنِ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے۔تدریس میں بھی وہ بڑا اونچا مقام رکھتے تھے، اور یہ دونوں خوبیاں (درس وتدریس اور وعظ و تذکیر) بہت بڑی خوبیاں ہیں۔عالی بخت ہے وہ عالم دین جس کے وعظ سے اثر پذیر ہو کر مسلمان کہلانے والے لوگ خلافِ شرع رسوم وعادات سے کنارہ کشی اختیار کر لیں اور غیر مسلم جس کی تقریر سن کر حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔اسی طرح رفیع المنزلت ہے وہ عالم جس نے مسندِ درس بچھائی اور شائقینِ علوم دین اس کے گرد جمع ہوئے۔

مولانا غلام رسول کی اس سلسلے کی جدوجہد کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں کافی تفصیل سے ہو چکا ہے۔اس باب میں مولانا موصوف کی صرف تصنیفی مساعی کے متعلق گزارشات

پیش کرنا مقصود ہے۔

مولانا غلام رسول کی جن تصانیف کا ہمیں پتا چلا ہے، وہ حسب ذیل ہیں۔

❁ ایک رسالہ تشہد میں رفع سبابہ کے اثبات میں لکھا۔ اس رسالے کا ذکر حکیم سید عبدالحی حسنی نے سنن ابو داود کی شرح عون المعبود کے مصنفِ عالی قدر حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی کی غیر مطبوعہ کتاب تذکرۃ النبلاء کے حوالے سے نزہتہ الخواطر کی آٹھویں جلد میں مولانا غلام رسول کے ترجمے کے ضمن میں کیا ہے۔

❁ ایک رسالہ رمضان المبارک کے آخری جمعۃ المبارک کے روز قضاے عمری کی چار رکعتیں پڑھنے کے متعلق ہے، مولانا نے اسے باطل اور خلافِ شرع قرار دیا۔ اس رسالے کا ذکر بھی مولانا ڈیانوی کی کتاب تذکرۃ النبلاء کے حوالے سے نزہتہ الخواطر کی آٹھویں جلد میں کیا گیا ہے۔لیکن ان دونوں رسالوں کا مولانا غلام رسول کے اخلاف میں سے کسی صاحب کو علم نہیں ہے۔ مولانا کی ایک تصنیف ''تعارفِ توحید'' بیان کی جاتی ہے۔ اس کا ذکر چوبیسویں باب میں ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا شاید مناسب ہوگا کہ ''تذکرۃ النبلاء فی تراجم العلماء'' حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی کی ایک نہایت اہم کتاب ہے جو فارسی زبان میں ہے اور بہت سے علما و زعما کے تراجم و حالات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب چھپ نہیں سکی۔ حضرت مصنف کے اس قلمی نسخے سے متعدد اصحابِ علم نے استفادہ کیا، مثلاً حکیم سید عبدالحی حسنی نے نزہتہ الخواطر کی تصنیف کا آغاز کیا تو حضرت مولانا عظیم آبادی نے ان کو یہ قلمی نسخہ بھیج دیا اور انھوں نے اس کے حوالے سے جن بزرگانِ دین کا تذکرہ کیا، ان کی تعداد تیس تک پہنچتی ہے، جن میں مولانا غلام رسول قلعوی کا اسم گرامی بھی شامل

ہے۔ نزہۃ الخواطر کی ساتویں اور آٹھویں جلدوں میں بالخصوص اس کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی نے ''ابناء الخلان'' لکھنا شروع کی تو انھوں نے مولانا ڈیانوی سے تراجم علماے صوبہ بہار وغیرہ طلب کیے اور ان کی طلب پر مولانا ممدوح نے کتاب کے مسودے کے بعض اجزا ان کو بھیج دیے، مگر کئی دفعہ طلب کرنے کے باوجود وہ اجزا مولانا عبدالحی فرنگی محلی واپس نہ کر سکے۔ اسی اثنا میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد مولانا خادم حسین نے بار بار طلب کرنے پر مشکل سے چند اجزا واپس کیے۔ حکیم سید عبدالحی حسنی اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے علاوہ بھی متعدد حضرات نے اپنی ضرورت کے مطابق اس قلمی نسخے کے بعض اجزا مولانا ڈیانوی سے طلب کیے اور استفادہ کر کے واپس بھیج دیے۔

اس زمانے میں فوٹو کاپی وغیرہ کی سہولت حاصل نہیں تھی۔

گزارش کا مطلب یہ ہے کہ مولانا غلام رسول کے مذکورہ بالا دو رسالوں کا پتا چلتا ہے، جن کا ذکر سید عبدالحی حسنی نے مولانا شمس الحق ڈیانوی کی قلمی کتاب کے حوالے سے کیا ہے۔ یہ رسالے کس زبان میں تھے اور ہر رسالہ کتنے صفحات پر مشتمل تھا، اس کا کوئی علم نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اب یہ کہیں موجود بھی ہیں یا نہیں۔ خیال یہ ہے کہ یہ رسالے فارسی زبان میں ہوں گے، کیوں کہ مولانا کی علمی تحریریں جو خطوط وغیرہ کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں، فارسی زبان میں ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاف میں سے کسی کو ان رسالوں کا علم

نہیں ہے۔ چوں کہ مولانا شمس الحق نے ان کا ذکر فرمایا ہے، اس لیے یہ رسالے اپنے موضوع میں علمی لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہوں گے۔ مولانا شمس الحق نے صرف 57 برس عمر پائی اور وہ 19 / ربیع الاول 1329ھ (20۔ مارچ 1911ء) کو فوت ہوئے۔

❁ مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی ایک کتاب کا نام ''پنج گنج'' ہے۔ یہ کتاب پنجابی نظم میں ہے اور 16-30-20 سائز کے تقریباً ساٹھ صفحات پر مشتمل۔ یہ مختصر سی پانچ کتابوں کا مجموعہ ہے اور وہ کتابیں ہیں:

① سی حرفی، ② نصیحت نامہ، ③ حلیہ مبارک نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ④ قصہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ، ⑤ قصہ سسّی پنوں۔

اس کتاب میں زیادہ تر موت اور قبر کا تذکرہ ہے جو درد ناک الفاظ اور موثر ترین انداز میں کیا گیا ہے۔ پنجابی نظموں کے اس مجموعے کے جو ''پنج گنج'' کے نام سے موسوم ہے، اکثر حصے زیر مطالعہ کتاب (تذکرہ مولانا غلام رسول قلعوی) میں شامل کردیے گئے ہیں۔ تاکہ محفوظ ہوجائیں اور پنجابی نظم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس سے مستفید ہوسکیں۔

❁ سوانح عمری حضرت سید عبداللہ غزنوی: یہ کتاب حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی اور مولانا غلام رسول دونوں کی تصنیف ہے۔ کتاب فارسی میں لکھی گئی تھی۔ پھر اس کا اردو ترجمہ ہوا۔ اسی میں حضرت عبداللہ غزنوی کے مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ فارسی زبان میں ہے اور یہ وہ مکتوبات ہیں جو حضرت عبداللہ صاحب نے مختلف حضرات کے نام تحریر فرمائے۔ کتاب مطبع القرآن

والسنہ امرتسر میں بہ اہتمام عبدالغفور عبدالاول پسران مولانا محمد بن مولانا عبداللہ غزنوی شائع ہوئی۔

مولانا غلام رسول سے لوگوں نے روزانہ پیش آنے والے دینی مسائل کے بارے میں فتوے بھی پوچھے ہوں گے، زبانی بھی اور تحریری بھی، لیکن ہمیں اس قسم کی کسی چیز کا علم نہیں ہوسکا۔

ایک پنجابی کتاب ''پکی روٹی'' مولانا کی طرف منسوب کی جاتی ہے، لیکن یہ انتساب صحیح نہیں۔ ان کے پڑپوتے حافظ حمید اللہ سدید اور ملک عصمت اللہ کے بقول یہ مولانا کی تصنیف نہیں ہے۔

حافظ حمید اللہ سدید نے ایک مصنف کا نام لے کر بتایا کہ ایک مرتبہ وہ ان کے گاؤں گئے۔ چند روز ان کے والد (مولانا عبدالرحمٰن) کے پاس بہ طور مہمان ٹھہرے اور مولانا غلام رسول کی بعض قلمی کتابیں اور مسودے ان سے لے گئے۔ پھر وہ کتابیں انھوں نے واپس نہیں کیں۔ اللہ ہی جانتا ہے، اس طرح مولانا کی کون کون سی تصانیف گم ہوگئیں۔

بے شبہ مولانا غلام رسول قلعوی جلیل القدر عالم وخطیب اور ممتاز مدرس تھے۔ ان کی کوئی قابل ذکر تصنیف نہیں ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کی تبلیغی مساعی اور خدمت دین کا دائرہ بہت وسیع اور بہ درجہ غایت موثر تھا۔ وہ آیۃ من آیات اللہ تھے۔ سراپا عمل اور تقویٰ وطہارت کا بلند تریں نمونہ۔

مولانا غلام رسول کے مواعظ سے جتنے لوگ متاثر ہوئے اور جتنی تعداد میں غیر مسلمان دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، ان کے معاصرین میں سے کسی کے مواعظ سے

نہیں ہوئے۔ ان سے جتنی کرامات کا ظہور ہوا، اتنا کسی سے نہیں ہوا۔ مصنف اور مؤلف تو بے شمار ہیں، واعظوں اور خطیبوں کی بھی کمی نہیں، لیکن جو خصائص و خصائل، اللہ تعالیٰ نے مولانا غلام رسول کی ذات گرامی میں ودیعت فرمائے تھے، ان کے ہم عہد علما میں سے کسی کے حصے میں نہیں آئے۔

مکتوبات

مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، جن میں معاشرے کے عام لوگوں کے علاوہ علما وطلبا بھی کثیر تعداد میں شامل تھے۔ مختلف مقامات میں وہ وعظ وتبلیغ کے لیے بھی تشریف لے جاتے تھے۔ لوگ ان سے زبانی اور تحریری صورت میں مسئلے مسائل بھی پوچھتے تھے، فتوے بھی لیتے تھے۔ بعض معاملات میں بذریعہ خطوط لوگ ان سے مشورے بھی لیتے ہوں گے۔ لیکن ان کے سوانح نگار فرزند گرامی مولانا عبدالقادر کی معرفت ہمیں ان کے صرف تیرہ مکتوبات کا علم ہوسکا ہے۔ ایک طویل مکتوب انھوں نے حافظ آباد کے ایک ہندو رام دتا ٹانڈو کے نام تحریر فرمایا جو اس کتاب میں مستقل باب کے طور پر علیحدہ درج کر دیا گیا ہے۔

مولانا ممدوح جامع الحیثیات شخصیت کے مالک تھے، اس لیے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو بہت خطوط لکھے ہوں گے، لیکن افسوس ہے تمام خطوط محفوظ نہیں رہ سکے۔ ہمیں جو خطوط ملے ہیں، وہ فارسی زبان میں ہیں۔ ان میں سے دو خطوط نمبر گیارہ اور بارہ فارسی نظم میں ہیں جو حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ

علیہ کے نام تحریر فرمائے گئے ہیں۔ خط نمبر ایک سے لے کر نمبر دس تک کے خطوط فارسی نثر میں ہیں، لیکن ان میں بہ کثرت فارسی اشعار درج ہیں۔ ان اشعار میں زیادہ تر ان کے اپنے اشعار ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کے دست یاب خطوط کا اردو ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فارسی اشعار درج کر کے نیچے ان کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ دو تین کے سوا مکتوب الیہم کے حالات کا علم نہیں ہو سکا۔ تمام مکتوبات نہایت سبق آموز اور بے حد پُر تاثیر ہیں۔ قارئین کرام ان مکتوبات کا انتہائی غور سے مطالعہ فرمائیں۔

(۱)

پہلا خط مولوی محمد اعظم کے نام ہے جو مولانا غلام رسول کے برادرِ نسبتی تھے۔

برخوردار مولوی محمد اعظم

عزیز! اپنے عزیز اوقات کو برباد نہ کریں اور اپنے نفیس سانسوں کو نیکی میں بسر کریں۔ کوشش کریں کہ خود کو کسی ایسے مرد کی خدمت میں پہنچائیں جو زنگ آلود دلوں کو آئینے کی مانند صاف کرنے والوں میں سے ہو:

گر خدا خواہی وہم دنیائے دوں
ایں خیال است ومحال است و جنوں

"اگر تو خدا کو چاہے اور (اس کے ساتھ) کمینی دنیا کو بھی، تو یہ (محض تیرا) خیال ہے جو محال اور دیوانگی ہے۔"

ٹھیک ٹھیک لکھ رہا ہوں اور تبلیغ کی شرط پوری کر رہا ہوں:

اگر با خویشتن عمرے بسر ایں راہ را پوئی

نہ از مقصد نشاں یابی نہ ایں راہ را کراں بینی

زخاکِ دامن مردے بکش درچشم جاں گردے

کہ تا زیں چشم نورانی جمالِ جانِ جاں بینی

"اگر تو خود (اکیلا) عمر بھر سر کے بل اس راستے پر دوڑتا رہے تو نہ مقصد کا نشان پا سکے گا (اور) نہ اس راستے کا (آخری) کنارہ دیکھ سکے گا۔ کسی مرد (خدا) کے دامن کی خاک کا سرمہ آنکھ میں ڈال لے، تاکہ اس نورانی آنکھ سے جانِ جاں کو دیکھ لے۔"

اس فقیر کے خیال کے مطابق عبداللہ جیسا کوئی سنت کا پیروکار اور ارباب حقیقت کا منتخب (شخص) نہیں مل سکتا۔ [1] وہ (مجذوب الٰہی) ہیں، اللہ کے محبوب ہیں اور دائمی معرفت والے ہیں۔ اللہ کی رضا ان کی چاہت ہے۔ وہ ایک کامل و مکمل (مرشد) ہیں۔ ان کی نظیر اس زمانے میں نہیں ملتی۔ طالبین کی تربیت جیسی ہونی چاہیے، وہ ان کے ہاں موجود ہے۔ عبداللہ صاحب نے لکھا تھا کہ صاحب استعداد کو حقیر کی صحبت میں روانہ کریں۔ یہ اس بنا پر ہے کہ اشاعتِ سنت کے لیے وہ مضبوط سند ہیں اور اس معاملے میں ان کا مقصد جناب رسول اللہ ﷺ کی متابعت ہے، جس کے لیے قوی ہمت درکار ہے، اور (آیت) کریمہ: والذین لا یخافون لومة لائم [2] کو نصب العین بنانا

---

[1] عبداللہ سے حضرت سید عبداللہ غزنوی مراد ہیں، جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہوا۔ [2] یہ سورہ مائدہ کی آیت نمبر 54 کے الفاظ ہیں۔ ترجمہ یہ ہے: کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

چاہیے۔ پھر کمال اخلاص کے ساتھ:

کند از فرق پاوزیدہ نعلین
شود سوئش رواں بالراس والعین

''پاؤں سے جوتے الگ کرکے، اس کی طرف سر اور آنکھوں کے بل چلنا چاہیے۔''

ورنہ ٹال مٹول اور بہانہ سازی سے کام نہیں چلے گا، جب وقت گزر گیا تو حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

والسلام علیکم
فقیر غلام رسول از قلعہ

(۲)

برخوردار محمد اعظم جی

ہمارا دل ہمیشہ آپ عزیز کے علمی و عملی کمالات کو حاصل کر لینے کی طرف متوجہ رہتا ہے، تاکہ ضروری علوم کی تحصیل سے فراغت کے بعد آپ ارباب یعنی (اولیائے کرام) کی صحبت کی سعادت حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہو جائیں:

کا نچہ ضرور یست چو حاصل کنی
بہ کہ عمارت گری دل کنی
آ نست عمارت گری دل
واکشی از کش مکش آب وگل

''جو علم ضروری ہے، جب تو وہ حاصل کر لے، تو پھر دل کی عمارت گری کر۔ دل کی عمارت گری یہ ہے کہ آب وگل (دنیا) کی کش مکش سے جدا ہو جائے۔''

لیکن جب سے میں نے آپ کے منصب تدریس سے وابستہ ہو جانے کی خبر سنی ہے تو یقین ہو گیا ہے۔

بس غلط بود آنچہ ماپند اشتیم

''وہ بے حد غلط تھا جو ہم نے گمان کر رکھا تھا۔''

افسوس کہ استعداد کی آگ جو کہ کمال انوار کے بھڑ کانے کے لائق تھی، وہ آپ نے بلا مقصد مصروفیات میں راکھ کی طرح ضائع کر ڈالی اور جو مساعی جمیلہ اس عمر میں ملکات قدسیہ کے تحصیل کی معاون (بنتی) ہیں، ان کو خاک میں ملا ڈالا:

تروم العز ثم تنام لیلا
من طلب العلیٰ اسحر اللیالی

''تم سربلندی چاہتے ہو، پھر رات کو سوتے بھی ہو، جو بلندیوں کا طلب گار ہوتا ہے، وہ راتوں کو جاگتا ہے۔''

اس ضمن میں تاسف آمیز اور غفلت انگیز عذر نہیں سنے جائیں گے۔ اگر حافظ محمود کے ہمراہ عبداللہ صاحب [1] کی صحبت میں پہنچ جاتے تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ خیر گزر گیا جو گزر گیا۔ اب بھی وقت ہے۔ ہاتھ سے نکل جانے والا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا:

کنونت کہ چشم است اشکے ببار

[1] حضرت سید عبداللہ غزنوی مراد ہیں۔

زباں دردہان ست عذر ے بیار

''اب جب کہ تیری آنکھ ہے، ایک آنسو (ہی) بہالے، زبان جب منہ میں ہے، کوئی عذر ہی کرلے۔''

مبادا ان جنون آمیز باتوں سے آپ کی طبیعت پریشان ہوجائے، لیکن کیا کروں، یہ چیز (میرے) اختیار میں نہیں ہے، خواہ مخواہ میرا دل جوش میں آرہا ہے:

اگر با خویشتن عمرے بسرایں راہ را پوئی
نہ از مقصد نشاں یابی نہ ایں راہ را کراں بینی
زخاکِ دامن مردے بکش در چشم جاں گردے
کہ تازیں چشم نورانی جمالِ بے نشاں بینی

''اگر تو خود (اکیلا) عمر بھر سر کے بل اس راستے پر دوڑتا رہے تو بھی نہ مقصد کا نشان پائے گا (اور) نہ اس راستے کا (آخری) کنارہ دیکھ سکے گا۔ کسی مرد (خدا) کے دامن کی خاک کا سرمہ آنکھ میں ڈال لے، تاکہ اس نورانی آنکھ سے تو بے نشان کے جمال کو دیکھ لے۔''

والسلام

فقیر غلام رسول از قلعہ

(۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوۃ علی رسولہ الذی لا نبی بعدہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسائر من بذل فی مرضیات اللہ جھدہ۔

''سب تعریفیں اللہ یکتا کے لیے ہیں اور درود ہو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کے بعد کوئی نبی نہیں! اور آپ کی اولاد وصحابہ کرام پر اور ان تمام لوگوں پر جنھوں نے اللہ کی رضا میں اپنی محنت صرف کردی۔''

سلام مسنون کے بعد واضح ہو کہ آپ سعادت مند کو کیا لکھوں اور کیا تحریر کروں؟ جوانی کے دن مسافر ہیں اور زندگی پانی کے بلبلے کی طرح ہے، لیکن ہم کس مشغلے میں قیمتی اوقات کو برباد کر رہے ہیں؟ اور کیوں بے فائدہ کاموں میں خدا داد صلاحیت کے پھل دار درخت کی جڑیں کسّی سے اکھیڑ رہے ہیں؟ کیا ہم دیوانے ہیں جو نہیں سمجھتے؟ اور عقل سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں کہ اس کے ضائع کرنے میں مصروف ہیں۔ افسوس، ہزار افسوس:

قدرِ وقت از نشنا سد دل وکارے نکند
بس خجالت کہ ازیں حاصل اوقات بریم

''اگر دل وقت کی قدر نہ پہچانے اور کوئی کام نہ کرے تو بس ہم ان حاصل اوقات سے (کل قیامت میں) شرمندگی ہی اٹھائیں گے۔''

ہمیشہ دو چیزوں کا حصول ضروری اور لازمی ہے۔ ایک کتاب وسنت کا ادراک رکھنے کی علمی پونجی، جو دینی علوم کا سرچشمہ اور معنوی علوم کا خلاصہ ہے۔ دونوں

چیزیں شمع کا درجہ رکھتی ہیں، جن کو دائیں اور بائیں (طرف) رکھ کر راستہ طے کیا جا سکتا ہے۔

دوسری چیز پابند شرع حضرات صوفیا کا طریقہ ہے، جو کام کی اصل، اسلام کی اساس اور ذوق و وجد کی مورث ہے۔ وہ جسم شریعت کے لیے جان کا درجہ رکھتی ہے اور صورتِ اسلام کی حقیقت اور روح ہے۔ ابھی تک ان دونوں کی خوشبو سے آپ عزیز کا دماغ معطر نہیں ہوا۔ (دنیاوی) تعلقات اور ننگ و نام کی رکاوٹیں حائل ہیں۔

تعلق حجاب است و بے حاصلی
چو پیوند ہا بگسلی واصلی

''(دنیاوی) تعلق پردہ ہے اور بے حاصل، جب تو (دنیاوی) تعلق توڑ ڈالے گا تو (حق تعالیٰ سے) تعلق جوڑ لے گا۔''

علم ظاہری کے اساتذہ ہر جگہ موجود ہیں، مولانا محمد حسین بٹالوی نے دہلی سے کتنا اچھا ملکہ بہم پہنچایا اور علمی فیوض کا مورد بنے۔ سبحان اللہ۔ بہت سے خاندان تحصیل کمال کی چاہت سے عاری، غافل اور دوسرے (لوگ) اللہ کی مہربانی سے فضل و علم سے متصف اور سرفراز ہیں:[1]

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں راہ کہ تو می روی بترکستان است

---

[1] مولانا محمد حسین بٹالوی جلیل القدر عالم تھے۔ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے۔ 1920ء کو فوت ہوئے۔

"اے اعرابی! میں ڈرتا ہوں کہ تو کعبہ تک نہیں پہنچ سکے گا، کیوں کہ جس راستے پر تو چل رہا ہے، (یہ) ترکستان کو جاتا ہے۔"

افسوس، صد افسوس کہ استعداد کی دولت برباد ہو رہی ہے، ابھی وقت ہے:

تروم العز ثم تنام لیلاً

ومن طلب العلی اسحر اللیالی

"تم عزت چاہتے ہو اور رات کو سوتے بھی ہو، جو بلندیوں کا طلب گار ہوتا ہے، وہ راتوں کو جاگتا ہے۔"

اس رقعہ لے جانے والے کی بابت کتنا افسوس ہو رہا ہے کہ اتنی عمر لہو و لعب میں ضائع کر دی اور آپ بھی شفقت واخوت اور صلہ رحمی کی دلیل ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ جہل مرکب کس طرح اس خاندان میں پیدا ہو گیا ہے کہ دینی علوم حاصل نہیں کر رہا ہے۔

ملتان میں مولوی عبید اللہ کے فرزند مولوی عبدالرحمٰن اچھے عالم ہیں، ریاضی اور حدیث کے علوم کی تعلیم بہت اچھی طرح دیتے ہیں۔ دہلی میں مولانا نذیر حسین علوم دینیہ پڑھانے میں بہت مہارت رکھتے ہیں۔ وہیں مولوی سدید الدین لکھنوی علوم عقلیہ میں بے حد کامل موجود ہیں۔ باطنی علوم کے لیے صاحب زادہ رکن عالم صاحب اور جناب (سید) عبداللہ صاحب غزنوی کا سلسلہ ہے۔

والسلام

فقیر غلام رسول از قلعہ

(اس خط میں مکتوب الیہ کا نام درج نہیں، لیکن سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط بھی مولوی محمد اعظم کی طرف لکھا گیا ہے۔)

(۴)

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی

اس فقیر کی جانب سے السلام علیکم کے بعد برخوردار محمد اعظم عظمہ اللہ تعالیٰ بتوفیق الخیر (اللہ تعالیٰ بھلائی کی توفیق سے انھیں عظمت بخشے) غور کریں کہ جوانی مسافر ہے اور یہاں (دنیا میں) بار بار آنا نہیں ہوگا۔ فرصت اور صحت کی یہ نعمت ہر روز میسر نہیں رہے گی:

قدرِ وقت ارنشا سد دل وکا رے نکند
بس خجالت کہ ازیں حاصل اوقات بریم

''اگر دل وقت کی قدر نہ پہچانے اور کوئی کام نہ کرے تو ہم ان حاصل اوقات سے (کل قیامت میں) شرمندگی ہی اٹھائیں گے۔''

دو کام بڑے اہم ہیں، ایک دینی علوم کی تحصیل اور دوسرا ارباب جمعیت (اولیاً اللہ) کی صحبت، جو سب سے اونچا مقصد ہے:

با ہر کہ نشینی ونشد جمع دلت
وز تو نرمید زحمت آب وگلت
زنہار زصحبتش گریزاں می باش

ورنہ نکند روح عزیزاں بحلت

''تو جس کے ساتھ بیٹھے اور دل کو جمعیت (سکون) حاصل نہ ہو اور تجھ سے آب وگل (دنیا) کی محبت نہ چھوٹے، خبردار! ایسے شخص کی صحبت سے دور بھاگ، ورنہ اپنے پیاروں کی روح (مبارک) تجھے معاف نہیں کرے گی۔''

بلکہ اصحابِ حقیقت نے لکھا ہے کہ ایک گھڑی خود اپنے ساتھ بیٹھ کر اور خیال کی آنکھ کو ماسوی اللہ سے بند کر کے اس شعر کا مضمون سمجھ لے۔

من ملک بودم و فردوس بریں جائم بود

آدم آورد دریں دیر خراب آبادم

''میں فرشتہ تھا اور فردوس بریں میرا گھر تھا۔ اس خانہ خراب دنیا میں مجھے (حضرت) آدم (علیہ السلام) لائے ہیں۔''

نیز اپنی روح کو خطاب کر کے عتاب کرے:

خیز غافل بالِ ہمت باز کن

سوئے جائے اصلیت پرواز کن

طوطی شیریں مقالی چند چند

باشی اندر حبسِ زاغاں پائے بند

''اٹھ اے غافل! ہمت کے پر کھول (اور) اپنے اصلی گھر کی جانب پرواز کر۔ تو شیریں زباں طوطی ہے، کب تک کوّوں کے قید خانے میں بند رہے گا۔''

جب محض اللہ سبحانہ کی عنایت سے، کسی کی کوشش کے بغیر ایک بشارت عظمیٰ کا شرف نصیب ہوگیا، اس کھانے کا مزہ چکھ، ذائقہ کا ذوق لگا اور تلچھٹ کی

لذت طلب کے حلق تک پہنچ گئی تو پھر افسوس ہے کہ (زندگی) بے مقصد مصروفیات میں برباد کریں اور نفسانی خواہشات کے سرور میں گزاریں۔

(حضرت) امام ربانی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں:

ہمہ اندرز من بہ تو ایں است
کہ تو طفلی وخانہ رنگیں است

''میری تمام نصیحت تجھے یہ ہے کہ تو ایک بچہ ہے اور گھر (یہ دنیا) بڑی رنگین ہے۔''

اگر فرصت کے اوقات میں سورہ فاتحہ بسم اللہ اور آمین کے ساتھ ہر دفعہ آیات کا تکرار کرتے اور معانی کا لحاظ رکھتے ہوئے پڑھی جائے تو یہ جذب الٰہی کی کنجی ہے اور فرصت کے دنوں میں درود شریف حلیہ مبارک کے لحاظ سے پڑھنا مذکورہ بالا حال کے ورود کا موجب ہے، صلی اللہ علی حبیبہ محمد وآلہ وسلم۔

اگر سہام حوادث ترا نشانہ کنند
پناہ بہ درودِ جناب مصطفوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

''اگر حادثات کے تیر تجھے نشانہ بنائیں تو تو جناب مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود (شریف) پڑھ کر پناہ حاصل کر۔''

والسلام

فقیر غلام رسول از قلعہ

⑤

حکیم نبی بخش صاحب مرحوم ساکن کھبیکی تین روز متواتر مولانا غلام رسول کو ملنے نہ آئے، چوں کہ حکیم صاحب آپ کے شاگرد تھے اور تقریباً ایک میل کے فاصلے پر رہتے تھے، اس لیے آپ نے صرف یہ دو شعر لکھ کر بھیجے:

نبی بخشا عجب بالا دماغی!
ز شغالِ زمانہ دل فراغی

سہ روز آمد زِحال تو خبر نیست
زِآمد و رفت تو ایں جا اثر نیست

''اے نبی بخش! تو عجب بڑے دماغ والا ہے، تو زمانے کی مصروفیات سے فارغ ہے۔ تین روز ہو گئے، تیرے حال کی کوئی خبر نہیں، (اور) تیرے آنے جانے کا یہاں کوئی نشان نہیں۔''

⑥

الحمد لله وحده والصلوٰة على رسوله الذى لا نبى بعده وعلى آله واصحابه وسائر من بذل فى مرضيات الله جهده.

اما بعد، دینی بھائی خدایارو ذیلدار صاحب، فیض بخش اور سعادت آموز میاں محمود خاں صاحب۔

السلام علیکم

میرے عزیز! انسان کی سعادت اس میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فرمان پر

عمل کرے اور جس چیز سے روکا گیا ہے (اس سے) خود کو بچائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنه فانتھوا﴾ (الحشر:7)

"تمھیں رسول ﷺ جو عطا فرمائیں وہ لے لو، اور جس سے تمھیں منع کریں، اس سے باز رہو۔"

لیکن ہمارے دلوں پر غفلت کا پردہ اس طرح پڑا ہوا ہے اور مرغ روح کے پروبال یوں کاہلی میں لتھڑے ہوئے ہیں کہ ہم کبھی بھی خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتے اور اسی طرح اندھوں کی مانند راہ چلتے رہتے ہیں۔ ایک روز آئے گا کہ یہ ظاہری شان وشوکت برباد ہوجائے گی اور یہ بے وفاؤں کے تعلقات ختم ہوجائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ھلك المسوفون" (ہلاک ہوگئے دیر کرنے والے)۔

ایں قدر عمرے کہ ماند ست باز
تادر آخر بنی روزے عزو ناز

"جتنی زندگی تیری باقی رہ گئی ہے، اسے قربان کردے، تاکہ آخرت میں (قیامت کے دن) تو عزت اور مقام حاصل کرے۔"

واپسی کے دن ہمارے کردار کے بارے میں پوچھا جائے گا اور ہر آدمی اپنے اعمال کی جزا دیکھ لے گا۔

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۞ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾

(سورۃ الزلزال، آیت 7،8)

''پس جس نے ایک ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ایک ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔''

جوانی برسرِ کوچ است دریاب ایں جوانی
کہ کس ہرگز نمی آید دوبارہ زندگانی را
بزر نخریدۂ جاں رازاں قدرش نمی دانی
کہ ناداں قدر نشناسد متاع رائیگانی را

''جوانی کوچ کرنے والی ہے، اس جوانی کی قدر کر کہ آدمی کو دوبارہ زندگی ہرگز نہیں ملے گی۔''

تو نے جان کو دولت سے نہیں خریدا، لہٰذا اس کی قدر تو نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ نادان ضائع ہونے والی متاع کی قدر نہیں پہچانتا)۔

چاہیے کہ گزشتہ لوگوں کے قبرستان کو عبرت کی نگاہ سے دیکھیں اور مرنے والوں کے حال پر غور کریں اور کہیں:

افسوس کہ گل رخاں کفن پوش شدند
واز صحبت ہم دماں فراموش شدند
آناں کہ بصد زبان سخن می گفتند
آناں چہ شنیدند کہ خاموش شدند

''افسوس کہ پھول سے چہروں والے (حسین) کفن پوش ہوگئے، اور وہ ہم دموں کی صحبت سے بھلا دیے گئے۔''

وہ جو کہ سو طرح کی باتیں کیا کرتے تھے، انھوں نے کیا سن لیا کہ خاموش

ہو گئے ہیں؟)

اس کے علاوہ افسوس یہ ہے کہ بندوں کے حقوق ادا نہیں کیے جاتے۔

ہیں مگو فردا کہ ہا گزشت
تا نہ کلی بہ گزرد ایام کشت
ایں قدر تخمے کہ باید ست کار
تا در آخر دردہد صد برگ و بار

"خبردار! مت کہو کل، کہ کتنے ہی کل گزر گئے! جب تک کہ کھیتی (زندگی) کے دن پورے نہیں ہو جاتے۔"

اتنا بیج جو کہ تیرے کام کے لیے ضروری ہے (وہ بیجتا رہ) تاکہ (یہ) آخرت میں سیکڑوں پتے اور پھل دے)۔

ذرہ ذرہ کے بارے میں سوال ہوگا، جو کچھ ہم نے کیا ہے، (اس کا) اچھی طرح حساب کریں گے:

چہ مغروری دریں دنیا مگر مردن نمی دانی

"تو اس دنیا میں کیسا مغرور (ہوگیا) ہے، مگر تجھے مرنا یاد نہیں"

نکردی، ہیچ کارے در جوانی
چرا برباد دادی زندگانی
بزیر خاک خواہی رفت روزے
زحسرت باشدت درسینہ سوزے
نہ آنجا ذیلداری راو قارے

نہ نمبر دار یا ں را اعتبارے

بلرز دحا جیاں ر از غمش جاں

زہیبت مولوی راسینہ سوزاں

بگو ئیند اندر آں عرصات قدسی

جناب انبیاء یا رب نفسی

بآخر نیک بختاں کامیاب اند

شریراں سر بسردر پیچ و تاب اند

چو باشد باز پرسی مستعداں را

کجا باشد نجاتے مریداں را

مخالف مصطفٰے مرد ود باشد

طریق مصطفٰے محمود باشد

اگر جز مصطفٰے باشد نجاتے

بجز سنت رسول اللہ براتے

جہنم راچر اپس آفر یدند

چرا کفار مستوجب وعیدند

والسلام

فقیر غلام رسول از قلعہ

''تو نے جوانی میں کوئی کام نہیں کیا، زندگی کو برباد کیوں کیا ہے۔''

ایک روز مٹی کے نیچے چلا جائے گا، حسرت سے تیرے سینے میں ایک درد ہوگا۔

نہ وہاں ذیلداری کا کوئی وقار (اور) نہ نمبرداریوں کا کوئی اعتبار۔

حاجیوں کی جان اس کے ڈر سے لرز جائے گی، اس کے خوف سے مولوی کا سینہ جلے گا۔

اس میدان قدسی میں کہیں گے حضرات انبیائے کرام اے رب نفسی!

آخر کار نیک بخت کامیاب ہوں گے (اور) شریر سر سے پاؤں تک عذاب میں ہوں گے۔

جب (نیکی کی) کوشش کرنے والوں سے باز پرس ہوگی تو پھر برے عمل کرنے والوں کی نجات کیوں کر ہوگی؟

(حضرت) مصطفیٰ ﷺ کا مخالف مردود ہوگا، (حضرت) مصطفیٰ ﷺ کا طریقہ محمود ہوگا۔

اگر (حضرت) مصطفیٰ ﷺ کے سوا نجات ملتی اور سنت رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کامیابی ہوتی۔

تو پھر جہنم کو کس لیے پیدا کیا گیا (اور) کافروعید (عذاب) کے مقدر کیوں بنے؟)

⑦

یہ خط وہ علمائے کرام مہربانی فرما کر ضرور پڑھیں، جن کی عادت مسلمانوں کو کافر قرار دینا اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈالنا ہے۔

میرے عزیز چودھری فیض بخش، محمود خاں اور حاجی الحرمین خدایار سلامت رہو۔ فقیر غلام رسول کی طرف سے السلام علیکم ...... ان دنوں حاجی صاحب کی

زبانی معلوم ہوا کہ چند روز سے ہمارے اور ذیلدار کے درمیان کوئی بات چیت ہوئی ہے، جس کے بعد فیض بخش مسجد میں (آنے کا) شرف نہیں حاصل کرتے۔ یہی معاملہ چند باتیں لکھنے کا باعث ہوا ہے۔ بڑے غور سے سنیے کہ ہم سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننے کا جو فرمان ہے، اس میں برابر ہیں اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے مامور ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق رکھیں، خصوصاً اسلام کی نسبت کی وجہ سے باہم متفق رہیں۔ آپس میں نفاق (رکھنا) اور اسلامی بھائیوں میں تفرقہ (ڈالنا) حرام ہے۔ صلہ رحمی فرض ہے اور برکات کا ذریعہ اور نیک نامی کا سبب ہے:

زاتفاقِ مگس شہد می شود پیدا
خدا چہ دولت ونعمت در اتفاق نہاد

"مکھیوں کے اتفاق سے شہد پیدا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اتفاق میں کیسی دولت ونعمت رکھی ہے۔"

ذیلدار ذیلداری کو بھلا کر محمود خاں کے ساتھ حسن معاملہ سے پیش آئیں کہ بھائی آپس میں حسن سلوک رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے مشورے سے کام کرتے ہیں، اور محمود خاں کے لیے ضروری ہے کہ ملکیت کے غرور کو الگ رکھ کر ذیلدار کے ساتھ یوں اچھے اخلاق سے پیش آئے، جس طرح کہ چھوٹے بھائی بڑے بھائیوں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ جو مشورہ خلاف دین نہ ہو، اس سے باہر نہ جائیں۔ حاجی صاحب خود بھی سوچیں کہ ہم درویش سیرت لوگ حسنِ خلق اور سیرتِ نیک کے پابند ہیں، سخت گیری جو کہ رضائے الٰہی کے

خلاف ہے، اس سے الگ ہوکر یوں (برتاؤ) کریں کہ ہم میں سے کسی مسلمان کا دل آزردہ نہ ہو اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ اور فساد نہ ہو، کیوں کہ حدیث صحیح میں آیا ہے جو مسلمان کے ساتھ تین روز میں صلح نہ کرے، اس کے ایمان میں خلل ہے۔ اگر ناراض نہ ہوں تو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر لکھوں، خوب کہا جو کہا:

حاجی تو نیستی شتراست از برائے آنکہ
بے چارہ خار می خورد وبار میں کشد

”تو حاجی نہیں (بلکہ) اونٹ ہے، جو بے چارہ کانٹے کھاتا ہے اور بوجھ اٹھاتا ہے۔“

جی ہاں! اس سے بھی زیادہ ذیلدار اور محمود خاں کی بے اتفاقی فساد اور تفرقے کا سبب ہے:

چرا ایشاں نمی باشند چوں شیرو شکر باہم
عجب ذوقے بکام دیں رسد زیں کامرانی ہا

”وہ آپس میں شیر وشکر کیوں نہیں ہوتے۔ یہ ایسا عجیب ذوق (عمل) ہے، جس سے دین کے کام کو کامیابیاں ملتی ہیں۔“

جو صلح کا آغاز کرتا ہے، اس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ اس نصیحت پر کار بند ہوں گے اور سب کے ساتھ صلح سے پیش آئیں گے اور کاموں کا انتظام دونوں مشورے سے کریں گے:

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند

جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

''اے جاناں! نصیحت سن لے کہ سعادت مند جوان دانا بوڑھے کی نصیحت کو جان سے بھی زیادہ دوست رکھتے ہیں۔''

حافظ (شیرازیؒ) کا شعر ہے:

بمجلس نوجواناں راکہن پیرے ضرور آمد

حرارت دارد ایں معجون وطبا شیرے ضرور آمد

''نوجوانوں کی مجلس کے لیے تجربہ کار بوڑھا ضروری ہے، (کیوں کہ) یہ معجون گرمی رکھتی ہے اور (اس کے لیے) ایک طبا شیر لازمی ہے۔''

اس فقیر کی جانب سے ہر تین (صاحبان) کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا ہے کہ اس کی ذات پاک انھیں ظاہری اور باطنی اطمینان نصیب کرے۔ جاننا چاہیے کہ ہمارا دین دو چیزیں ہیں:

﴿ما آتاکم الرسول فخذوه وما نهکم عنه فانتهوا﴾

(سورۃ الحشر آیت7)

ایک حکم کا بجالانا اور دوسرا منع کردہ چیزوں اور گناہوں سے رک جانا۔ خصوصاً جو آدمی حرام پر قدرت رکھتا ہو، اور پھر وہ (اس سے) بچے، اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے اور بعض فرشتوں سے اس کے درجات بڑھ جائیں گے۔ کون آدمی زندگی میں حرام خوری کو پیشہ بناتا ہے، جو اپنی آخرت کا فکر رکھتا ہے۔

فقط والسلام

غلام رسول از قلعہ

(۸)

اس خط کے متعلق معلوم نہ ہوسکا کہ کس کے نام تحریر فرمایا گیا، یہ تعزیتی قسم کا خط ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ذیل میں دیا جارہا ہے۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ فی السراء والضراء والرخاء والعسر والیسر والنعمۃ والبلاء والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ سید الرسل والانبیاء محمد الذی ابتلی بلاء ما ابتلی مثلہ احد من الاصفیاء وعلیٰ آلہٖ واصحاب البلاء قدوۃ ارباب الصفاء راضین با لقضاء واصحابہٖ عمدۃالاولیاء.

امابعد!

للّٰہ ما اخذ وما اعطیٰ وکل شئی عندہ باجل مسمی.

تمام ستائشیں اللہ کے لیے ہیں، خوشی میں، غمی میں، تنگی میں، کشادگی میں، سختی میں، آسانی میں، نعمت میں، آزمائش میں۔ اور درود وسلام ہو، اس کے پیغمبر (ﷺ) پر جو پیغمبروں کے سردار ہیں۔ جو ایسی سخت آزمائش سے دوچار کیے گئے کہ وہ آزمائش اس کے منتخب بندوں میں سے کسی کی نہیں ہوئی۔ آپ (ﷺ) کی آل پر سلام ہو جو آزمائش والے تھے، اربابِ صفا کے نمونہ تھے۔ اللہ کے فیصلے پر راضی تھے، نیز سلام ہو آپ (ﷺ) کے صحابہ کرام پر جو عمدہ ترین اولیاء اللہ تھے۔

امابعد!

اللہ ہی کے لیے ہے جو چیز وہ لے اور جو دے، اور ہر چیز اس کے پاس مقررہ وقت کے مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ تمھاری قدر بڑھائے۔ یاد رہے رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت اور جگر گوشے شان محبوبیت کے تقاضے سے گوناگوں مصائب میں مبتلا رہے ہیں۔ رضا بالقضا جوکہ ولایت کے بلند مقامات میں سے ہے، کے تحت گویا انھوں نے میدان بزرگی میں سبقت پائی اور اپنے اختیار کی باگ ڈور کمال رضا وتسلیم سے اپنے مولا (اللہ تعالیٰ) جل شانہ کے سپرد کردی اور اس بشارت سے مشرف ہوئے:

﴿وبشر الصابرين الذين اذا اصابتهم مصيبة قالوا انا لله وانا اليه راجعون﴾ (سورۃ البقرہ، آیت 156)

اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

﴿وتو اصوا بالحق وتوا صوا بالصبر﴾ (سورۃ العصر، آیت3)

کی رو سے اسی وصیت کو اپنے لیے قابل اتباع عمل قرار دیا۔ پس صبر کرنے اور رضا بالقضاء کے سوا چارہ نہیں ہے اور مضمون: ”من لم يرض بقضائی فليطلب ربا سوائی“ (جو شخص میری قضا پر راضی نہیں، وہ میرے علاوہ کوئی اور رب تلاش کرلے) کے تحت بے صبری اور آہ وبکا سے باز آجانا چاہیے۔ ایک عزیز نے کہا ہے:

مسافرے نرسید از عدم کزو پرسم

کہ پیرِ چرخ کجا برد نوجوان مرا

''کوئی مسافر عدم سے (واپس) نہیں آیا کہ میں اس سے پوچھوں کہ بوڑھا آسمان میرے نوجوان کو کہاں لے گیا؟''

ایک دوسرے نے کہا ہے:

افسوس کہ گل رخاں کفن پوش شدند
واز صحبت ہم دماں فراموش شدند
آناں کہ بصد زبان سخن می گفتند
آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

''افسوس کہ پھول سے چہروں والے (حسین) کفن پوش ہو گئے اور دوستوں کی صحبت سے محروم ہو گئے۔
وہ لوگ جو کہ سو طرح کی باتیں کرتے تھے، انھوں نے کیا سن لیا کہ خاموش ہو گئے ہیں؟''

اپنی گزشتہ عمر پر افسوس کرتے ہوئے زار و قطار رونا چاہیے اور چشم عبرت سے ظاہری جاہ وجلال رکھنے والوں کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کیسے تھے؟ اور کہاں چلے گئے؟

آں قصر کہ با چرخ ہمی زد پہلو
برد رگہ اوشہاں نہادندے رو
دیدیم کہ بر کنگرش فاختہ
بازِ سو زہمی گفت کہ کو کو، کوکو

''وہ محل جو (بلندی میں) آسمان سے ملا ہوا تھا، جس کی چوکھٹ پر بادشاہ ادب سے اپنے چہرے رکھتے تھے،

ہم نے دیکھا کہ اس کی چوٹی پر فاختہ بیٹھی بڑے سوز کے ساتھ چیخ رہی تھی ''کوکو، کوکو'' (اے انسانو! بالآخر کوچ کرنا ہے)۔''

باوجود اس کے کہ نقارۂ کوچ ہمارے کانوں میں بجا رہے ہیں، ہم غفلت کی نیند سے بیدار نہیں ہوتے اور روز بروز غفلت کے گڑھے اور خواہشاتِ نفسانی میں دھنستے جا رہے ہیں:

عید و شیفتہ رو صبح و شادی شدو رفت
شادی و غم وہجوم عامی شد ورفت
ایں غنچۂ زلال وصحبت سیم تناں
در عالمِ خواب احتلامے شدورفت

''عید اور مدہوش کن چہرے والی خوشی آئی اور گزر گئی۔ خوشی، غمی اور لوگوں کا جمگھٹا ہوا اور ختم ہوگیا اور چلے گئے۔

یہ ایک خوب صورت باغیچہ اور چاندی کے جسموں والے (حسینوں) کی صحبت ہے، گویا عالم خواب میں اسے دیکھا اور (سب کچھ) ختم ہوگیا۔''

شیخ سعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

دو بینم کرور وز کباب
کہ می گفت گوئندہ بارياب
در یغا کہ ماہے روز گار

بروید گل و بشگفد نو بہار
بسا تیرو دے ماہ اردی بہشت
بیائید کہ ماخاک با شیم و خشت

والسلام علیکم غفر اللہ تعالیٰ لنا ولکم

فقیر غلام رسول از قلعہ

⑨

یہ خط حضرت مولانا غلام رسول صاحب نے اپنے شاگرد مولوی علاء الدین صاحب (گوجراں والا) کو دہلی لکھ کر بھیجا تھا، جب مولوی علاء الدین وہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الذی لا نبی بعدہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وعلیٰ سائرمن بذل فی مرضیات اللّٰہ جہدہ۔

امابعد، عزیز (من)! آپ کا رقعہ ملا، مجھے خوشی ہوئی۔ آپ کے والد بہت انتظار میں تھے، اتنے زیادہ کہ اس کی انتہا نہیں۔ علم دین آیا تھا کہ شہاب الدین سے سنا تھا کہ عید کے بعد آئیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ تمھیں ان کو خط لکھنا چاہیے۔ تمھارے خط کے بغیر وہ مطمئن نہیں ہوں گے۔ میرے عزیز! مرزا (صاحباں) پڑھو بالحمد اللہ، ہمیں اتنی فرصت نہیں، جو علم حدیث

کے لیے (درکار) ہے۔ علم کا مدار عمل پر ہے اور عمر گزر رہی ہے۔ تمھارے عمل میں غفلت اور سستی موجود ہے۔ مجھے خبر نہیں کہ تمھیں کس کس کی صحبت حاصل ہے، اچھے لوگوں کی یا برے لوگوں کی؟ لیکن افسوس! صد افسوس:

صحبت نیکاں زجہاں دور شد
خانہ عسل خانۂ زنبور شد

''نیک لوگوں کی صحبت دنیا سے اٹھ گئی، شہد کا چھتہ، بھڑوں کا ٹھکانا بن گیا ہے۔''

اچھی باتیں کرنے سے کام نہیں بنتا، بلکہ اچھے کردار سے (کامیابی ہوتی ہے)، میرے عزیز! اِس وقت موت کا قاصد آپہنچے تو آخرت میں کیا جواب دو گے کہ میں کس مشغلے میں تھا؟

ببام منطق اے سلم نہادہ
زادج اہتدا دور افتادہ
بجز حب خداوند تبارک
مبارک نیست ایں قاضی مبارک
زحمد اللہ تغیر یافت حال
بحمد اللہ نبودت ہیچ اشغال

''اے وہ! جو منطق (اور) سلم کی چوٹی پر جا پہنچے، (تم) ہدایت کی چوٹی سے دور ہو گئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت کے سوا یہ ''قاضی مبارک'' مبارک نہیں ہے۔''

''حمداللہ'' سے تیری حالت بدل گئی (اور) تجھے اللہ تعالیٰ کی حمد سے ذرہ بھر (بھی) لگاؤ نہیں!

میرے عزیز! یہاں بار بار آنا (نصیب) نہیں ہوگا، آخر کار ایک روز اس جہاں سے جانا ہوگا۔ هلك المسوفون (ہلاک ہو گئے دیر کرنے والے) کی صدا سنیں گے:

ہیں مگو فردا کہ فردا ہا گزشت
تابکلی نگزرد ایام کشت
ایں قدر تخمے کہ باید ست بکار
تادر آخر در دہد صد برگ وبار
ایں قدر عمرے کہ ماند ستت بباز
تا در آخر بینی از روے عزد ناز
روبگو رستان دمے خامش نشیں
وآں خمو شانِ سخن گور بہ بیں
گرچہ یکساں ست روئے خاکشاں
نیست یکساں حالتِ چاالاک شاں
لحم و شحمِ زندگاں یکساں بود
آں یکے غم گین و ایں شاداں بود

''خبردار! کل کل مت کہو کہ کتنے ہی کل گزر گئے! جب تک کہ کھیتی (زندگی) کے دن پورے نہیں ہو جاتے۔''

اتنا بیج جو کہ تیرے کام کے لیے ضروری ہے (وہ بو تارہ)، تاکہ (یہ) آخرت میں سیکڑوں پھول اور پتے اور پھل دے۔

جتنی زندگی تیری باقی رہ گئی ہے، وہ کام میں لا، تاکہ آخرت میں تو عزت اور اونچا مقام حاصل کرے۔

تو قبرستان میں جا کر ایک لحظہ خاموش بیٹھ اور ان باتیں کرنے والے خاموشوں کو دیکھ۔

اگر چہ ان پر ایک جیسی مٹی پڑی ہے، لیکن ان کی حالتِ آخرت یکساں نہیں ہے۔

زندوں کا گوشت پوست ایک جیسا (دکھائی دیتا) ہے، (لیکن) ان میں ایک غم میں ڈوبا ہوا ہے اور دوسرا خوش ہے۔)

ہمیشہ دل میں آتا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز اور رات کو تہجد کے لیے جاگنا نصیب ہو جائے، اور تھوڑا سا حصہ جو مشتے از خروارے کے مصداق (زندگی کا) باقی رہ گیا ہے، وہ بے مقصد مصروفیات میں گزر رہا ہے:

خوابم بشد از دیدہ دریں فکرِ سوز
کاغوشِ کہ شد منزل سائش خویش

''فکر سوز سے میری آنکھ میں نیند نہ رہی کہ آسائش خو کس کی آغوش تیری منزل بن گئی؟''

اگر اس معاملے میں کوئی فتور یا کوتاہی روا رکھے ہوئے ہوں تو بلاشبہ وہ سخت گھاٹے میں ہیں اور بے فائدہ مشاغل میں دیوانے ہیں:

بوقت صبح ہمی شود بحضور معلومت
کہ باکہ باختہ ای عشق در شب دیجور
چند چند از حکمت یونانیاں
حکمتِ ایمانیاں راہم بخواں

''صبح کے وقت تجھے معلوم ہو جائے گا کہ اندھیری رات میں کس کے ساتھ عشق کرتے رہے ہو۔ یونان والوں کی حکمت کب تک پڑھو گے، ایمان والوں کی حکمت کو بھی پڑھ لو۔''

آپ پر سلامتی ہو مولوی صاحب کو (میرا) سلام پہنچائیں۔

(حضرت) شاہ ولی اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی کتابیں اور ان کے رسائل جہاں بھی دست یاب ہوں، نظر میں رکھیں۔ پہلے آپ اطلاع دیں، پھر لکھا جائے گا اور مبلغ چھ روپے ابھی تک ہم نے نہیں بھیجے، لیکن عنقریب بھیج دیں گے۔ حضرت امام علی شاہ مکان شریف رحمۃ اللہ علیہ چھتڑ والے ان دنوں میں فوت ہو گئے ہیں:

ساقیا عشرتِ امروز بفردا مکن
یا ز دیوان قضا خط ہر حال بمن

''اے ساقی! آج کی موج کو کل پر مت ڈال، (کیوں کہ) دیوان قضا سے خط (پروانہ موت) یقیناً مجھے ملنے والا ہے۔''

محمد قاسم کی طرف سے سلام قبول ہو۔

فقیر غلام رسول از قلعہ

مولانا عبدالقادر لکھتے ہیں۔

مولوی (علاء الدین) صاحب بیان کرتے تھے کہ جب میں نے یہ خط پڑھا تو اس قدر رقت طاری ہوئی کہ برابر ہفتہ بھر پڑھنا نہیں سوجھا اور روتا ہی رہا۔ میرے استاد صاحب نے بہت اصرار کرکے مجھ سے رونے کی وجہ پوچھی (کیوں کہ انھیں شک گزرا کہ میرے کسی عزیز کے فوت ہونے کی خبر مجھے ملی ہے) تو میں نے روتے ہوئے انھیں یہ خط دے دیا۔ وہ بھی پڑھ کر رونے لگے۔ اس کے بعد بھی مولوی علاء الدین صاحب کی یہ حالت تھی کہ خط بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور کبھی کبھی نکال کر اسے پڑھ کر روتے تھے۔

(۱۰)

یہ خط حضرت سید عبداللہ صاحب غزنویؒ کی خدمت میں ان کے خط کے جواب میں لکھا گیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

اما بعد، بخدمت شریف۔ فیض مآب، جامع کمالات، مورد عنایات جناب حضرتِ من دامت برکاتہ۔

فقیر غلام رسول کی طرف سے السلام علیکم، آداب و نیاز پیش کرنے کے بعد عرض ہے کہ محمد عثمان آئے اور انھوں نے فقیر کے نام آپ کا مکتوب شریف پہنچایا:

من کہ باشم کہ برآں خاطرِ عاطر گزرم
لطف ہامی کنی اے خاکِ درت تاجِ سرم

''میں کون ہوں جو اس خاطر عاطر میں آؤں؟ اے (بزرگ وار) آپ مہربانیاں کر رہے ہیں۔ آپ کے در کی خاک میرے سر کا تاج ہے۔''

وعدے کے مطابق ارشاد کا منتظر ہوں۔ اللہ کرے کہ انتظار کا دن میری زندگی میں آئے، کیوں کہ فانی زندگی کا بھروسا نہیں ہے اور یہاں بار بار آنا نہیں ہے، ہر چند میں اس راستے پر دوڑ رہا ہوں، لیکن ابھی تک اس چہرے کو نہیں دیکھا جو مجھے مطلوب ہے:

مرا عہد یست با جاناں کہ تا جاں ورتنم دارم
ہوا داراں کویش راچوں جان خویشتن دارم
الا اے پیر فرزانہ مکن منعم زمے خانہ کہ من
در حق پیمانہ دلِ پیماں شکن دارم

''میں نے جاناں کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے کہ جب تک میرے تن میں جان ہے، میں تیرے کوچے کو ہوا کی طرح اپنی جان سمجھتا ہوں۔
خبردار! اے دانا بزرگ مے خانے سے مجھے منع مت کر کہ میں ساغر کے لیے پیمان شکن دل رکھتا ہوں۔''

مزید یہ کہ شیخ عبداللہ قوم برہمن حامل رقعہ ہذا نے دو تین سال سے، ریا کے شائبہ کے بغیر اور دنیا کی کسی غرض وحرص کے سوا اللہ کے لیے خالص مخلص بن کر تائب ہونے کے بعد، خلعت اسلام کو زیب تن کرلیا ہے۔ شروع سے اب

تک حقیقی اسلام کی دریافت کا شوق و ذوق ان کے ذہن میں موجود ہے اور اللہ والوں کی صحبت کے بغیر اس کا حصول مشکل ہے اور (اس کے) پیاروں کی عنایت کے بغیر اس تک رسائی محال ہے، خاص کر اس زمانے میں جب کہ دعویٰ کرنے والوں کی کثرت ہے اور روشن ضمیر اور اکسیر نظر اہل دل اکثر صحبتوں میں تفرقہ اور خلل کا شکار ہیں، (اس طرح) جمعیت اسلام کے لیے کیا کیا جائے اور کہاں جایا جائے؟

باہر کہ نشستی و شد جمع دلت
واز تو نرمید زحمتِ آب وگلت

زنہار زِ صحبتش گریزاں می باش
ورنہ نکند روحِ عزیزاں بحلت

''جس کے ساتھ بیٹھو اور دل کو جمعیت (سکون) حاصل نہ ہو اور تجھ سے آب وگل (دنیا) کی محبت نہ چھوٹے،

خبردار! ایسے شخص کی صحبت سے دور بھاگو، ورنہ عزیزاں کی روح تجھے معاف نہیں کرے گی۔''

لہٰذا ارادت کامل کے ساتھ ایک راستہ ہے، اس امید پر کہ اپنی بیعت سے مشرف فرما کر اس پر ایک نظر (توجہ) فرمائیں، جو اس کے دل کے اطمینان کا سبب بن جائے اور وہ زبان حال وقال سے ہر کسی سے کہتا پھرے:

ایں جایا کہ جلوۂ نور محمد یست
ایں جا بیا کہ مائدۂ فیض سرمدیست

ایں جا بیا کہ نور یقین جلوہ می کند
خوش وقت آں کسے کہ بایں نور مہتدیست
اے ماندۂ ظلمتِ شک ایں طرف بیا
تا بنگری بچشم کہ دین، دینِ احمد یست

''ادھر آ کہ (یہاں) نور محمدی ﷺ کا جلوہ ہے۔ ادھر آ کہ (یہاں) فیض سرمدی کا دسترخوان (بچھا) ہے۔

ادھر آ کہ نور یقین جلوہ کر رہا ہے۔ خوش بخت وہ آدمی ہے، جو اس نور سے ہدایت پاتا ہے۔

اے شک کی تاریکی میں گرفتار اس طرف آ تا کہ آنکھ سے دیکھ لے کہ دین تو دین احمد ﷺ ہی ہے۔''

مولفۃ القلوب کے لیے وقت نہ نکالنا سکون دل کے لیے خلل کا موجب بنتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ درخواست قبول فرمائیں گے اور جو آپ کے مبارک خط میں مشائخ زمانہ کے متعلق لکھا گیا تھا (بالکل صحیح تھا) کہ قدیم دور کے بزرگ بلندئ ہمت اور مقامات معرفت کو تیزی سے طے کرنے کے باوجود اپنے آپ کو مشیخیت کے منصب پر نہیں سمجھتے تھے اور اس وقت جب کہ ہر طرف کمی ہی کمی ہے، اور باطن کو چھوڑ کر لوگ ظاہر پر قناعت کرتے ہیں، زیادہ سے زیادہ مرید بنانے میں کوئی خوف نہیں کیا جاتا۔ میرے حضرت! بعض کے ضمن میں فقیر کا قیاس یہی ہے، جو مثنوی کے اس شعر میں (مذکور) ہے:

ہم چو صیاد آورد بانگ صفیر

تا فریبد مرغ راپا آں مرغ گیر

"شکاری کی طرح اس نے پرندوں کو بلانے کی آواز لگائی، تا کہ پرندے کو دھوکا دے کر اسے پکڑ لے"

بعض کاملین سے پوچھا گیا۔ انھوں نے کہا کہ مقربین سابقین جو اہل اللہ ہیں، ہر زمانے میں ان کے طالب کم رہے ہیں، اور اس زمانے میں سوائے نام کے کوئی نشان نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ سلسلہ کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ مرید کے حق میں ارادت کی پختگی اور آداب صحبت کے ساتھ، جیسا کہ شیخ حمید بنگالی کے مکتوبات کی جلد اول میں پیشوا کے لیے فنائے شعور، مقامات کے طے کرنے کے لیے فنائے ارادہ اور شیخ مکمل کی اجازت (کا حامل ہونا ضروری) ہے اور ابرار کے طریقے میں اوراد واذکار، نماز، تلاوت اور نوافل کے لیے کسی سے اجازت لینا لازمی نہیں ہے۔ یہ احکام الٰہی بجالانا ضروری ہے۔ مقربین کم ہیں اور ملحدین گمراہ کرنے کے لیے ہر جگہ جلدی میں ہیں، مبادا کہ (یہ صاحب) کسی زندیق کے ہاتھ گرفتار ہو کر ایمان کا سرمایہ برباد کر بیٹھیں۔ اگرچہ ایسا نہیں ہو گا (ان شاء اللہ)۔ (پھر بھی) اگر (ارشاد) فرمائیں تو مضائقہ نہیں ہے، لیکن (انھیں) آگاہ کریں کہ مقربین کا طریقہ اور ہے، تا کہ انھیں فرق معلوم ہو جائے۔

فقط

فقیر غلام رسول از قلعہ

(۱۱)

مولانا غلام رسول نے یہ خط حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام فارسی نظم میں اپنے ایک نہایت مخلص اور خوش الحان مرید حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کے ہاتھ روانہ فرمایا۔ پہلے شعر ہی سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ خط انھوں نے حضرت سید عبداللہ غزنوی کو اس وقت ارسال فرمایا تھا جب وہ غزنی میں قیام فرماتے تھے۔

اے ساربان بیا کہ بغزنی سفر کنیم
بینیم دیارِ یار غم از دل بدر کنیم

در لمحے کوہ ودشت وبیابانِ آں سواد
کفشے زچشم منتظر پائے سر کنیم

از حد گزشت درد وغم انتظار یار
اے خوش دمے کہ بردرِ جاناں گزر کنیم

زاں صحبتے کہ طالع بیدار ہم ندید
بے بہرہ گشتہ ایم وشمار ا خبر کنیم

دروا گزشت موسمِ فصلِ بہارِ گل
بلبل صفت دو دشت تغا بن بسر کنیم

باز آ نسیم وصل بیا در حیات ما
بارے حساب زندگی خود زسر کنیم

خوباں بصد کمال و جمال اندسو بسو

حسنش زعالمی است و گرچوں نظر کنیم

اس نظم کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

''اے شتربان آہم غزنی کا سفر کریں، یار کا دیس دیکھیں اور غم کو دل سے ہٹائیں۔اس اطراف کے پہاڑ، جنگل وبیابان کو دیکھنے، کے لیے آنکھیں انتظار کر رہی ہیں۔

دوست کے انتظار کا درد وغم حد سے گزر گیا،کیا پیاری گھڑی ہوگی جب ہم جاناں کے در پر پہنچیں گے۔

وہ ہم نشیں کہ جاگتا مقدر بھی نہ دیکھے ہو،ہم اس سے محروم ہیں اور آپ کو بتا رہے ہیں۔

ہائے درد، کہ گلاب کی فصلِ بہار کا موسم بیت گیا،بلبل کے مانند ہم جنگل میں چھپے ہوئے سر مار رہے ہیں۔

او ملاقات کی ٹھنڈی ہوا ہماری زندگی میں لوٹ آ،ایک بار سر سے اپنی زندگی کا حساب کریں۔

بے حد کمال و جمال والے محبوب یہاں اور وہاں ہیں،لیکن اس کا حسن دوسرے عالم کا ہے جب ہم دیکھتے ہیں۔''

(۱۲)

یہ منظوم فارسی خط بھی حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہے جو انھوں نے اپنے شاگرد مولانا محمد علی بوپڑوی مرحوم کی معرفت ارسال فرمایا۔ اس سے واضح

نہیں ہوتا کہ یہ خط غزنی بھیجا یا امرتسر۔ البتہ آخری شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی بوپڑوی حضرت سید عبداللہ صاحب سے حصولِ فیض کے خواہاں تھے۔

نوید اے بلبل بیدل بفضل اللہ بہار آمد
خوشار وز وصالِ گل کہ بعد از انتظار آمد

بساز اے سارباں بارے د دچشم محمل جاناں
برآ اے جاں بہ استقبال چوں آں شہسوار آمد

بہ در و ازہ برآمد جاں براہِ انتظار تو!
چہ فرمائی بر آید یا بگردد چوں کہ یار آمد

شنید م کہ آں دلبر کہ کردے دل ربائیہا!
کنوں ازعین دلداری بر ایں بے قرار آمد

خرا بیہا کہ از باد خزاں آمد بباغ ما
کنوں انصاف خود خو اہیم چوں فصل بہار آمد

بیاد امن فشاں اے گل بیزم شاد مانیہا
بردا ے غم زکوۓ ماکہ یارِ غم گسار آمد

سزا بر مقدم جاناں ز مشتاقاں نثار جاں
برآں راہے شوم قرباں کہ آں زیبا نگار آمد

غلام ایں نامۂ شوق از مداد دیدہ بنوشتہ
ہزاراں سوز پروانہ بہ ہر حرفش بکار آمد

خدا رحمت کندوے را کہ خواند پیش عبداللہ

زِ سوز ِ سینہ ایں نامہ مخبر حال زار آمد

اب اس نظم کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

''اے اداس بلبل! خوش خبری لے کہ اللہ کی مہربانی سے بہار آئی،کتنا پیارا گل کی ملاقات کا دن ہوگا جو انتظار کے بعد آیا۔اے شتربان! ایک مرتبہ میری دونوں آنکھوں کو جاناں کا کجاوہ دکھا،اے جان! باہر آجا استقبال کے لیے جب وہ شہ سوار آئے۔ تیرے انتظار کی راہ میں جان چوکھٹ پر آئی ،کیا حکم ہے؟ جان نکل جائے یا واپس جائے جب کہ دوست آئے۔میں نے سنا ہے کہ وہ محبوب جو اٹھکیلیاں کرتا تھا،اب انتہائی ڈھارس کی نظر سے اس بے قرار کے پاس آیا۔وہ ویرانیاں جو پت جھڑ کے موسم کی ہوا سے ہمارے باغ میں آئیں،اب ہم اپنا انصاف چاہیں گے جب بہار کا موسم آیا۔اے گلاب! آمیری خوشیوں کے جشن میں دامن جھاڑ دے،اے غم! ہمارے کوچے سے بھاگ جا، کیوں کہ غم غلط کرنے والا یار آیا ہے۔محبوب کے آنے پر عاشقوں کو جان نچھاور کرنی چاہیے،اس راہ پر میں قربان جاؤں جس پر وہ دلکش محبوب آئے۔غلاؔم نے آنکھ کی روشنائی سے یہ محبت نامہ لکھا ہے،پروانے کا ہزاروں درد اس کے ہر حرف میں کام آیا۔خدا اس پر رحمت کرے جو عبد اللہ کے پاس پڑھے،سینے کے سوز سے یہ خط (پیش خدمت ہے) جو میری خستہ حالت کا پتا دے رہا ہے۔''

ایک ہندو کا علمی سوال اور اس کا جواب

ایک مرتبہ حافظ آباد کے ایک پڑھے لکھے ہندو رام دتا ٹانڈو نے ایک بزرگ حافظ غلام احمد ساکن کولو والا کی وساطت سے مولانا غلام رسول قلعوی کی خدمت میں ایک خالص علمی نوعیت کا سوال بھیجا۔ سوال اس قسم کا ہے کہ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ لا مکان ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو معراج کی رات عرش پر بلایا۔ اور حضرت جبریل علیہ السلام جو نبی ﷺ کے پاس اللہ کا پیغام لے کر آتے تھے، وہ عالم بالا کی طرف سے لاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اوپر ہے اور کسی مقام میں ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو وہ لا مکان کیسے ہوا؟

یہ سوال اس ہندو نے بہ ذریعہ خط فارسی زبان میں کیا تھا اور مولانا نے اس کا مفصل جواب فارسی ہی میں دیا تھا۔ جواب خالص علمی نوعیت کا ہے اور اس کے سمجھنے میں خاصی دقت پیش آتی ہے۔ ذیل میں سوال اور جواب کی اصل فارسی عبارت درج کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔

(سوال) شہیر نام مکانے است کہ بھگوان مایا درآں جامی ماند وآنچہ مسلمانان گویند کہ

تعیین مکان ہم مخالف عقیدہ معتبرہ ہنود است، چناں کہ نوشتہ می شود، دراول آغاز اوپر بھ نوشتہ سوت پوران چو دانست، کہ شوتک ودیگراں ہمہ از شنیدن ایں قصہ دارند، بنیاد ایں برکت نہادہ اول، اوست سری مہاراج کہ اول نام سری مہاراج می برم، کہ ہرچہ ہست، اوست، وہمہ کس نام اورا می گویند، وہمہ وصف اومی کنند، وحق اوست یکتا و بے ہمتا، واز ہمہ بزرگ تر، ظاہر و پنہانست، اول وآخر ندارد، واورا بہ نظر نمی تواں دید، دانایاں اورا بہ عقل کامل شناختہ اند، کہ ہرچہ ہست اوست واز فعل وسبب برئ است، وبرہما، مہادیو ودشن وکشن واندر وغیرہ ہم ہمہ پیدا کردہ است، ودائم بودہ است، ودائم خواہد بود، وفنا ذات اورالاحق نیست وبہمہ جاموجود است وکریم و بخشندہ، وقوی گردانندہ ضعیفاں است، چوں نام اورامی برند، آں ہمہ از گناہاں پاک می شوند، وبزرگ ہم اوست، ایں چنیں سری مہاراج راسجدہ تعظیم و عبادت می کنم'' (اوپر بھ متعینہ)

(سوال) آنچہ مسلمانان گویند کہ خدالا مکان است، بکدام وجہ می گویند۔

(جواب) چوں از عبارت سابق معلوم شد کہ خدا ازلی است اول ندارد، ابدی است، آخر ندارد، پس مکان آفریدۂ اوست، وفانی چگونہ اول از وباشد، وذات قدیم محتاج اوباشد، ہرکہ مکان ثابت می کند، کہ شہیر (الخ)، ہم مخالف عبارت سابق است، کہ آں جا نوشتہ، کہ بہمہ جامحیط است، گویا مصداق ایں مصرعہ است

نہ تو درہیچ مکانے نہ از تو خالی

دلیل دوم: کہ از معراج حضرت صلی اللہ علیہ وسلم گزرانیدہ معنی معراج نہ فہمید، لہذا نوشتہ می شود، کہ معراج انبیاء واولیا مؤمنین مختلف است، حسب مراتب خود، چنانکہ

تعیین مکان ہم مخالف عقیدہ معتبرہ ہنود است، چناں کہ نوشتہ می شود، دراول آغاز اوپر بھ نوشتہ سوت پوران چو دانست، کہ شوتک ودیگراں ہمہ از شنیدن ایں قصہ دارند، بنیاد ایں برکت نہادہ اول، اوست سری مہاراج کہ اول نام سری مہاراج می برم، کہ ہرچہ ہست، اوست، وہمہ کس نام اورا می گویند، وہمہ وصف اومی کنند، وحق اوست یکتاو بے ہمتا، واز ہمہ بزرگ تر، ظاہر و پنہانست، اول وآخر ندارو، واورا بہ نظر نمی تواں دید، دانایاں اورا بہ عقل کامل شناختہ اند، کہ ہرچہ ہست اوست واز فعل وسبب بریٔ است، و برہما، مہادیو ودشن وکشن واندر وغیرہ ہم ہمہ پیدا کردہ است، ودائم بودہ است، ودائم خواہد بود، وفنا ذات اورالاحق نیست وبہمہ جا موجود است وکریم و بخشندہ، وقوی گردانندہ ضعیفاں است، چوں نام اورا می برند، آں ہمہ از گناہاں پاک می شوند، وبزرگ ہم اوست، ایں چنیں سری مہاراج را سجدہ تعظیم و عبادت می کنم'' (اوپر بھ متعینہ)

(سوال) آنچہ مسلمانان گویند کہ خدالا مکان است، بکدام وجہ می گویند۔

(جواب) چوں از عبارت سابق معلوم شد کہ خدا ازلی است اول ندارد، ابدی است، آخر ندارد، پس مکان آفریدۂ اوست، وفانی چگونہ اول از وباشد، وذات قدیم محتاج اوباشد، ہرکہ مکان ثابت می کند، کہ شہپیر (الخ)، ہم مخالف عبارت سابق است، کہ آں جا نوشتہ، کہ بہمہ جا محیط است، گویا مصداق ایں مصرعہ است

نہ تو درہیچ مکانے نہ از تو خالی

دلیل دوم: کہ از معراج حضرت صلی اللہ علیہ وسلم گزرانیدہ معنی معراج نہ فہمید، لہذا نوشتہ می شود، کہ معراج انبیاء واولیا مؤمنین مختلف است، حسب مراتب خود، چنانکہ

معراج یونس علیہ السلام در شکم ماہی است، ومعراج موسیٰ کلیم اللہ تا طور سینا، ومعراج ہر مؤمن سجدہ کہ در نماز است، ''الصلوٰۃ معراج المؤمنین'' از یں مثنوی شریف است ؎

قرب بے بالا وپستی رفتن است
قرب حق از قید ہستی رستن است

در بوستان است ؎

بلند یت با ید تو اضع گزیں
کہ ایں بام رانیست سلم جزایں

اما ایں معراج کہ سوئے عرش بریں است، برائے نمودن عجائب قدرتہا مراد است، آیت کریمہ ﴿لنریه من اٰیاتنا﴾ (سورہ بنی اسرائیل: آیت 1) اشارتے است بدیں، پس معنی معراج، عروج کردن است از صفات بشریہ بقرب الٰہی جل شانہ، بحسب استعداد خود لہٰذا در مدارج النبوۃ نوشتہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را معرا جہا بود، اما متضمن عجائب وغرائب بود، بسیار مشہور است، وبالسنہ مذکور، چرا کہ دریں سفر براق مع جبرئیل فرستادہ از مسجد حرام با قصی بردہ از آنجا بآسمان بردند، کہ کسے را بدیں قسم نہ بردہ بودند، ونمودند آنچہ نمودند بدید، وآنچہ از حد دیدہ بیروں بود، دید۔

دلیل سوم: قولہ: کہ آوردن صحائف از آسمان است، جوابش آنکہ چوں منزل ملائک آسمان است، منزل جبرئیل سدرۃ المنتہی، لہٰذا چوں حکم الٰہی باوی رسد، از آسمان مع وحی نازل می شود، ودر سابق نوشتہ شد، قرب خدا بر بالا وپستی موقوف نیست، باقی ماند، آنکہ در قرآن مجید است ﴿الرحمن علی العرش استویٰ﴾ یعنی خدا بر بالائے عرش قائم شد، ترجمہ اردو: خدا اوپر تخت کے قائم ہوا (ترجمہ عبدالقادر)

ازیں آیت مستفاد است، کہ استواء خدا بر عرش است، اما کیفیت او مجہول است، آیۃ کریمہ ﴿لیس کمثلہ شیئ﴾ ناطق است، چنانچہ امام مالک فرمودہ: ''الکیف مجہول والایمان بہ واجب، وانکارہ کفر والسوال عنہ بدعۃ پس ایں ایمان ما بہ استویٰ علی العرش بلا مکان گفتن منافی نیست، کہ جہت ومکان تا عرش است، وبالائے عرش مکانے نہ جہت راولایت بپایاں رسید، قطعیت بہ پرکار دوراں رسید۔

خلاصہ آنکہ لا مکان گفتنِ ماوجہے دارد وتعین مکان بھگوان از شما بے وجہ محض، وحالانکہ خود وید شما راتکذیب می کند، چنانکہ در آخر بھوب سیزدہم مہا بھارت مرقوم است کہ سری کرشن جی بھگوان است، وآفرینندہ خلق، وآں سری کشن بھگوان چناں است، کہ اول وآخر ندارد، ودر ہر جا، در ہمہ کس مکانے دارد، خلق ہمہ تابع اوست، وبر ہمہ بزرگ اوست ودانندۂ جمیع اعمال خیر وشراست، وثنائے سری کشن جی در چہاردہ طبق زمین آسمان مذکور است، وجائے بازگشت عالم آں بھگوان است، وخلق ہمہ چیز از وخواہد، وپیدا کنندۂ خلق وعقل اوست، ونبود کسے کہ ایں تمام خلق بوجود آمدہ، ہمیں بھگوان شری کشن است وعبادت کہ بہترین عباد تہا است، عبادت ہمیں بھگوان است، انتہی۔ دریں عبارت معلوم چہ قدر کلاما متناقض است، در تعریف مہاراج گفتہ بود، کہ کشن، وبشن آفریدۂ اوست، ایں جا آفرینندہ خلق قرارداده ہمیں رابھگوان مقرر کرد، دراول گفتہ بود ''کہ شہپیر مکان اوست'' وایں جا گفتہ، کہ در ہمہ جا، در ہمہ کس جائے دارد بلکہ تمام صفات خدا سری کرشن را ثابت کرد،

در دیباچۂ مہا بھارت ایں طور معلوم می شود کہ شری کشن بھگوان پسر باسدیو جادو است، ومولدش از نرس وکنس کہ دانش جادواں بود، حکم کشتن او کرد۔ درمدت سی

ودوسال بعد از برآمدن از خانہ نندگوپال درمتھرا کہ در پنجاب است، باستقلال گزارینده، آخر الامر راجہ جراسند، از ملک پہاڑ بالشکر انبوہ بقصد ہلاک وے متوجہ متھرا شد، واز جانب مغرب کال چمن راجہ ملیچھان یعنی از طائفہ کہ دین وآئین نداشتہ باشند بالشکر گراں برکشن جی قصد بزرگ نمودہ۔ بعضے برآں اند کہ کال چمن راجہ عربستان بود، کہ کشن چوں تاب مقاومت بایشاں نیاوردہ، بدوارکا کہ کنار دریائے شور بصد کروہ از احمد آباد است، رفتہ، مستحصن شدہ ہفتادوہشت سال درآں حدود مخفی شدہ بود، درمحلے کہ ساکن بودہ، بسری برد۔ بعد ازاں عمر او بصد وبست وپنج رسید، مسافر عالم باقی گشت، سبحان اللہ مخلوقے را کہ درمتھرا از خانہ باسد یوتولدشدو بخانہ گوجراں تربیت یافتہ، وبہ غنیم تابِ مقاومت نداشتہ مخفی شدہ، بوقت خود مردہ، بھگوان قرار دادہ اند، چہ قدر بے ادبی خالق است وشرک بہ آں۔ جناب والا۔ سوال می کنم کہ اگر شری مہاراج کہ دراول کتاب وصف اوگزشت، بھگوان است، پس ایں بھگوان در ہر جاودر ہر کس چگونہ سرایت کرو، عقل را کارفرمایند ہمی شان رام چندر۔

(جواب) مولانا غلام رسول کی طرف سے ہندو کے اس سوال کا جواب ملاحظہ ہو: انھوں نے کہا بے مثل وبے نظیر خدا کی تعریف کے بعد، جو میرا برتر آقا اور اعلیٰ پالنہار ہے، اور درود کے بعد عرب وعجم کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر، نیز ان کے اہل بیت آل وبہترین امت کے صحابہ پر۔

رام دتا کا یہ کہنا کہ شہپیر اس جگہ کو کہتے ہیں جو مایا بھگوان (وشنو) کا ٹھکانا ہے۔

اس کے متعلق پہلی دلیل کہ (مایا) کو خدا کے مرتبے پر پہنچانا اور بھگوان نام دینا ان کے مدعا کے موافق نہیں ہے، جب بھگوان متعین نہیں ہے، تو اس کی موجودگی کی جگہ

کس طرح متعین ہو سکتی ہے؟ اور جو اس نے لکھا ہے، وہ مہا بھارت کتاب کے خلاف ہے، جس سے زیادہ قابل بھروسا کوئی کتاب ہندو دھرم میں نہیں ہے، چوبیس مرتبہ بھگوان نے مختلف شکلوں میں حلول کیا ہے۔ ان میں سے رام چندر ہیں، جسرت (دشرتھ) کے بیٹے، سیتا کے شوہر، اودھ (ایودھیا) میں، انھی میں شری کرشن جی بھگوان ہیں، جن کا ٹھکانا دوارکا ہے۔ اسی طرح مچھ اور کچھ اوتار، وارہ اور نرسنگھ اوتار وغیرہ ہیں جن کی تفصیل لمبی ہے، اور حالاں کہ (بھگوان) کے لیے مکان کی تعیین ہندوؤں کے معتبر عقیدے کے خلاف ہے، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، اپیرب کے بالکل شروع میں لکھا ہوا ہے کہ شوت پوران نے جب جان لیا کہ شوتک اور دوسرے تمام لوگ اس قصے کو سنتے ہیں تو اس برکت کی بنیاد رکھی۔ پہلا وہ ہے شری مہاراج، کہ پہلا نام شری مہاراج کا لیتا ہوں کہ جو کچھ ہے وہی ہے، اور تمام لوگ اسی کا نام جپتے ہیں اور سب اسی کی تعریف کرتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ اسی کو سزاوار ہے یکتا اور بے ہمسر ہونا۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ وہ ظاہر ہے اور پوشیدہ۔ اس کے لیے اول ہے نہ آخر، اس کو آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا، عقل والے کامل عقل کے ذریعے سے اس کی معرفت تک پہنچتے ہیں اور جو کچھ ہے وہی ہے، وہ فعل اور سبب سے بری ہے، اور برہما، مہادیو، وشنو، کشن اور اندر وغیرہ سب اس کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا، موت، اس کی ذات کے لیے نہیں ہے، وہ ہر جگہ موجود ہے، سخی اور بخشش کرنے والا، کمزور کو قوی بنانے والا، جب لوگ اس کا نام جپتے ہیں، تو سب گناہوں سے پاک ہو جاتے ہیں، بڑا وہی ہے، میں ایسے شری مہاراج کو مانتا ہوں، اس کی تعظیم کرتا ہوں اور اسی کی عبادت میں مشغول ہوں۔

(اپیرب متعینہ)

(سوال) رام وتا کا یہ کہنا کہ مسلمان کس بنا پر خدا کو لا مکان مانتے ہیں؟

(جواب) گزشتہ عبارتوں سے معلوم ہوا کہ خدا ازلی ہے، اس کی ابتدا نہیں ہے اور ابدی ہے اس کے لیے انتہا نہیں ہے۔ چوں کہ مکان بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے تو یہ حادث مکان اس سے پہلے کیسے ہو جائے گا۔ اور قدیم ذات اس مکان کی محتاج کیسے ہو جاتی ہے، جو شخص (خدا کے لیے) مکان ثابت کرتا ہے کہ "شہپیر نام مکانے الخ" اس کا یہ قول بھی پہلے ذکر کی گئی تفصیل کے خلاف ہے۔ اس عبارت میں ہے کہ وہ ہر جگہ کو محیط ہے، گویا خدا کی ذات اس مصرع کی مصداق ہے۔

نہ تو در ہیچ مکانے نہ مکانے از تو خالی
نہ تو کسی جگہ میں ہے نہ کوئی جگہ تجھ سے خالی ہے

دوسري دليل: کہ حضرت محمد ﷺ کو معراج کرائی گئی (رام داتا) معراج کے معنی نہیں جانتے، لہٰذا تحریر کیا جاتا ہے کہ انبیاء، اولیاء اور اہل ایمان کی معراجیں ان کے درجات کے اعتبار سے مختلف ہیں، چنانچہ یونس علیہ السلام کی معراج مچھلی کے پیٹ میں ہوئی، موسیٰ کلیم اللہ کی معراج طور سینا تک رہی، اور ہر مومن کی معراج نماز میں ہے (نماز ایمان والوں کی معراج ہے) اسی قبیل سے مثنوی کا شعر ہے (جس کا ترجمہ یہ ہے)

بغیر اونچائی، نیچائی کے جانا قربت ہے
اللہ کی نزدیکی وجود کی قید سے چھٹکارا پالینا ہے

کتاب بوستاں کے شعر کا ترجمہ یہ ہے

تجھے سرفرازی چاہیے تو خاک ساری اختیار کر

کیوں کہ اس مکان کے لیے اس کے علاوہ کوئی زینہ نہیں

اور یہ معراج جو عرش بریں کی طرف ہوئی، اس سے خدا کی قدرتوں کے عجائبات کا مشاہدہ کرانا مقصود تھا۔ آیت کریمہ ''تا کہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں'' میں اسی طرف اشارہ ہے، تو معراج کے معنی ہوئے، بشری صفات سے اوپر چڑھنا، خدا کی قربت کی طرف اپنی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق!

کتاب مدارج النبوہ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی معراجیں ہوئی ہیں، لیکن وہ معراج جو عجائب ونوادر قدرت کے نظارے پر مشتمل تھی وہی زیادہ مشہور ہے اور لوگوں کی زبانوں پر اسی کا چرچا ہے، کیوں کہ اس سفر میں جبرائیل کے ساتھ براق بھیجا گیا۔ آپ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا۔ وہاں سے آسمانوں کی سیر کرائی گئی۔ اس طرح کسی کو سیر نہیں کرائی گئی تھی، اور آپ (ﷺ) نے دیکھا جو کچھ دیکھا اور وہ سب آپ (ﷺ) نے دیکھا، جو آنکھوں کی حد سے باہر تھا۔

تیسری دلیل: رام دتا کا یہ کہنا: کہ ''وحی کے صحیفے آسمان سے لائے جاتے ہیں'' کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں کی منزل آسمان ہے، جبرائیل کی منزل سدرۃ المنتہی ہے، اس لیے جب حکم الٰہی ان کو ملتا ہے آسمان سے مع وحی کے اترتے ہیں، اور پہلے ہی لکھا جا چکا ہے کہ اللہ کی قربت اونچائی، نیچائی پر موقوف نہیں ہے۔ رہا قرآن کا یہ فرمان کہ ''وہ رحمٰن ہے جو عرش پر مستوی ہوا''، تو شاہ عبدالقادر کا اردو ترجمہ ہے ''خدا اوپر تخت کے قائم ہوا''۔ اس آیت سے واضح ہے کہ خدا کا استوا عرش پر ہے، لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں، جس کی دلیل آیت کریمہ ''اس کے مانند کوئی چیز نہیں'' ہے چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ (ترجمہ) ''اس کی کیفیت معلوم نہیں،

لیکن اس پر ایمان رکھنا واجب ہے، اس کا انکار کفر ہے اور اس کی بابت کرید کرنا بدعت ہے"۔ لہٰذا ہمارا استواء علی العرش پر ایمان رکھنا خدا کو لا مکان کہنے کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ جہت اور جگہ کا وجود عرش تک ہے اور عرش سے اوپر مکان ہے نہ جہت۔ وہاں ان کی موجودگی ختم ہے اور زمانے کا پرکار وہاں منقطع ہو گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہمارا خدا کو لا مکان کہنا کوئی دلیل رکھتا ہے، اور تمھارا بھگوان کو مکان میں مقید کرنا بے دلیل ہے، جب کہ تمھارا وید ہی تمھارے خیال کو جھٹلا رہا ہے، جیسا کہ مہا بھارت کے 16 ویں بھوپ میں لکھا ہے کہ شری کرشن جی بھگوان ہے، ساری مخلوق کو پیدا کرنے والا اور وہ ایسے بھگوان ہیں جس کا اول ہے نہ آخر۔ وہ ہر جگہ، ہر شخص میں گھسے ہیں۔

کل مخلوق ان کی تابع ہے، وہی سب سے بڑے ہیں، تمام بھلے، برے عملوں کو جانتے ہیں، ان کی تعریف، زمین و آسمان کے چودہ طبقوں میں کی جاتی ہے۔ اور دنیا کی واپسی انھی بھگوان سے ہے، مخلوق سب کچھ انھی سے مانگتی ہے، مخلوق اور عقل کو پیدا کرنے والے وہی ہیں اور جس ذات کے نور سے یہ کائنات وجود میں آئی، یہی بھگوان شری کرشن ہیں۔ اور سب سے بہتر پوجا انھی بھگوان کی ہے۔ انتہی

اس عبارت میں جاننا چاہیے کہ کتنی باتیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔ مہاراج کی تعریف میں بتایا گیا تھا کہ کشن (کرشن) اور بشن، (وشنو) پیدا کیے ہوئے ہیں، اور یہاں (کرشن) ہی کو مخلوق کا پیدا کرنے والا بتا کر انھی کو بھگوان بنا دیا۔ شروع میں کہا گیا تھا کہ "شہپیر اس کا ٹھکانا ہے" اور یہاں کہا جا رہا ہے، کہ وہ ہر جگہ اور ہر شخص میں جگہ (ٹھکانا) بنائے ہوئے ہے، بلکہ خدا کی تمام صفتوں کو شری کرشن ہی میں ثابت کر

دیا۔ مہا بھارت کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ شری کرشن بھگوان، باسدیو یادو کے بیٹے ہیں، ان کے پیدا ہونے پر نرس اور کنس جو ذات کے یادو ہی تھے، نے ان کے مار ڈالنے کا حکم دے دیا۔ گھر سے نکال دینے کے بعد بتیس سال نند گوپال (کرشن) متھرا (پنجاب) میں ٹھہرے رہے۔ آخر کار راجا جراسند، پہاڑی بادشاہ ان کو ہلاک کرنے کے لیے لشکر جرار لے کر متھرا کی طرف چل پڑا، اور پچھّم کی طرف سے کال چمن راجا جو ملیچھوں یعنی اس قوم کا راجا جن کا نہ کوئی دین تھا نہ قانون، لشکر عظیم لے کر کرشن جی کے خلاف بڑے برے ارادے سے آیا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ کال چمن عربستان کا راجا تھا، کشن (کرشن) کو ان کے مقابلے کی طاقت نہیں تھی، وہ دوارکا بھاگ گئے، جو دریائے شور کے کنارے احمد آباد سے سوکوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں جا کر قلعہ بند ہو گئے۔ 78 سال انہی علاقوں میں روپوش رہے۔ اس نواح میں جہاں ٹھہرے تھے، یہ مدت کاٹی۔ اس کے بعد 125 سال کی عمر کو پہنچے اور عالم آخرت کو سدھار گئے۔

سبحان اللہ! وہ مخلوق جو متھرا میں باسدیو کے گھر میں پیدا ہوئی، گوجروں کے گھر میں جن کی پرورش ہوئی، اور جن کو حملہ آور دشمنوں کے مقابلے کی طاقت نہیں تھی، جو دشمنوں کے ڈر سے روپوش رہے اور اپنے وقت مقررہ پر موت سے دوچار ہوئے، انہی کو بھگوان بنا لیا گیا ہے۔ یہ خالق کے ساتھ کتنی بڑی بے ادبی ہے، اور اس کی برتر ذات کے ساتھ شرک ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر شری مہاراج جن کے اوصاف کتاب کے شروع میں گزرے ہیں، بھگوان ہیں تو یہ بھگوان ہر مکان میں، ہر شخص میں کس طرح جا گھسے ہیں۔ عقل سے کام لیجیے اور سوچیے۔ یہی معاملہ رام چندر جی کا بھی ہے۔

مولانا غلام رسول کی تحریر ختم ہوئی۔ اس سے پتا چلا کہ مولانا ممدوح جہاں عربی وفارسی پر عبور رکھتے اور علومِ دینیہ کے ماہر تھے، وہاں انھیں ہندو مذہب سے بھی شناسائی تھی اور وہ ہندوؤں کے مذہبی اکابر کے نام اور ان کے نقطۂ نظر سے آگاہ تھے۔ نیز ان کی تعلیم اور ان کی کتابوں کے متعلق انھیں واقفیت حاصل تھی۔ بعض مسائل میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بحثیں جاری رہتی تھیں اور دونوں مذاہب کے اہل علم اس میں پورا پورا حصہ لیتے تھے۔ اور یہ آپس کی سب مذہبی بحثیں عزت و آبرو کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ایک دوسرے سے کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔

مولانا غلام رسول اور احمد پور شرقیہ کا ہاشمی خاندان

میں نے حضرت مولانا غلام رسول قلعوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات لکھنا شروع کیے تو اللہ تعالیٰ نے بے حساب مدد فرمائی اور ملک اور بیرون ملک کے ایسے ایسے مقامات سے ان کے واقعاتِ حیات سے متعلق اطلاعات پہنچیں کہ جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر نیت صاف ہو اور دل میں خلوص کا جذبہ کارفرما ہو تو قرآن فرماتا ہے۔

﴿یرزقه من حیث لا یحتسب﴾ (طلاق:3)

''اللہ تعالیٰ ایسی ایسی جگہ سے عطا فرماتا ہے، جس کا انسان کو وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔''

جن اہل علم نے حضرت مرحوم کے واقعاتِ حیات سے مطلع فرمایا، ان میں کویت کے مولانا عارف جاوید محمدی اور دہلی کے مولانا ابوالکلام احمد کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، جس کی تفصیل کتاب کے ''حرفے چند'' میں بیان کی جا چکی ہے۔

اس کے بعد 10 راکتوبر 2010ء کو مجھے احمد پور شرقیہ (ضلع بہاول پور) سے جناب

حمید اللہ خاں عزیز کا مکتوبِ گرامی موصول ہوا، جس سے پتا چلا کہ حضرت مولانا غلام رسول قلعوی رحمۃ اللہ علیہ کے وہاں کے ہاشمی خاندان کے علمائے کرام سے بہت گہرے تعلقات رہے ہیں۔

حضرت مولانا غلام رسول مرحوم ومغفور کے لائق احترام پڑپوتے حافظ حمید اللہ سدید سے مجھے وہ کتاب ملی جو حضرت کے بڑے بیٹے مولانا عبدالقادر مرحوم نے ''سوانح حیات مولانا غلام رسولؒ'' کے نام سے لکھی۔ یہ اگرچہ بڑی اہم کتاب ہے اور حضرت کے حالات کا اولیں ماخذ ہے، لیکن اس میں رقم فرمودہ واقعات کے علاوہ بھی حضرت مرحوم کے بہت واقعات ہیں، جن کا ان کے اخلاف کو علم نہیں۔ ان ''بہت واقعات'' میں سے بعض واقعات کا علم مجھے یا تو ان مختلف کتابوں سے ہوا، جن کے اس کتاب کے متعدد مقامات میں حوالے دیے گئے ہیں اور یا ان اصحابِ علم سے بھی ہوا، جن کا حضرت کے اخلاف سے دور یا نزدیک کا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ ان اصحابِ علم میں جناب حمید اللہ خاں عزیز بھی شامل ہیں جو احمد پور شرقیہ (ضلع بہاول پور) کے رہنے والے ہیں اور وہاں کے ماہنامے ''تفہیم الاسلام'' کے ایڈیٹر ہیں۔

یہ معلوم کرکے نہایت مسرت ہوئی کہ حمید اللہ خاں عزیز احمد پور شرقیہ کے ہاشمی خاندان کے اہل علم کے حالات کتابی صورت میں مرتب کر رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی خدمت ہے، جسے سرانجام دینے کا انھوں نے عزم کیا ہے۔

اب پہلے محترم حمید اللہ خاں عزیز کا مکتوب پڑھیے جو انھوں نے میرے نام ارسال کیا۔ پھر وہ واقعات ملاحظہ فرمایے جو حضرت مولانا غلام رسول قلعوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مکتوب میں میرے بارے میں انھوں جو الفاظ تحریر کیے، اس پر میں ان کا شکر

گزار ہوں، لیکن ان میں سے متعدد الفاظ میں نے قلم زد کر دیے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اوصاف اس فقیر میں نہیں پائے جاتے جو انھوں نے بیان کیے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتہائی واجب الاحترام بھٹی صاحب! حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور اور بعد ازاں فون پر آپ کے برادرِ صغیر جناب سعید احمد صاحب بھٹی سے معلوم ہوا کہ آپ ان دنوں ولی کامل، فنا فی اللہ حضرت مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ سے متعلق کتاب لکھ رہے ہیں، اور اس سلسلے میں آپ کو معلومات درکار ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعمل اور عمر عزیز میں برکت عطا فرمائے۔ آمین۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اپنی کتب کے ذریعے نئی نسل کے سامنے اپنے لائق احترام اسلاف کے روشن کارناموں کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کر کے گویا نئی نسل کو اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔

آپ دورِ حاضر کے پہلے محقق ہیں، جو نہایت لگن اور محنت سے دیگر علماے برصغیر کے ساتھ ساتھ درویشِ خدامست حضرت مولانا غلام رسول قلعویؒ کے حالات وخدمات کو بھی کتابی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ جزاکم اللہ خیراً۔ مولانا غلام رسول قلعویؒ کے ایک عظیم المرتبت شاگرد مولانا عبدالواحد ہاشمیؒ تھے، جو احمد پور شرقیہ میں سکونت فرما تھے۔ ان کے علمی جانشین علامہ عبدالحق ہاشمی فاروقی حجاز مقدس اور برصغیر پاک وہند کے علمی حلقوں میں ایک خاص مقام

رکھتے تھے۔ خود آں جناب نے بھی اپنی کتاب ''دبستان حدیث'' (صفحہ 312 تا 320) میں علامہ عبدالحق ہاشمیؒ کے حالات و واقعات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔
مولانا عبدالواحد ہاشمیؒ کے والد گرامی (اور مولانا عبدالحق ہاشمی کے دادا) مولانا محمد فاروقی ہاشمیؒ، مولانا غلام رسول قلعویؒ کے ہم عصر اور ہم درس تھے۔ لیکن اخلاف کی سستی کی وجہ سے ان کے حالات و خدمات وغیرہ پردۂ خفا میں رہے ہیں۔ میں ایک کتاب بعنوان ''مولانا عبدالحق ہاشمی اور ان کا خاندان'' لکھ رہا ہوں۔ پچاس فی صد کام مکمل ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں سے چند اوراق آپ کو بھیج رہا ہوں۔ سچ پوچھیے تو میں عرض کروں کہ آپ کی کتابیں بزم ارجمنداں، نقوش عظمتِ رفتہ، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش، برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، دبستان حدیث میرے لیے ''دبستان علم'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں نے آپ کے درجنوں مضامین، تبصروں، خاکوں اور آرٹیکلز کا بھرپور مطالعہ کیا ہے۔ ان سے مجھے تاریخ و رجالِ حدیث پر کام کرنے کی تحریک پیدا ہوئی اور میرے اندر لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ چنانچہ میں نے جنوبی پنجاب کے ان اہل حدیث حضرات کی علمی، تبلیغی، تدریسی، صحافتی، تحقیقی اور تنظیمی سرگرمیوں اور سوانح عمریوں پر کام شروع کیا ہے، جن کے متعلق پہلے نہیں لکھا گیا یا معلومات کی عدم دست یابی کی بنا پر نہایت اختصار سے لکھا گیا ہے۔
مجھے چوں کہ یہ ذوق و شوق آپ کی کتب اور تحریرات پڑھ کر پیدا ہوا، اس لحاظ سے میں آپ کو اپنا استاد سمجھتا ہوں۔
خاک سار 14۔ اگست 2003ء کو پہلی مرتبہ آپ کو سلام عرض کرنے کی غرض

سے لاہور آیا تھا۔

15 / جون 2006ء کو دوسری مرتبہ آپ کے درِ دولت پر حاضری کا موقع ملا۔ آپ نے جس شفقت اور محبت کا مظاہرہ فرمایا تھا، وہ حسین لمحات آج بھی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ میں پچھلے چند ماہ سے مرض گردہ میں مبتلا ہوں۔ طبیعت کے بحال ہونے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

محترم بھٹی صاحب! میرے دادا مرحوم مولانا حکیم فیض اللہ خان (تلمیذ مولانا احمد دین گکھڑوی) ''الاعتصام'' کے ابتدائی دور کے پڑھنے والوں میں سے تھے۔ مولانا محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ احمد پور شرقیہ تشریف لاتے تو ان کا قیام توحید منزل (دادا مرحوم کی رہائش گاہ) میں ہوتا۔ وہ 1997ء کے آخر میں فوت ہوئے۔ ''الاعتصام'' کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے لیے چھوڑ گئے۔ آج یہ میرے لیے بہت قیمتی سرمایہ ہے اور میں اس سے وقتاً فوقتاً مستفید ہوتا رہتا ہوں۔

محترم! آپ کے پرانے مضامین اور جدید رشحات قلم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی خدمات کا سلسلہ بہت وسیع ہے اور آپ اردو کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خیر و عافیت سے رکھے۔ آپ ہمارے حق میں دعا فرمائیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کا خادم

حمید اللہ خان عزیز

احمد پور شرقیہ

اب احمد پور شرقیہ کے ہاشمی خاندان کے ابتدائی دور کے اصحابِ علم کے بارے میں حمید اللہ خاں عزیز کی تحریر سے ماخوذ اس حصے کا مطالعہ فرمایے، جس میں حضرت مولانا غلام رسول قلعوی کا ذکرِ خیر آتا ہے۔

اس خاندان کے ایک بزرگ مولانا محمد ہاشم فاروقی تھے جو 1725ء میں پیدا ہوئے اور 1827ء میں ان کا انتقال ہوا۔ بہاول پور میں دفن کیے گئے۔ ان کے فرزندِ گرامی مولانا محمد فاروقی ہاشمی تھے۔ انھوں نے 1851ء میں دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ سے تعلیم حاصل کی اور سند لی۔

مولانا محمد فاروقی ہاشمی اپنے عہد اور علاقے کے مشہور عالم تھے اور حضرت مولانا غلام رسول قلعوی کے ہم عصر اور دوست تھے۔ انگریزوں کا اس وقت پورے ہندوستان پر قبضہ تھا اور ریاست بہاول پور بھی انگریزوں کے ماتحت تھی۔ اس صورتِ حال سے وہ سخت مغموم اور پریشان تھے۔ انھوں نے مولانا غلام رسول قلعوی کے مشورے سے ''تحریک تحفظ اسلام'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اس تنظیم سے ان کا مقصد مسلمانوں کو عیسائیوں، ہندوؤں اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات سے محفوظ رکھنا تھا۔ حمید اللہ خاں عزیز لکھتے ہیں کہ اس کی تفصیل کتاب ''مشائخ ریاست'' کے صفحہ 14، 15 پر مرقوم ہے۔

1862ء کے پس وپیش مولانا غلام رسول قلعوی کے مشورے سے مولانا محمد فاروقی بہاول پور سے ''اوچ شہر'' چلے گئے اور ''مدرسہ دارالسنۃ'' کے نام سے وہاں ایک درس گاہ جاری کی۔ اس سے قبل بہاول پور میں ان کے بزرگوں کا جاری کردہ ''مدرسۃ الحدیث'' قائم تھا، جس سے ریاست بہاول پور کے بے شمار لوگوں نے تعلیم حاصل کی۔

مولانا محمد فاروقی 62 سال کی عمر پا کر 1875ء میں فوت ہوئے۔

مولانا محمد فاروقی ہاشمی کے فرزند گرامی مولانا عبدالواحد ہاشمی تھے۔ ان کا سال ولادت 1852ء ہے۔ انھوں نے مولانا غلام رسول قلعوی اور مولانا سید عبداللہ غزنوی سے بھی فیض حاصل کیا اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے بھی ارشد تلامذہ میں گردانے گئے۔ 1866ء میں جب کہ ان کی عمر چودہ سال تھی، ان کے والد انھیں مولانا غلام رسول کی خدمت میں قلعہ اسلام لے گئے اور وہ ان سے تحصیل علم کرنے لگے۔ مولانا غلام رسول صاحب کے جاری کردہ مدرسے کا نام ''اشاعۃ التوحید والسنۃ'' تھا۔ اس مدرسے میں انھوں نے مولانا غلام رسول سے تفسیر وحدیث کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مستفیض ہوئے اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے بھی استفادہ کیا اور ان سے سندِ حدیث لی۔

مولانا عبدالواحد الہاشمیؒ خود لکھتے ہیں

''14 برس کی عمر میں میرے والد صاحب مجھے قلعہ اسلام لے گئے اور استاذی المکرّم مولانا مولوی غلام رسول صاحب کے مدرسہ ''اشاعت التوحید والسنۃ'' میں مجھے داخل کرادیا۔ مدرسہ ''اشاعت التوحیدوالسنۃ'' گلستان علم کا وہ گل شیریں ہے جس کی آب یاری میں میرے والد صاحب مولانا محمد فاروقی رحمہ اللہ کا بھی کردار رہا ہے۔ انھوں نے مولانا (قلعوی) کے مدرسے کی ترقی کے لیے ہر عسر ویسر میں مدد کی۔ مولانا غلام رسول رحمہ اللہ میں بزرگی، للّٰہیت، محبتِ علم حدیث، دین اسلام کی اشاعت کا جوش اور طالبانِ دین پر شفقتوں کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا تھا۔

''مدرسہ (اشاعت التوحیدو السنۃ) نے اپنی نورانیت دکھائی اور اس سے متعدد

صاحبان علم پیدا ہوئے جن میں سے اکثر نے علم دین میں خصوصاً کسبِ کمال کیا۔
ہمارے استادِ محترم (مولانا قلعوی) تبلیغ توحید کے شائق تھے۔ وہ ایک واقعہ بڑے سوز ودرد سے سنایا کرتے تھے کہ ان کے خاندان کے ایک بزرگ کو محض اس بنا پر شہید کر دیا گیا تھا کہ وہ لاہور کے حضرت مخدوم علی ہجویری رحمہ اللہ کو ''داتا'' ماننے سے انکار کرتے تھے۔ یہ واقعہ انھوں نے اپنی کتاب ''تعارف توحید'' میں بھی بیان کیا ہے۔
''تعارف توحید'' حضرت استاد صاحب کی اصلاح عقیدہ پر نایاب کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے لفظ ''الٰہ'' کی دل نشین تشریح کی ہے اور خاص طور سے قرآن کے الفاظ ''من دون اللہ'' کی وضاحت فرمائی ہے۔

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا غلام رسول نے اپنے زمانے کے گمراہی میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو توحید اور سنت کا درس دیا اور انھیں صراط مستقیم پر ڈالا''۔ (بیاض ہاشمی۔ ص 20، 21)[1]

....

[1] بیاض ہاشمی کے ان الفاظ سے جو مولانا غلام رسول قلعوی کے شاگرد مولانا عبدالواحد ہاشمی نے تحریر فرمائے ہیں، دو باتوں کا پتا چلا۔ ایک یہ کہ مولانا غلام رسول کے خاندان کے ایک شخص کو کسی نے اس لیے شہید کر دیا تھا کہ وہ حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کو ''داتا'' کہنے سے انکار کرتے تھے۔ یہ تو بالکل صحیح ہے کہ کسی شخص کو خواہ وہ کتنا بھی ولی اللہ ہو، داتا نہیں کہنا چاہیے۔ ''داتا'' صرف اللہ تعالیٰ ہے، لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ یہ لفظ نہ کہنے کی بنا پر مولانا مرحوم کے خاندان کے ایک فرد کو شہید کر دیا گیا تھا۔ اس کا ذکر ان کے اخلاف میں سے کسی سے نہیں سنا، نہ ان کے حالات کے متعلق کسی کتاب میں پڑھا۔
دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مولانا غلام رسول نے ''تعارف توحید'' کے نام سے بھی کوئی رسالہ لکھا تھا۔ لیکن ان کے اخلاف میں سے کسی نے کہیں اس رسالے کا ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے مولانا نے اپنے دوست مولانا محمد ہاشمی یا اپنے شاگرد مولانا عبدالواحد ہاشمی کے کہنے سے احمد پور شرقیہ میں پندرہ بیس صفحات کا اس نام سے کوئی مضمون لکھا ہو اور وہ مسودہ انہی کے پاس ہو۔ اس طرح کے معلوم نہیں، انھوں نے کتنے مضمون اور مقالے لکھے ہوں گے جو جہاں لکھے وہیں رہ گئے، ہمارے علم میں نہیں آئے۔

مولانا عبدالواحد ہاشمی کی ذاتی بیاض کے حوالے سے چند مزید باتیں مولانا غلام رسول قلعویؒ کے بارے میں ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں۔

① ہمارے شیخ مولوی غلام رسول صاحب ریاست بہاول پور کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ ریاست کا اخبار ''بہاول پور گزٹ'' ان کی خدمت میں پہنچتا تھا۔

② والد صاحب (مولانا محمد فاروقیؒ) بتایا کرتے تھے کہ 1857ء کی تحریک آزادی کے دوران مولانا غلام رسول کو گرفتار کیا گیا اور انگریز جج نے پھانسی کی سزا سنائی، جسے بعد میں مولانا کے معتقدین اور عوام کے دباؤ پر جج نے اپنا فیصلہ تبدیل کرتے ہوئے عمر قید میں بدل دیا لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد انھیں رہا کر دیا گیا۔ جن ایام میں وہ گرفتار تھے والد گرامی (مولانا محمد ہاشمی) ان سے ملنے گئے تو انھیں بھی مولانا کا ساتھی سمجھ کر نظر بند کر دیا گیا۔ والد صاحب ان کی اسیری کے ایام کے واقعات سناتے تو مغموم ہو جاتے۔ بلاشبہ مولانا غلام رسولؒ کی تمام زندگی لوگوں کے عقائد کی تطہیر اور بدعات کی تردید میں بسر ہوئی۔ ①

③ مولانا غلام رسول مسلمانوں کی دینی، اخلاقی اور علمی پسماندگی پر مغموم رہتے تھے۔

④ وہ ''اوچ'' کے حالات اور مبتدعین کی اہل توحید کے خلاف شر انگیزی سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے والد محترم کو لکھا کہ بہاول پور شہر کو چھوڑ کر اوچ میں سکونت اختیار کرو اور لوگوں میں اسلام کی ابدی تعلیمات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرو

① 1857ء میں مولانا غلام رسول صاحب کو انگریز جج کی طرف سے پھانسی یا عمر قید کی سزا کا پتا اسی خط سے چلا۔ ہمیں اس سلسلے میں جو کچھ معلوم تھا، اس کی تفصیل کتاب کے گیارھویں باب میں بیان کر دی گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے بہت سے علمائے کرام کو پھانسی دے دیا تھا یا عمر قید کر دیا تھا۔

تاکہ گمراہی اور بدعات کے بادل چھٹ جائیں۔ چنانچہ میرے والد محترم نے 1862ء میں اوچ کے ''محلہ گیلانی'' میں مدرسہ ''دارالسنۃ'' قائم کیا۔ مدرسے میں تعلیم کا آغاز ہونے پر حضرت استاد (مولانا غلام رسول) صاحب کو بواسطہ مولوی عبدالکریم اوچوی چٹھی لکھ کر مطلع کیا جس پر انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور مدرسے کی کامیابی کے لیے سوز و درد کے ساتھ دعا فرمائی۔

⑤ مولانا غلام رسولؒ ایک مدت بعد اوچ تشریف لائے اور بڑے بڑے عرسوں پر دعوتِ توحید پیش کی۔ وہ تقریر میں جارحانہ انداز اختیار کرنے کی بجائے بڑے تحمل سے قرآن مجید سے دلائل پیش کرتے۔ وہ اوچ کی تمام بڑی خانقاہوں پر گئے اور بلا خوف وخطر علی الاعلان دعوتِ توحید پیش کی۔ بڑے مخدوم صاحب کے مزار پر گدی نشین سے ملے اور کسی لومۃ لائم کی پروا کیے بغیر انھیں دین اسلام کے حقائق سے روشناس کرایا۔ مخدوم صاحب نے اللہ واحد کی بندگی کا اقرار تو کیا لیکن قبور پر حاضری اور سجدہ وغیرہ کو صاحبِ قبر کے ساتھ عقیدت کا انداز ٹھہرا کر ان کی اصلاحی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ کے تھوڑے عرصے بعد مدرسہ دارالسنۃ کو بند کرنے کا پروانہ جاری ہو گیا۔ اصل میں مخدوم صاحبان نے دین کی اس درس گاہ کو اپنے عقیدے اور مزاج کے خلاف بغاوت سمجھا۔ مخدوم صاحب نے منادی کرائی کہ جسے علم دین حاصل کرنا ہو وہ خانقاہ گیلانی میں آئے۔

⑥ مدرسہ دارالسنۃ اپنے وقتِ قیام کے نو سال بعد 1870ء میں ''کوٹلہ شیخاں'' میں منتقل ہو گیا تھا۔ کوٹلہ شیخاں اوچ کا نواحی قصبہ ہے۔

اب مولانا غلام رسول قلعویؒ کا مکتوب گرامی پڑھیے۔ یہ مکتوب علامہ رحمت اللہ

ارشد کے حوالے سے درج کیا جا رہا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے علامہ صاحب ممدوح کا تعارف کرایا جائے۔

علامہ رحمت اللہ ارشد (سابق ریاست) بہاول پور کے ایک مشہور سیاسی رہنما تھے۔ کئی سال پنجاب اسمبلی کے رکن رہے۔ 1971ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی بہت بڑی اکثریت سے جیتی تھی، دوسری سیاسی جماعتوں کے چند لوگ ہی کامیاب ہو سکے تھے، لیکن علامہ رحمت اللہ ارشد کے مقابلے میں ان کا مخالف امیدوار ہار گیا تھا۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی اور علامہ صاحب اپوزیشن پارٹی کے لیڈر تھے۔ شریف النفس بزرگ اور دینیات کے عالم تھے۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے عقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے۔ جامعہ عباسیہ بہاول پور سے تعلیم حاصل کی تھی، اور اس درس گاہ کے سند یافتہ کو علامہ کہا جاتا تھا۔

آئندہ سطور میں مولانا غلام رسول قلعوی اور بعض دیگر حضرات سے متعلق مولانا عبدالواحد ہاشمی کے تلمیذ علامہ رحمت اللہ ارشد کی تحریر ملاحظہ ہو:

”ہمارے شیخ گرامی مولانا عبدالواحد ہاشمیؒ، شیخ الاسلام میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ، شیخ المشائخ مولانا عبداللہ غزنویؒ اور داعی توحید مولانا غلام رسول قلعے والے کے فیض یافتہ تھے۔ مولانا غلام رسول قلعے والے جماعت اہل حدیث کے سرخیل علما میں سے تھے۔ ہمارے شیخ گرامی کے بقول انھیں تفہیم حدیث اور درسِ حدیث میں خاص مہارت حاصل تھی۔ مسلک اہل حدیث کی ترویج و اشاعت میں ان کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب بعنوان ”تعارف توحید“ لکھی، جس میں عقیدہ توحید کی اہمیت اور شرک کی تردید قرآن وسنت کی رو سے بڑے دل نشین پیرائے میں

بیان کی گئی ہے۔

''مولانا غلام رسول قلعوی نوابان بہاول پور کی علم پروری کے قدر دان تھے۔ لیکن وہ ان کے انگریزی حکومت کے زیر سایہ کام کرنے کے سخت مخالف تھے۔

''انھوں نے ریاستی امور میں انگریز کی دخل اندازی کو ترک کرنے کے بارے میں بہاول پور کے عباسی فرماں رواؤں کو کئی خطوط لکھے۔ مولانا قلعویؒ کے یہ خطوط مولانا عبدالعزیز صاحب ماہرِ تاریخِ بہاول پور وایڈیٹر ماہنامہ ''العزیز'' بہاول پور کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

''انگریز سرکار کی اسلامی ریاستوں میں اپنا اثرورسوخ بڑھانے اور درپردہ اسلام دشمنی رکھنے پر مولانا غلام رسول نے اپنے ہم عصر علما کو خطوط لکھے اور اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ وہ انگریزی علاقے اور اسلامی ریاستوں میں انگریزوں کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ''تحریک تحفظ اسلام'' کے پروگرام کے مطابق مہم چلائیں۔ وہ انگریزی تمدن اور تہذیب کو مسلم معاشرے میں پھیلنے سے روکنے کے لیے علماے اسلام کا مشترکہ پلیٹ فارم وجود میں لانے کے خواہش مند تھے جو مسلم ریاستوں یا مسلمان آبادیوں والے علاقوں میں اسلامی تہذیب وتمدن اور اس کی ثقافت کے احیا کے لیے کام کرے۔''

اس سے آگے علامہ رحمت اللہ ارشد رقم طراز ہیں:

''مولانا غلام رسول قلعویؒ انگریزی تہذیب اور ان کے کلچر سے بے انتہا نفرت کرتے تھے۔ ہمارے استاد مکرم مولانا عبدالواحد ہاشمیؒ کے نام ایک طویل خط میں رقم طراز ہیں۔

''ریاست بہاول پور کا ماحول دعوت کتاب وسنت کے لیے انتہائی ساز گار ہے۔ یہاں کے لوگ پڑھے لکھے اور دین کی سوجھ بوجھ رکھنے والے ہیں۔''اوچ'' میں محدثین کی قبور اور بہاول پور، ملتان میں محمد بن قاسمؒ کی آمد کے نقوش، اس بات کی کھلی دلیل ہیں کہ مسلک اہل حدیث صدیوں پیشتر یہاں پہنچ چکا تھا۔

''امیران بہاول پور کی عربی علوم کی ترویج کے لیے کوششیں قابل قدر ہیں۔ بہاول پور کے رئیس (نواب) باقی ریاستوں کی بہ نسبت اسلامی علوم بالخصوص عربی فنون کی قدر کرنے والے ہیں۔ ان کے عدل وانصاف کے چرچے بھی دور تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن ہمیں جس چیز پر صدمہ ہے، وہ ان کی انگریز دوستی اور ان کے زیر نگیں امورِ سلطنت چلانا ہے۔ غیور مسلمانوں کے لیے یہ بات عجب ہے کہ برطانوی گورنمنٹ ایک مسلمان ریاست کی سرپرستی میں پیش پیش کیوں ہے؟

''انگریز (عیسائی، یہودی) اسلام اور اس کے پیروکاروں کے سب سے بڑے عدو ہیں۔ اللہ کی توحید کے مبلغوں کے دلوں پر یہ بات ناگوار گزرتی ہے کہ مسلمان ریاست کے حاکم انگریز سرکار کی خوشامد کر کے مراعات حاصل کریں۔ احقر نے مسلمان ریاستوں کے حکام کے نام دستی خطوط روانہ کیے ہیں کہ وہ اسلام کو بحیثیت عمل اپنی زندگی میں نافذ کریں۔ اسلام کی عمل داری کے لیے انگریز سرکار کی تابع داری اور حکمت عملیوں سے دست برداری کا اعلان کریں۔ یہ فیصلہ ان کی آخرت اور دنیا میں کامیابی کا ضامن ہوگا۔

﴿وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین﴾

''حکومت برطانیہ ہندوستان کی ریاستوں کو کسی صورت میں اسلام کا مرکز نہیں بننے

دے گی۔ وہ تو اپنے کارندوں اور خاص کر نام نہاد مسلمانوں کے ذریعے اسلام کے احیا کو روکنا چاہتی ہے اور اسلام کے استحکام کو ختم کرنے لیے کوشاں ہے۔

"اللہ تعالیٰ کا اپنے خالص بندوں سے یہ وعدہ ہے کہ وہ مومنوں کو کافروں کے سامنے مغلوب نہیں ہونے دے گا۔ اس کا فرمان ہے۔

﴿هو الذى ارسل رسوله بالهدىٰ و دين الحق ليظهره على الدين كله ولوكره الكفرون﴾

"امیران بہاول پور انگریز سرکار کی سرپرستی سے اپنا دامن صاف کرلیں اور عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق نظام توحید کو اپنی ریاست کے جملہ امور میں جاری کردیں اور ہر قسم کے شرک اور غیر شرعی کاموں سے مجتنب رہیں تو وہ صحیح معنوں میں مسلمانوں کے خلیفہ کہلانے کے حق دار ٹھہریں گے۔

"عزیز محترم!......آپ کا خاندان ریاست بہاول پور میں قرآن وحدیث کی دعوت کا علم بردار ہے۔ اس واسطے سے آپ اہل حدیث کی دعوت کو ریاست کے بلاد وقصبات میں عام کرنے کے لیے مدارس قائم کیجیے۔

میری آپ کے نام، جملہ تلامذہ اور وارثین اسلام کے نام یہ وصیت ہے کہ

① لادینیت اور فسق وفجور سے محفوظ رہنے کے لیے کتاب وسنت پر عمل کریں۔ نجات کا واحد راستہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حضور ﷺ کی تابعداری سے وابستہ ہے۔

② آپس کے مناقشات کو اس حد تک نہ لے جائیں کہ صلح وصفائی کی گنجائش ہی نہ رہے۔ باہمی اختلافات اسلام کی دعوت کو عام کرنے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔

والصلح خیر۔

③ مسلمان میں جہاد کی تبلیغ سے پہلے عقیدہ توحید پر خاص طور سے زور دیا جائے۔
عقیدۂ توحید خالص نہ ہوگا تو جہاد سمیت تمام عبادات ناکارہ ہو جائیں گی۔

④ شرک اور غلط رسوم کو دلائل کی قوت سے رفع کریں۔ اگر حالات موافق ہوں تو وسیع پیمانے پر مباحثے کا بندوبست کیا جائے اور اختلافی مسائل کو قرآن وسنت کی روشنی میں حل کیا جائے۔

میری تمام مسلمین ومومنین کے لیے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے انعام یافتہ بندوں کی راہ پر چلائے اور ابلیسی شرور وفتن سے محفوظ رکھے۔ الا له الخلق والامر۔ یقیناً ہم سب (اللہ) کی مخلوق ہیں اور ہم پر صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

العبد الضعیف

ابوعبدالعزیز غلام رسول

ساکن قلعہ اسلام (نزیل......ملتان)

(21۔ جمادی الثانی، 1288ھ)

مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ اُس زمانے کے عام رواج کے مطابق خطوط فارسی میں لکھتے تھے۔ ہمیں ان کے جتنے خطوط کا پتا چل سکا ہے، وہ سب فارسی میں ہیں۔ خطوط میں وہ فارسی کے اشعار بھی بہ کثرت تحریر فرماتے ہیں، لیکن یہ خط اردو میں ہے جو علامہ رحمت اللہ ارشد کے حوالے سے درج کیا گیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ ان کے فارسی خط کا ترجمہ ہے جو شگفتہ اردو میں کیا گیا ہے اور اس میں ایسی اصطلاحات

لائی گئی ہیں جو اس زمانے کی اردو میں رائج نہ تھیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے افکار کو جدید اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ یہ خط مولانا مرحوم نے ملتان سے لکھا ہے۔ وہ کسی سلسلے میں ملتان تشریف لے گئے ہوں گے، وہیں سے خط تحریر فرمایا جو آج سے 144 سال پہلے کا رقم فرمودہ ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت مولانا غلام رسولؒ کے متعلق مختلف ذرائع سے مجھے جو معلومات پہنچی ہیں، اگر کسی صاحب کے آبگینۂ تدین کو ٹھیس نہ لگے تو جی چاہتا ہے کہ اس کا اظہار پنجابی کے اس لوک گیت میں کیا جائے۔

ماپے تینوں گھٹ رون گے
بہتا رون گے دلاں دے جانی

پچیسواں باب

پنجابی اشعار بنام ''پنج گنج''

حضرت مولانا غلام رسول چوں کہ پنجاب کے رہنے والے تھے اور ان کے اصل مخاطب بھی یہی لوگ تھے، اس لیے انھوں نے وعظ وخطابت میں ذریعۂ اظہار پنجابی زبان کو بنایا۔ وہ پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے ''پنج گنج' کے نام سے پنجابی نظم میں چھوٹی سی کتاب لکھی جو سی حرفی، نصیحت نامہ، حلیہ مبارک صلی اللہ علیہ وسلم اور قصہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ایک مرتبہ چھپی۔ پھر دوسری مرتبہ پچاس سال بعد جناب محمد نسیم بن عبدالوکیل نبیرہ حضرت مولانا غلام رسول مرحوم و مغفور نے شائع کی۔ اس پر تاریخ اشاعت مرقوم نہیں۔ ابتدا میں دو صفحے کا دیباچہ (بہ زبانِ پنجابی) جناب محمد نسیم صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک تمام اشعار میں موت اور قبر وقیامت کا ذکر ہے اور اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت پر زور دیا گیا ہے۔

کسی زمانے میں مذہبی اور دینی موضوع کے پنجابی اشعار کتابوں میں لکھے اور مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔ لوگ اس قسم کے اشعار سننے بھی بڑے شوق ۔ سے تھے،

لیکن اب دنیا بدل گئی ہے اور حالات کی رفتار نے دوسرا رخ اختیار کر لیا ہے۔ اس قسم کے اشعار سے لوگوں کو زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ تاہم اس کتاب کے بعض حصے (سی حرفی، نصیحت نامہ، حلیہ مبارک صلی اللہ علیہ وسلم، قصہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف وغیرہ کے متعلق اشعار) شائع کیے جا رہے ہیں۔ ان اشعار سے زیادہ تر دلچسپی ہمارے دوست حافظ محمد سعید طاہر کو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اشعار اپنی خاص شان رکھتے ہیں۔ آئندہ صفحات میں اشعار ملاحظہ فرمایے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿والاخرۃ خیر و ابقی﴾ (سورہ طہ: 73)

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا رحمان اور رحیم ہے۔ اور آخرت کی زندگی بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

سی حرفی

سی حرفی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے تیس حرفوں کی ہوتی ہے۔ لیکن مولانا غلام رسول کی یہ "سی حرفی" اٹھائیس حروف کی ہے۔ پھر حرف ث اور ح کے چار کے بجائے تین مصرعے ہیں۔

الف: اٹھ جیا کجھ فکر کریے تیرے ستیاں رین وہا گئی آ
تیرے ہان دیاں سیاں لدگیاں ستی پئی نوں ذرا نہ سارپئی آ
سرتے آن نقارے دی چوٹ لگی جھول جھول کے موت جگا رہی آ

نت نت غلام نہ آونا ایں ہائے ہائے کو ںیلڑے سار پئی آ

ب: بس سیو میرے وس نا ہیں واری اپنی اپنی جاونا ایں
ایہو وقت ہے عمل کماونے دا ایھناں دیساں تے پھر نہ آونا ایں
جھناں داج داد ن ایتھے رنگ لیا انھاں قرب پیارے دا پاونا ایں
توشہ بن غلام مسافری دا اینھاں ویلیاں نوں پچھوتاونا ایں

ت: تک رہیاں دلا غافلا وے توں تے کھیڈ توں باز نہ آونائیں
جھناں راہاں توں رب نے منع کیتا واگاں توڑ اوتھاں ول جاونائیں
تینوں موت وی غافلا ہٹک رہی ذرا دیکھ توں کیا کماونائیں
اج خیر دے عمل غلام کر لے بھلکے اٹھ جہان توں جاونائیں

ث: ثابتی نال توں پکڑ میاں، دامن پاک جناب رسول (ﷺ) والا
رات سخت اندھیری ہے بدعتاں دی سنت احمدی (ﷺ) دا کیا خوب چالا
کوئی فکر کریئے ویلا گزر گیا جیہڑی گزری تے اج سنبھال بھالا[1]

ج: جاگ ویکھاں کیا کتیائی تیرے ہان دیاں چرخے چک گیاں
جوڑے پہن کے ہار سنگار گیاں مینوں اک اکلڑی چھوڑ گیاں
ساری رین گزری ناہیں جاگ ڈٹھا پڑیاں پونیاں تھیں بھرپور پیاں
اکو آس غلام کو چجڑی نوں دامن پاک حبیب (ﷺ) دے لگ رہیاں

ح: حال اپنا کہنوں جاد ساں اینھاں دماں دا کجھ وساہ ناہیں
ربا بچ کے بہت کو چجڑی نوں باہجوں فضل تیرے کوئی واہ ناہیں

---

[1] چوتھا مصرعہ مطبوعہ کتاب میں درج نہیں۔ غالباً کتابت سے رہ گیا۔

کئی راہ کولڑے پین بڑے باجھوں شرع محمدی (ﷺ) راہ ناہیں [1]

خ: خویش قبیلے تے بھین بھائی اوڑک وقت تے کم نہ آونیں گے
کسے مول نہ پچھنی ذات تیری کئی ستیاں سال وہاونیں گے
کچھ کت اڑیے ذرا کھیڈ ناہیں اج کل لاگی تیرے آونیں گے
کنڈے قبر دے بیٹھ غلام سارے بکو بک مٹی سر پاونیں گے

د: درداں دی اٹھ کے آہ ماریں کیہی ستیاں عمر گزار پائی
نہیں آیا سیں ایتھے کھیڈنے نوں غافل ہو شطرنج کھلا ر پائی
رہویں وچہ جہان دے دھندیاں دے دلوں قبر تے موت وسار پائی
غفلت خواب دے وچہ غلام ستوں بازی وچہ بے ہوشی دے ہار پائی

ذ: ذکر کریں ایتھوں چلیا ایں خالی چھوڑ کے محل حویلیاں دے
نت انھاں وچہ نہ کتنائیں نہیں بیٹھناں سنگ سہیلیاں دے
موہاں سوہنیاں تے مٹی پاونی گے توڑے ہون گے پھل چنبیلیاں دے
اللہ پاک دے نے نال پریت لائیں کوڑے سنگ غلام نے بیلیاں دے

ر: رات ڈھکی جنج موت والی مینوں مل لئیں گل لا مائے
جھناں سیاں دے نال میں کھیڈ دی ساں اک اک نوں سد بلا مائے
نہا دھو بیٹھی جوڑا پہن لیا ڈولی لئی کہاراں نے چا مائے
ایتھے نت سہیلیاں کھیڈ نائیں میں تے فیر نہ ویکھناں آ مائے

ز: زرد ہو یا پیلا رنگ میرا سوہیاں سادیاں نوں بھاہ لاونی ہاں

---

[1] چوتھا مصرعہ مطبوعہ کتاب میں درج نہیں۔

اکھیں روندیاں روندیاں تھک پیاں دل نوں نت پئی سمجھاؤنی ہاں
نامہ عمل دا بہت سیاہ ہو یا ویلے گزریاں نوں پچھوتاؤنی ہاں
اج جاگ غلامؔ کویل ہوئی نت نت ایہ بات سناؤنی ہاں

س: ساتھ لد ینداڑے ویکھ بھلا ذرا سوچ توں اپنا حال میاں
کتھے چین کتھے سین تیرے ہوئے خواب دے وانگ خیال میاں
اٹھ اکھیاں کھول کویل ہوئی عمر گزرگئی غفلت نال میاں
اج کل غلامؔ جو سد ہوسی اٹھ جاو ناں چھوڑ جنجال میاں

ش: شادیاں نال توں مست پھریں تیرے ساہ گنے عزرائیل میاں
گھڑی گھڑی کریندیاں سال گزرے تیری کچھ نہ بنی سبیل میاں
بھلا دس کیا جواب دیسیں جدوں پچھے گا رب جلیل میاں
دامن پکڑ جناب رسول (ﷺ) والا سب چھوڑ کے جتھاں حیل میاں

ص: صدق دے نال ہے نیہوں لگا کدی جیوندی مکھ نہ موڑ ساں میں
ایہو گنڈ پیارے دے نال میری ہوری نال تے مول نہ جوڑ ساں میں
پتھر مار کے درد دے جانیاں وے شیشہ ننگ ناموس دا توڑ ساں میں
بھانویں بولیاں مار کے لوک ساڑن غیر نال پریت نہ جوڑ ساں میں

ض: ضبط کریں اکو الف اللہ غافل ہو کے وقت گزار ناہیں
میاں رج جاویں متاں بھل جاویں مولا پاک دی یاد وسار ناہیں
ایہو وقت ہے نفع کماونے دا نت رونقاں ایس بازار ناہیں
اٹھ ویکھ غلامؔ جو شام ہوئی تینوں اجے وی غافلا سار ناہیں

ط: طلب آرام نہ لین دیندی روندی ی روندی دیاں گھگاں بہ گیاں
وستی وچہ نہ ٹھہر دا جی میرا متیں دے کے بہت سمجھا رہیاں
کملی ہو رہی جانی یار پچھے طعنے ماردیاں مینوں نت سیاں
مینوں وچہ حیاتی ملیں شالا جانی نت اوڈیک دی تھک پیاں

ظ: ظلم کیتا اپنی جان اتے جیہنے چھوڑیا راہ رسول (ﷺ) والا
ہوری راہ اتے دنے پون دھاڑے ایہو کھولیا راہ وصول والا
دلوں راہ رسول (ﷺ) دا بھل جاناں ایہو کم ظلوم جہول والا
راتیں جاگ تے مار غلام آہیں ایہو وقت ہے بہت قبول والا

ع: عیب ہزار ہزار کیتے چنگا عمل نہ مول کمایا ای
مولا پاک دی یاد وسار بیلی غیراں نال کیا چت لایا ای
آہا نال فرشتیاں سنگ تیرا پھاہی وچہ تقدیر پھسایا ای
ویکھ کنہاں دے نال غلام رلیوں کیہڑے سین ولوں دل چایا ای

غ: غماں دے نال ہے جان آئی ویکھیں آپیاریا حال میرا
تیرے باجھ ہے لباں تے جان آئی کدی آپچھیں احوال میرا
اک گھڑی نہ آوے آرام مینوں تیرے ملن دا شوق کمال میرا
دم دم دے نال غلام دسے ایہو قول پیارے دے نال میرا

ف: فقر دی چاشنی بہت مٹھی جیہنے چکھ لئی سوئی جاندا ای
شربت مصریاں دے بھاویں گھول دیئے پالا تاپ والا کدوں لاوندا ای
عارف رب دے، خلق دے وچہ چھپے باہجوں نظر دے کون پچھاندا ای

ہویا نال حدیث غلامؔ ثابت اُچا مرتبہ خاص انسان دا ای

ق: قفل وچ جھاں دلاں اتے بھلا عشق دی سار کی جان دے نے
جیہڑے سنت احمدیؐ چھوڑ چلے ملحد مسخرے نفس شیطان دے نے
کئی ہور دے ہور خیال کر دے غافل اصل اصول ایمان دے نے
سچ مچ غلامؔ خدا تارے جیہڑے طالب شاہ جیلان دے نے

ک: کملیاں وانگ گوانا ہیں ایسا قیمتی لعل حیات والا
کریں عاجزی اپنے رب اگے صبح وقت ہو یا مناجات والا
خبر دار ہو ویں کجھ کت لئیں متاں گزر جاوے ویلا کات والا
بدعت چھوڑ غلامؔ تے پکڑ سنت احمدی (ﷺ) راہ نجات والا

ل: لد گئے تیرے سین ساتھی تینوں اجے نہ فکر تیاریاں دا
ویکھاں رات ہوئی جھبدے بجھ ملیے لدی جاندا ہے ساتھ پیاریاں دا
ٹھاٹھاں ماردی اجل دی موج آہی نہ توں سکھیائے دل تاریاں دا
حضرت نبی (ﷺ) غلام شفیع ہووے جیہڑا آسرا اے اوگنہاریاں دا

م: ملاں کتاب نوں ٹھپ رکھیں ایہو وقت ہے عمل کماونے دا
چھڈ زید تے عمرو دی بحث میاں اکو الف ہے ورد کماونے دا
ہائے ہائے کویلڑے سار ہوئی ویلا آ پہنچیا ڈیرہ جاونے دا
بھلا اٹھ غلامؔ سامان کریں اتوں سد ہوسی ٹر جاونے دا

ن: نت ویکھاں کھلی راہ تیرا کدی نسو ہنیا مکھ وکھال مینوں
تیرے باجھ پیار یا کون سنیں دساں کھول کے دکھ دا حال کینوں

تتر وانگ لویں نہ سکھ سویں لگے یار دے نال پریت جینوں
جاگ جاگ پیارے ملن کا رن ہو یا سون غلام حرام مینوں

و: واسطے رب دے قاصدا اوئے دسیں جا پیارے نوں وین میرے
جند لباں اتے ویکھاں راہ تیرا آنسو خون وہا وندے نین میرے
تیرے باہجہ نہ رہیا قرار مینوں گزرن تڑف دیاں دن تے رین میرے
کدی لئیں غلام دی سار جانی گئے نال وچھوڑے دے چین میرے

ہ: ہسناں کھیڈ ناں چھوڑ سیو کچھ کت کے داج بنا لیے
کھیڈے لگ کے نال سہیلیاں دے متاں عمر عزیز گنوا لیے
بھلا پونیاں کھوہ گوانا ہیں چرخے عشق والے تند پا لیے
ساری رین غلام نہ جاگ ڈٹھا ہنے جاگ کے کجھ کما لیے

ی: یاد ناہیں ذرا گور تینوں جس راہ اکلیاں جاونا ایں
تینوں چھڈ کے سب پیاریاں نے اپنے آپ گھریں ترآونا ایں
ہیبت ناک فرشتیاں رب ولوں دہشت ناک سوال سنا ونا ایں
غلام اک روز جہان نوں چھڈ جاناں تیرا گوشت کیڑیاں کھاونا ایں

نصیحت نامہ

ان چند پنجابی اشعار میں کہیں کہیں اردو کے الفاظ بھی ہیں۔

دلا غافل نہ ہو یک دم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے

باغیچے چھوڑ کر خالی زمیں اندر سمانا ہے
تیرا نازک بدن بھائی جو لیٹے سیج پھولوں پر
ہووے گا ایک دن مردار یہ کرموں نے کھانا ہے
اجل کے روز کو کر یاد، کر سامان چلنے کا
زمین کے فرش پر سونا جو اینٹوں کا سرہانا ہے
نہ بیلی ہو سکے بھائی نہ بیٹا باپ تے مائی
کیا پھرتا ہے سودائی عمل نے کام آنا ہے
جہان کے شغل میں شاغل خدا کی یاد سے غافل
کریں دعویٰ جو یہ دنیا میرا دائم ٹھکانا ہے
غلط فہمید ہے تیری نہیں آرام اس پل میں
مسافر بے وطن ہے تو کہاں تیرا ٹھکانا ہے
فرشتہ روز کرتا ہے منادی چار کوٹوں پر
محلاں اچیاں والے تیرا گوریں ٹھکانا ہے
کہاں وہ ماہِ کنعانی کہاں تخت سلیمانی
گئے سب چھوڑ یہ فانی اگر نادان ودانا ہے
عزیزا یاد کر وہ دن جو ملک الموت آوے گا
نہ جاوے ساتھ تیرے کوئی، اکیلے تیئں نے جانا ہے
نظر کر دیکھ خویشوں میں جو ساتھی کون ہے تیرا
انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اکیلے کو دبانا ہے

نظر کر ماڑیاں خالی کہاں وہ ماڑیاں والے
سبھی جھوٹا پسارا ہے دغا بازی کا بانا ہے
غلاؔم اتنی نہ کر غفلت حیاتی پر نہ ہو غرہ
خدا کی یاد کر ہر دم جو آخر کام آنا ہے

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا رحمان اور رحیم ہے

﴿قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فا تبعو نی یحببکم اللّٰہ﴾

(سورہ آل عمران:31)

''تم (اے پیغمبر) کہہ دو (ان لوگوں سے) اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

حلیہ شریف نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(مدینہ منورہ میں حاضری کے بے پناہ شوق کا اظہار)

چلیں اس دیس نوں وے سار بانا!
جتھے کیتا حبیب اللہ ٹھکانا
چلا اُشتر ہو واں قربان تیری
تیرے راہاں توں گھولی جان میری
ہوئی مدت جو روون نین میرے

کلیجے چھیک پا ون وین میرے
رسول اللہ دے کر کر یاد آثار
الغبے مار بھڑکے شوق دیدار
مدینے تک پوچا اک وار مینوں
حیاتی میں ملا دلدار مینوں
غبار اس راہ دا سرمہ بنا واں
ہوواں صدقے اگر اک جھات پاواں
اگر پر ہوون تاں ماراں اوڈاری
ویکھاں روضہ جے طالع کرن یاری

ذکر شمائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

سفید اوہ رنگ جیوں سرخ ملاسی
جویں آئینہ نورانی جلاسی
مقابل توں زرو دیوار دسن
پوے جلوہ رسول اللہ جاں حسن
میانہ قد سوہنی چال چلدے
گویا اونچی سے نیچی طرف ڈھلدے
کھلے بیٹھے دیون اچی وکھالی
دسن دن وانگ وچہ رات کالی

عظیم الشان واہ واہ سر مبارک
وہ محبوبِ خدا وندِ تبارک
نہ سدھے وال تے نہ گھنگرالے
کدی موہڈیاں تلک گاہے وچالے
کدی کناں تلک کالے سہاون
سرِو دا تیل اکثر وقت لاون
معطر وال فرق اندر میانہ
کرن آغاز بجی طرف شانہ
بھواں باریک پر کھچیاں کمانے
پلکاں لمیاں لگا ون دل کو کانے
دو نویں ابرو مبارک سن مقارن
عنایت سے نظر فرما کے تارن
وہ پورے گوش سننے میں زیادہ
جو ٹکڑا چاند دا متھا کشادہ
اکھیں وڈیاں پیا سرمہ الٰہی
نظر بہتی زمیں دی طرف آہی
عشا دے بعد نت سرمہ لگا ون
ترے ترے میل ہر ہر چشم پاون
سیاہی اکھیاں دی بہت کالی

سفیدی خوب ڈوری سرخ ڈالی
ویکھن پچھلیاں صفاں تک حال سارا
نماز اندر ہو وے سب آشکارا
حیا غالب تے ویکھن بہت دوروں
دِسّے اچا مبارک نک نوروں
کشادہ ذات بابرکات سو ہے
مٹھی بولی جو بولی دل کو موہے
لطافت بہت پتلے ہونٹ آہے
جدھے منہ تھک لائے بھاکھ لاہے
کشادہ دند مارے نور چمکار
ہووے روشن تبسم وقت دیوار
دو رخسارے گو لائی خوب سجدی
رسول اللہ دی داڑھی سینہ کجدی
سیاہ انبوہ داڑھی گرد پُر نور
برابر مٹھ دے آہی بدستور
مبارک وال بگے بیست سے کم
یقینی گنتی واللہ اعلم
نہیں کیتا خضاب اس پاک محبوب
ایہو جمہور دی تحقیق ہے خوب

کیا گردن مبارک پر صفا سی
گویا پتلی سی گردن خوش نما سی
وچالا موڈھیاں دا دور آہا
رسول اللہ سرا سر نور آہا
وہ خاتم ختم نبیاں دا نشانہ
عجب سو ہے مبارک ہر دو شانہ
مثال تکمۂ حجلہ سہاوے
جویں بیضہ کبوتر دا وکھاوے
موڈھے تے وینیاں تک وال کالے
منور گول بازو فیض والے
دونوں بغلاں سفید و سرخ خوشبو
دو پستانِ مبارک صاف بے مو
شکم تے سینہ والوں پاک تے صاف
مگر اک خط سینیوں تا حد ناف
وہ بھاوے چوڑا چوڑا خوب سینہ
کیا اسرار غیبی دا خزینہ
شکم ہم وار تے باہاں دراز اں
دو تلیاں کھلیاں مسکین نوازاں
مبارک پشت جیوں کر صاف چاندی

تعالیٰ الله کیا طاقت بیاں دی

ریشم وانگ کولیاں نرم تلیاں

اڈی نازک تے سن باریک پلیاں

قدم ہم وار آہے بہت کولے

کسے ایسا نہ ڈٹھا ہوگ مولے

زمیں اوپر قدم رکھن برابر

اونہاں قدماں تلے سارے اکابر

نبی ﷺ نوں بہت کڑتا سی پیارا

گریباں سامنا سی آشکارا

وہ ٹوپی پر سہاوے گول دستار

اوپر بُردِ یمانی سرخ خط دار

ادیم طائفی جوڑا معطر

چلے عاشق دے نیناں پر قدم دھر

پنی آدھی تلک تہبند پاون

گئے کبھی وعید اس نوں سناون

جیہڑے کوچے گزر فرما کے جاوے

انہاں توں مشک دی خوشبوئی آوے

رسول الله ﷺ دا سرا پا ربا سی دل

جہان اس مصطفےٰ ﷺ پر فدا سی

کوئی اوطان سی ہوئے مہاجر
کوئی سن اس رسول اللہ ﷺ کے ناصر

حلیہ مبارک خورد

جا مدینے وا سحر دی
خبر لیا میرے دلبر دی
بعد صلوٰۃ سلام ہزاراں
بلبل و انگوں کراں پکاراں
رو رو حال سنائیں میرا
تاں محبوب کرے اک پھیرا
تاریاں گن دیاں گزرن راتیں
من دے نال سجن دیاں باتیں
جے ہووے بختاں دی یاری
جانی آ ملے اک واری
بنھ سفید عمامہ سر پر
حجرے ولوں دسے دلبر
برد یمانی موہنڈے پاوے
پہن طائف وا جوڑا آوے
مشتاقاں نوں مکھ وکھاوے

نین میرے تے قدم ٹکاوے
قد میانہ تے مکھ ہسدا
جی میرے دے اندر وسدا
رنگ سفید مبارک واہ واہ
سرخی خوب ملائی اللہ
چن چودھویں وانگوں مارے
نور الٰہی دے چمکارے
رخساریاں دے وچہ گولائی
آئینے دے وانگ صفائی
سر حضرت دا عظمت والا
واہ واہ عالی ہمت والا
وال کناں تک لٹکن کالے
کدیں موہنڈے تلک گاہے وچالے
نہ سدھے وال تے نہ گھنگرالے
اندازے دے چھلیاں والے
اکثر تیل سرو دا لگا ون
ایک رومال سرے پر پاون
زلفاں دے وچہ فرق جو کردے
واللیل دے کھولے پردے

کدی کدی وی شانہ کردے
اول ہیجے پا سے سردے
ویہ (20) نہ پورے ہوئے بگے
بھلا اس خضاب دی لگے
جس نے خبر خضاب سنائی
گرمی وقت حنا لگائی
بہت کشادہ سی پیشانی
چاند جیسی دے نورانی
پتلے ابرو تے وِتھ تھوڑی
کھچی عشق کماناں جوڑی
رگ نازک سی وچہ دوہاں دے
وقتِ غضب جنبش فرماندے
اکھیں بہت سیاہ سیاہی
بہت سفید سپیدی آہی
دوروں ویکھن لمیاں واتاں
ڈورے سرخ وی مارن لاٹاں
نیواں ویکھن تے شرما دن
بعد عشا دے سرمہ لاون
نک مبارک اچا دے

داڑھی پر تے نور وسے
گردن چاندی وانگ صفائی
گویا دھون مورت دی آہی
بھارے جوڑ تے چوڑا سینہ
شکم برابر دل بے کینہ
پستاناں تے وال نہ کائی
شکم مبارک خوب صفائی
مگر بازو تے موہنڈے نالے
سینہ تے بھی دسن کالے
خط سینہ تھیں دھنی تاکر
روشن سارا بدن منور
تلی کشادہ لمیاں باہاں
چلن ویلے چھکن اگاہاں
پیر مبارک دی پڑ یائی
بہت مبارک سوہنی آہی
لمیاں انگلیاں تے پُر تلیاں
واہ مبارک سن اوہ گلیاں
شافع امت ختم رسولاں
سرور ہے ساریاں مقبولاں

سارے عالم وچوں اکرم
صلی اللہ علیہ و سلم
میں غلام رسول اللہ دا
چاہاں نت وصول اللہ دا
ترمذی دیکھ شمائل بھائی
اس حلیہ دی نظم بنائی
اس عاجز نوں بخش الٰہی
عمر گزاری نال تباہی
سنیا میں نے کوچ نقارہ
دل میرا ہے پارہ پارہ
دن ساتھ لدیندے جاندے
نت سنیں حال اونہا ندے
ہن واری ہے ساڈی آئی
وجیا کوچ نقارہ بھائی
سفر دورا ڈا خرچ نہ پلے
خالی ہتھ جہاں توں چلے
آج کل منجا تیرا چاون
سب عزیز کھلے کر لاون
سنجے چھڈ باغیچے جاسیں

ویلا ای پھر پچھو تا سیں
جیوں لڑ کے دل کھیڈ لگایا
جتی کپڑا چور اٹھایا
ایسا دل بازی وچہ لایا
کپڑا جتی یاد نہ آیا
رات پئی گھر گیاں سیّاں
میں شرمندی پچھے رہیاں
کس منہ نال گھرنوں جاواں
کیونکر کالا منہ وکھا واں
چرخہ خوب رنگیلا میرا
ہتھی پکڑ نہ دتا پھیرا
ستیاں ساری رین وہائی
پونی چھلی کھوہ گوائی
کات منکن تے کی وکھا واں
ہائے کو یلے کتول جا واں
منزل پہلی بھاری آئی
چھڈ اکلے چلے بھائی
ستا ہیں تے جاگ سویلے
کی کریں توں اٹھ کو یلے

رات بدعت دی بہت ہے کالی
بالیں مشعل سنت والی
تا ایمان ہو وے نورانی
دور ہوون پر دے ظلمانی
نال شفاعت ختم نبیاں ﷺ
پکی آس ہے میرے جیہاں

ش: ثابتی نال گھر ماپیاں دے کجھ کت اٹیرا نالے نی
تیرے ٹرن دا وقت قریب آیا ہن کھیڈ ولوں چت چالے نی
نال عقل دے باہنوں بنھ کڑیے رنگ شاہ پسند رنگالے نی
ساری رات غلام نہ جاگ ڈٹھا ہن جاگ کے کجھ کمالے نی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا رحمان اور رحیم ہے

﴿ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ﴾

(سورہ البقرہ: آیت نمبر 207)

''اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے۔''

قصہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ

(حضرت بلالؓ دا ایمان لانا)

سنو اس عشق دا قصہ عجیبہ
صحابہ نوں ملا جس سے نصیبہ
بلالؓ آیا موذن مصطفےٰ کا
امام و پیشوا اہل صفا کا
امیہ دا غلام اوہ ابتدا سے
غلاماں سے وہ حبشی با وفا سے
جو بت خانہ کی خدمت پر مقرر
کرے جا روب تے رکھے معطر
سنا جب اس نے ظہور احمدی ﷺ کا
بھر سو جلوہ نور احمدی ﷺ کا
گیا اندھیر بدعت شرک والا
نہ بھاناں چا چڑیاں نوں اجالا
بلالؓ ایہہ مژدہ سن خوشحال ہویا
محبت نال مالا مال ہویا
اوہ بن دیکھے لیایا دل سے ایمان
کیا توحید کا مضبوط پیمان

احد احد کھڑا ہر دم پکارے
بسوز عشق آہیں سرد مارے

امیہ دا بلال رضی اللہ عنہ دے ایمان دا سننا اور سزا دینا

امیہ نے سنا لایا ہے ایمان
غلاماں نوں کیتا فی الفور فرمان
جو ایہہ گولا میرا بس بے وفا ہے
جو گرویدہ بدین مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے
سزا اس کام کی منظور مینوں
نہیں خوش ایہ نواں دستور مینوں
دو پہراں وقت جب ہو سخت گرمی
نہ کرو کجھ سزا دینے میں نرمی
غلام اس حکم دی تعمیل کارن
مغیلاں دے لیا کے خار مارن
وہ ظالم بے حیا سولاں کھواون
چنانچہ استخو اناں تک پنجاون
دو پہریں گرم پتھر گرد چن دے
نصیحت رحم والیاں دی نہ سن دے

پوے جب رات حجرے میں کھلارن
ادھ وار و وار چابک سخت مارن
ولیکن عشق شعلہ مار و ڑیا
بجذبہ ماسوئی المحبوب سڑیا
ملامت دشمناں دی کم نہ آوے
جو روغن دم بدم آتش مچاوے

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دا اوتھے جانا
تے بلال رضی اللہ عنہ نوں ایمان دے چھپان دا کہنا

اک دن اس گلی صدیق اکبرؓ
چلے تھے کام اپنے کو گزر کر
احد کہنا سنا اس سوز والا
ویکھیا اس ظلم بے داد کا چالا
اوہ رو نا درد والا سن کھلویا
سسرڑا دل چشم زار و زار رویا
اکیلا ہو کہے ابو بکر صدیقؓ
تیرے دل پر جو چمکا نور تصدیق

کفایت ہے خدا دانائے اسرار
جھوداں میں نہ کرتوں سر اظہار
تیری طالع ملا گنج ازل کا
چھپا ان مشرکوں سے راز دل کا
کہیا تو بہ میری اظہار کولوں
ثبات اس عالم الاسرار کو لوں
دوجے دن گھٹ چڑھی پھر عشق والی
نہ چھوڑی توبہ دی اس ایک ڈالی
عتیق اللہ اوہ حال ویکھے
غلاماں ظالماں دی چال ویکھے
غرض سمجھا چکے اوہ چند واری
نہ آوے عشق نوں اوہ پند کاری
بآخر توبہ کو لوں ہو کے بیزار
کہے رو رو مخاطب کر کے دلدار
محمد ﷺ اے میری توبہ دے دشمن
تساڈے عشق نوں توبہ نہ ممکن
میرا لوں لوں لیا ہے عشق نے مل
سمائی توبہ دی ہوئی ہے مشکل
اندھیری عشق دی پتر او ڑائے

خدا جانے کیہڑی دیسیں پو نچائے
اچانک عشق دا سیلاب آیا
صبوری ر ڑگئی اک پل نہ لایا
جدوں کی عشق والی موج آئی
اودوں کی توبہ دی کشتی رڑائی
پھلاں دی سیج نوں میں اگ لائی
جو برہیوں سیج کنڈیاں دی وچھائی
ویکھو اے بے نصیبو لالہ زار اں
انہاں خاراں کولوں کھڑیاں بہاراں
اگرچہ تن میرا غربال ہویا
ہوا قع گلشن اقبال ہویا
میرے گھر اج پھر آیا پیارا
صبوری کوچ د ا مارا نقارا
شکست توبہ ہوئی فرض مینوں
سوا محرم سناواں حال کینوں
میرا احوال کی بے درد جانن
اوہ بن چاکھے کدوں ایہ ذوق پاون
رسول اللہ ﷺ توں صدقے جان میری
ایہ فانی زندگی قربان میری

کیا سمجھن سیا نے نبض میری
ہزاراں ویکھ تھکے نبض میری
نہیں دارو میرا قرص طباشیر
کرو محبوب دے ملنے دی تدبیر
جے تاں سب درد تے دکھ دور ہوون
اوہ شیشے ننگ والے چور ہوون
تسیں دیوانہ سانوں جان دے ہو
دنیوں دینوں مٹھے شیطان دے ہو
خرد و عقل دی دیوانگی نوں
ہووے عشق حبیب اللہ میں مجنوں
ہزار اں عقل اس سودا میں قربان
ایہو دیوانگی ہے عین ایمان
میرے بختاں نے کیتی اج یاری
شکست توبہ دی آئی ہے واری
گلی ساڈی جو پھر محبوب آیا
سکیں نہریں خدا پانی وہایا
کراں دل دا گریباں پارہ پارہ
مینوں نعرہ ہے مستانہ پیارا
سجن دے دیس تھیں گھلیاں نے واؤں

پھلاں وانگوں میرا کھڑیا اے لوں لوں
احد احد پکاراں و انگ بلبل
فرشتوں میں پڑا اس سوز کا غل
ملے فرصت نصیب اللہ سوائے
رڑی توبہ جو پھر سیلاب آئے
غرض مڑ گھر چلے صدیق اکبرؓ
اودی توبہ کولوں نا امید ہوکر
کہا عالی جناب مصطفےٰ ﷺ کو
جو دیکھا سی بلال با صفا کو
رسول اللہ ﷺ میں دیکھاں باز شاہی
گرفتارِ گنا ہِ بے گنا ہی
الو خوش ہو اجاڑاں وچہ وسّن
اوہ طعنے مار شہبازاں نوں ہسن
تسیں باغاں دی باتیں کیوں سناؤ
اساڈے ساتھیاں دے دل اٹھاؤ
ذرا سمجھو جو ایہ مسکن اساں دا
نمونہ ہو بہو باغِ جناں دا
گویا فردوس نوں ویرانہ بولو
نویں باتیں بنا بہتان تولو

تساڈی سین دے سدن اجاڑاں
اسانوں جلد دا نگوں نو بہاراں
تساڈا جی جے سرداری نوں چاہے
ایسے کا رن فریب اتنے بنائے
بھلا چاہو تو اس سے باز آؤ
انجاناں نوں کیوں راہوں بھلاؤ
چو منجی کر دو پہریں سخت مارن
عداوت سے محض اسلام کا رن
کہا میں راز داری تھیں مکرر
ولیکن عشق دی برپا ہے محشر
اوڈھے تے توبہ دا دروازہ ہے بند
میری اس باب میں سن دا نہیں پند
رسول اللہ ﷺ کہا چارہ کیا ہے
کہو اس مبتلا کی کیا دوا ہے
کہا صدیقؓ نے میں ہوں خریدار
اگرچہ نقد جاں منکن گے کفار
پسند آئی رسول اللہ ﷺ نوں تدبیر
کہا اس مول میں میرا کرو سیر
اجازت لے چلے صدیق اکبرؓ

امیہ نوں کہیا فی الفور جا کر
جو کس ملت میں بے رحمی روا ہے
کیہڑے مذہب میں روا اتنی سزا ہے
توں آخر باز رہ ظالم جفا سے
ستم لائق نہیں اس با وفا سے
کہیا مشرک جے چاہیں مول لے لے
وگر نہ مفت کا غو غا کیا ہے
کہیا صدیقؓ نے ہے عین مقصود
جھو دی بندہ تیرے وانگ مردود
جو ہے نسطاس رومی نام مشہور
نصیب اس دے نہیں ایمان دا نور
وہ نسطاس رومی جب دکھایا
نصاب نقرہ مشرک نے ودھایا
دتا صدیقؓ نے لے لیا مول
جسے مشرک جو سود امیں گیا بھول
کوئی دانا نہ سی اس کا خریدار
خطا کیتی مسلماناں دے سردار
اگر اتنا تقاضا اوہ نہ کردا
نہ کردا اس طرح نقصان زردا

کہا صدیقؓ نا دانو کی جانو
کیا مقدار لعلاں دے پچھانوں
جما دی چند د ادم جاں خریدم
بجمد اللہ عجب ار زاں خریدم
لیا میں لعل دے اخروٹ تینوں
سوئی جانے ہووے ایہ سار جہنوں
چلے صدیق اکبرؓ مول لے کر
کیتا حاضر بدر گاہِ پیغمبرؐ
کیتا جب اس رسول اللہ دا دیدار
کھڑا حیران ہو وہ دیکھ انوار
کہا حضرت نبی نے اے بلالا
تیرے پر رحم فضل حق تعالیٰ
نبی دی شمع پر پروانہ ہویا
وہ جذبۂ عشق سے بیگانہ ہو یا
پڑا بے ہوش رو رو کے زمیں پر
اونہوں دلدار ہو یا آ کے دل بر
رسول اللہؐ ہوئے تشریف فرما
جویں شفقت کرے فرزند پر ما
زمیں سے آپ ﷺ نے رحمت کر اٹھایا

اٹھا سینے مبارک نوں لگایا
کیا دولت کیا ہے بختیا ری
کیا فیضان دا چشمہ ہے جاری
کیا اس حال دی تقر یر کر یے
کیا اس ذوق دی تعبیر کر یے
جو گویا مس تے اکسیر پایا
اندھیری رات نے تنویر پایا
کیتا صدیقؓ نے آزاد فی الفور
پسند آیا رسول اللہ ﷺ نوں ایہ طور
کہا کیوں نہ کیتا توں سیر میرا
کہا پوشش کرو تقصیر میرا
مینوں حاجت ہے عملاں دی بسیار
تینوںؐ معصوم کیتا آپ غفار
جواب ایہ سن نبی ﷺ خوشحال ہوئے
خوشی دے نال مالا مال ہوئے
بفضل اللہ بلالؓ آزاد ہویا
بخدمات نبی دلشاد ہو یا
کہا رہنا غلامی نال اس در
ہزار آزاد یاں کولوں ہے بہتر

نبی ﷺ دی جب تلک سی زندگانی
کرے اخلاص سے خدمات جانی

آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد بلال رضی اللہ عنہ کا مدینہ سے چلے جانا پھر آنا اور وفات پانا

سفر کر جب رسول اللہ ﷺ سدہائے
وچھوڑے نال بھا نبڑ دل جلائے
جو سوئے پہن کر برد یمانی
رووں بے خواب چشم زندگانی
مدینے میں پڑی سی رات کالی
دسن روندے درو دیوار خالی
بہتیرے وطن سے بیگانہ ہوئے
بہتیرے عقل سے دیوانہ ہوئے
بلال اٹھ شام نوں چلے سفر کر
کہا اس حال میں صدیق اکبر
رہو جے کرتسانوں ہو وے منظور

مؤذن مسجد نبوی بد ستور
کہا مینوں تساں دلشاد کیتا
کفاراں تھیں چھڑا آزاد کیتا
نہ دو اس کام دی تکلیف مینوں
جزاک اللہ فی الدارین تینوں
مدینے میں نہیں لگدا میرا جی
سوا محبوب دے دارو کراں کی
جدوں سجاد سے محرابِ دلدار
کھڑے سر پر آتش ہجردی ساڑ
ارحنی کون فرما وے گا مینوں
کتھے دلبر سنا واں حال کینوں
دکھاں دے جان آئی میری نال
پریت آہی پیارے میری نال
بھلا اوہ سنگدل کتھوں نکالاں
سوا محبوب دے اس دیس جالاں
وچھوڑے دی پڑی ہے شام مینوں
نہیں دلدار باہجھ آرام مینوں
غرض اوہ شام ہوئے مسافر
پھرن لوکاں کو لوں کردے تنفر—

کیا بے خود پچھے دل دار دے دل
مجالس میں نہ ہو وے چین حاصل
پچھا لوکاں عزیز ا کون ہے توں
کیوں غم نال ہے اس طور مجنوں
کیا ہے اس نواحے کام تیرا
بھلا دسو کیا ہے نام تیرا
کیا ڈھونڈیں پھریں ہویا اداسی
ایتھے آنا کہو مطلب کیا سی
کہیا یارو کیا احوال د ساں
کتھے محرم جو دل دا حال دساں
کیا دَستے خزاں دا حال بلبل
گیا گزر عزیزا موسم گل
جدوں محبوب سی سب چین آ ہے
میرا دل اوہ زمانہ پھیر چاہے
انہاں روزاں نوں یارو ڈھونڈتا ہوں
اکیلا چھوڑ ٹر یا یار مینوں
کیتا اس درد آوارہ وطن سے
اڈی بلبل او داسی ہو چمن سے
کیا دساں کیا ہے نام میرا

کھڑا دل دارنے آرام میرا
میرا محبو ب محبوب الہی
اوہدے قربان ہزاراں تاج شاہی
قربیناں نال لوکاں نے پچھاناں
وہ غلبۂ عشق میں معذور جاناں
جو کیوں نہ کر ہووے اوہ دل سودائی
جسے ہوئی نبی ﷺ کولوں جدائی
چھمائیں بعد ستیاں اک راتیں
رسول اللہ کرن اس نال باتیں
کیوں ہمسائیگی ساڈی گیوں چھوڑ
کدی واگاں مدینے دی طرف موڑ
کرایہ کر شتر پہنچے شتابی
مدینے میں ملے اکثر صحابی
صحابی سے پوچھا اول ملاقات
جناب فاطمہؓ حسنینؓ کی بات
وفات فاطمہؓ سن بہت رویا
مشرف خدمت حسنین ہویا
صحابہ بانگ دے مشتاق سارے
بلالؓ اس کام کولوں بر کنارے

حسنؓ مرضی صحابہؓ دی جو پائی
تقاضا کرا اذان اس سے کہائی
کہا اللہ اکبر جب بتکرار
گویا رونے لگے سب درو دیوار
شہادت جب کہا غلغل پڑا سی
رسول اللہ کہا نیچے گرا سی
پڑا بے خود اذان کا مل نہ ہوئی
نہ جانے عشق دے اسرار کوئی
دلا رو یاد کر کر وہ زمانہ
جو یں رویا سی مسجد میں حنا نہ
کیا اصحاب بابرکات آہے
کیا متبرک اوقات آہے
اونھاں دیدار دے انوار پائے
اونھاں اس فیض دے اسرار پائے
اونھاں بیعت نبی ﷺ دے ہاتھ کیتی
اونہاں مجلس نبی ﷺ دے ساتھ کیتی
تعالیٰ کیا سن طالع یار
کوئی مہاجر ہووے کوئی انصار
خدایا دل میرا بھی کر منور

بایمان خاتمہ بالخیر آخر
کتاب اللہ تے سنت پیغمبر
میرا یا رب وظیفہ دائمی کر
محبت رحمتہ للعالمینؐ کی
شفاعت اس شفیع المذنبینؐ کی
ایہو بس ہے دونوں عالم کا ساماں
پھڑا میں نے رسول اللہ کا داماں
غلامی اس رسولؐ مجتبیٰ کی
کفایت ہے جو ہے رحمت خدا کی

جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چاہت کا اظہار اور عاشقانہ آہ وزاری کرنا

صبا روضے رسول اللہؐ دے جائیں
میرے احوال رو رو کے سنائیں
کہیں بعد از ہزاراں بار صلوات
کر وڑیں بار تسلیم و تحیات
جو اے محبوب ربانی نگاہ کر

وچھوڑے سے ہے جاں آئی لباں پر
الٹبے عشق سے جل بل گیا جی
کہو اس در د دا دا رو کراں کی
خدا جانے جدوں دی جائیاں میں
میرے بابل تیرے لڑلائیاں میں
میرا دل چور کیتا درد تے غم
ترحم یا نبی اللہ ﷺ ترحم
دیہو جلوہ اٹھا برد یمانی
نہیں تے ہو چکی ہے زندگانی
تعلق شہر سے یک بار چھوڑوں
مدینے کی طرف دیوانہ دوڑوں
جوتا محبوب دے آثار ویکھاں
وہ روضہ مطلع انوار ویکھاں
کراں دن رات نوں دل سے دعائیں
خدا و ندا حبیب اپنا ملائیں
حیاتی ہو گئی برباد میری
کرو مقبول ایہہ فریاد میری
گناہاں نال مَیں نامہ سیاہ ہوں
بسا تقصیر مندو پُر گناہ ہوں

تغافل نال گزری عمر ساری
گیاں سیاں کھڑی رہیاں بیچاری
نہ میں جاگ چرخے تند پائی
تمامی رات سونے میں گوائی
گیاں سیاں کو ملے سار ہوئی
کسے جا ہگ نہیں مل دی ہے ڈھوئی
کیا کرساں جو بھلکے کات منکسن
اجل دی جنج بوہے آن ڈھوسن
جدوں ڈولی کہاراں آن چائی
اکیلے چھوڑ جاسن بھین بھائی
بیگانیاں نال ہے پر دیس جا ناں
نہیں پھر نت، نت اس دیس آناں
غلام ایہ پر گناہ بے سازو ساماں۔
پھڑا محکم رسول اللہ دا داماں

جناب سید عبدالقادر جیلانی محی السنہ رحمہ اللہ کی تعریف میں

دلا اٹھ جاگ گزری رات ساری
گیّاں سیّاں تیری ہے اج واری
کیا کرسیں نہیں کچھ کات تیری
تغافل نال گزری رات ساری
نقارا کوچ دا مارا اجل نے
سفر پیشہ کیا طول امل نے
کو یلے اٹھ کیا سامان کر سیں
بنا کشتی کویں طوفان ترسیں
جے چاہیں قرب ربانی دے انوار
چلا چل شاہ جیلانی دے آثار
معارج قرب دے چڑھیا قدم دھر
تمامی اولیاء کی گردنوں پر
چلا حضرت نبی ﷺ کے گام پر گام
اسی موجب محی الدین ہوا نام
میرا محبوب سبحانی ہے محبوب
میرا اوہ محبوب صمدانی ہے مطلوب

وہ آئینہ ہے سنت احمدی ﷺ کا
وہ موردِ خاص فیض سرمدی کا
بحمد اللہ میرے ہیں طالع یار
بڈھی وانگوں یوسف دے خریدار
کیا اس شاہ کا ہے شان عالی
وہ بستانِ حقیقت کا ہے مالی
غلام اس جام کا ہے دل پیاسا
ہووے اس فیض دے دربار واسا

حلیہ مبارک حضرت محی الدین سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ

کھلی بغداد دی واو فیض والی
ہوئی سرسبز تازہ پھول ڈالی
میرے دل دی کلی اس نے ہنسائی
کلیجے عاشقاں دے ٹھنڈ پائی
اڈی بلبل چمن دی کر تیاری
چلی گل دیکھنے کو کر تیاری
اداس جی میرا ہے وانگ بلبل
کرے محبوب دے ملنے کو غلغل

میرا محبوب ہے محبوب سبحان
نمونہ سنت دا ہے شاہِ جیلان
جو دوہتا ہے محمد مصطفےٰ (ﷺ) کا
وہ پوتا ہے علی المرتضےٰؓ کا
حسنؓ دے باغ دا ہے وہ تازہ گل
تعالیٰ کیا اس دا تجمل
کیا سوہنا مبارک رنگ انور
سفیدی میں ملی سرخی منور
نحیف البدن محبوب الٰہی
اوہدے پر ختم ہوئی دلربائی
میانہ قد لگے دل نوں پیارا
ہو یا مفتون اس پر جگ سارا
جھلک رخسار دی اکھیں جھلن
ہوواں صدقے جو سوہنی چال چلن
دو ابرو شاہ اعظم دے ملے سن
سیاہ اکھیں میں ڈوری سرخ دسن
لمی چوڑی مبارک ریش آہی
چمک دے وال نورانی سیاہی
بلند آواز تے قدرے شتابی

سنن جو درس ہووے فیض یابی
ودھے رغبت تے ہیبت حاضراں نوں
ہووے دل نرم ڈٹھیاں ناظراں نوں
کھلا سینہ مبارک دا خزینہ
جیہدے کولوں ہووے حاصل سکینہ
ڈوبے نے انگلیاں دے شمس سارے
اسا ڈا شمس ا یدی بر کنارے
قیامت تک رہے گا فیض جاری
ہمیشہ موسم فصل بہاری
غلام امید وار مہربانی
او سے در دا اراد ت مند جانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کلی امید دی یا رب ہنسائیں
گل گلزار عرفانی دکھائیں
جو تا مستانہ ہو مانند بلبل
کروں توحید کے باغوں میں غلغل
نسیم فضل حق دی ہووے تائید
کراں تکرار اول شکر تحمید

سپاس وحمد ہے خالص خدا کوں
معلّے بار گاہ کبر یا کوں
وہی رحمان رب العالمین ہے
کرم سیتی ضعیفاں کو معین ہے
ثنا اس ذات کی ہے بہت مشکل
تمنا سے نہیں ہوتی ہے حاصل
جولا احصی رسول اللہ کہا ہے
کسی نوں تاب وطاقت پھر کیا ہے
غلام اس جا نہیں امکان تحریر
مناسب دم بدم ہے عذر تقصیر

نعت آنحضرت محمد ﷺ

الٰہی بھیج صلوٰت و تحیات
کروڑیں بار تسلیمات و برکات
جناب مستطاب مصطفےٰ ﷺ کوں
حضور پر سرور مجتبےٰ کوں
جویں یا رب کیتو معمور سانوں
جویں وہ شان ہے معلم تسانوں

خصوصاً چار یار با صفا کوں
جو تھے ارکان دین مصطفےٰ کوں
خصوصاً افضل الخلفاءؓ صدیقؓ
عمرؓ فاروق عادل یار تحقیق
جناب پاک ذوالنورین عثمانؓ
علیؓ شیر خدا وشیر مردان
دونویں حضرت نبیؐ کے نور عینین
معلے منزلت حضرات حسنینؓ
دو عم اشرف و اکرام الناس
مقدس سیرتاں حمزہ تے عباس
سبھی ارواح پاکاں پر ہزاراں
ہووے رضوان رحمت دی بہاراں

نبی اکرم ﷺ سے بے پناہ محبت کا اظہار

مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پناہ محبت پائی جاتی تھی۔ اس کا اظہار وہ فارسی اور پنجابی اشعار میں بھی کرتے تھے اور تقریر وخطابت میں بھی۔ نبی ﷺ کی زیارت کا شرف انھیں خواب میں بھی حاصل ہوا اور ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اپنے گاؤں (یا علاقے) میں، وہ جو تبلیغ دین کر رہے ہیں، اس کا انھیں نبی ﷺ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے، یعنی وہ اس نواح میں تبلیغ دین کے لیے بارگاہِ نبوت سے باقاعدہ مامور تھے۔ ان کے جسم کے روئیں روئیں میں محبتِ رسول (ﷺ) سرایت کر چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دیارِ پیغمبر (ﷺ) سے بھی انھیں انتہائی پیار تھا۔ اس کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل فارسی نظم سے ہوتا ہے۔

گویم بتو اے صبا پیامے
در وادیٔ عشق چند گامے
از ملک عجم مگر برآئی
درناحیۂ عرب در آئی

بادیدۂ زار ودل فگارے
در شہر مدینہ کن گزارے
بیں روضۂ پاک سروردیں
آں مضجع خاتم النبیین
برد یمنی بہ تن کشیدہ
درقبہ شریف آرمیدہ
گوئی پس صد ہزار صلوات
برکات وتراحم وتحیات
کای سید وسرورِ دو عالم
اے شافع حشر و فخرِ آدم
بے تو بہ لبم رسیدہ جانے
واز سوزِ من است داستانے
دل بردی ودل دہی نہ کردی
غم دادی وباز غم نخوردی
از یاد کمال باجمالت
داریم نیاز بے ملالت
از حد شدہ دردِ انتظارم
برراہِ تو دیدہ اشک بارم

ذیل میں اس نظم کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

''اے پورب کی ہوا! ایک پیغام تیرے حوالہ کر رہا ہوں، میرے عشق کے علاج کے لیے چند قدم کی زحمت کرنا۔

ملک عجم سے جب تو باہر نکلے، (اور) اطرافِ عرب میں داخل ہو جائے

تو روتی آنکھ اور خستہ دل کے ساتھ، شہر مدینہ میں پڑاؤ ڈالنا۔

سرورِ دین (ﷺ) کے روضۂ پاک کو دیکھنا، جو خاتم انبیاء (ﷺ) کی خواب گاہ ہے۔

وہ یمن کی دھاری دار چادر اوڑھے، مبارک قبے میں آرام فرما ہیں۔

ان پر لاکھوں درود وسلام، برکات، رحمتوں اور سلامتی کی دعاؤں کے بعد کہنا۔

کہ اے آقا! دو جہان کے سردار، اے حشر میں شفاعت کرنے والے فخر انسانیت!

آپ کے بغیر جان، لبوں پر آچکی ہے، اور میرے عشق کی تڑپ ایک داستان بن گئی ہے۔

آپ (ﷺ) نے دل لے لیا اور دل دیا نہیں، غم دیا اور غم خوری نہیں کی۔

آپ کے جمال بھرے کمال کی یاد میں، آپ کی رنجیدگی کے بغیر میں عاجزی رکھتا ہوں۔

میرے انتظار کی تکلیف حد کو پھلانگ چکی، آپ کی راہ پر میری آنکھ آنسو برسا رہی ہے۔

اب اسی سلسلے کی مولانا ممدوح کی ایک اور فارسی نظم پڑھیے۔ اس میں بھی وہ نبی ﷺ کی زیارت کے لیے بے تاب ہیں۔ سات اشعار پر مشتمل نہایت عمدہ نظم ہے۔''

اے خوشا روئی، دلآ سامی رسول عربی
اے عجب قامت رعنائی رسول عربی
بخت یا ورشدہ ویافت سعادتِ عظمیٰ
ہر کہ شد والہ وشیدائے رسول عربی
ورچہ سودا وچہ سود یست کہ سازیم فدا
نقد جان در سودائے رسول عربی
نہ بشہر ونہ بصحراست قرارِ دلِ من
کاش بینم رخِ زیبائے رسول عربی
طائرِ جانِ من از شوقِ بنی بال کشائے
تادر روضۂ والائے رسول عربی
از بس بردیمانی مگر افتد بدلم
پر توِ حسن زسیمائے رسول عربی
للہ الحمد کہ پُر درد غلام بے دل
یافت از لطف مداوائے رسول عربی

اب ان اشعار کا اردو ترجمہ پڑھیے۔

''اے پیارے مکھڑے والے، دل کو چین دینے والے عربی پیغمبر (ﷺ) اور اے شوخی بھرے عجیب سراپا والے عربی پیغمبر (ﷺ)۔

مقدر جاگ گیا اور سب سے بڑی سرفرازی پائی (اس شخص نے) جو پیغمبر عربی (ﷺ) پر فریفتہ وشیدا ہوا۔

کیا محبت کا معاملہ اور کیا منفعت ہے کہ ہم اپنی نقد جان قربان کریں پیغمبر عربی (ﷺ) پر دیوانگی کے ساتھ۔

نہ شہر میں قرار ہے، نہ جنگل اور ویرانے میں اطمینان، کاش میں پیغمبر عربی (ﷺ) کے منور چہرے کو دیکھ پاتا

میری روح کا پرندہ نبی (ﷺ) کی محبت میں بازو پھیلائے ہوئے ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عربی کے بلند و بالا روضے تک پہنچنے کے لیے۔

دھاری دار ردائے مبارک کے پیچھے سے، شاید میرے دل پر، پیغمبر عربی ﷺ کی پیشانی کے حسن کا عکس نظر آ جائے۔

اللہ کی بے حد تعریف ہے کہ غلام (ایسے) درد سے بھرے اُداس شخص نے اللہ کی مہربانی سے پیغمبر عربی (ﷺ) کا مداوا حاصل کر لیا۔"

ان دو فارسی نظموں کے بعد اسی موضوع کی پنجابی نظموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چلیں اس دیس نوں دے سار بانا!
جتھے کیتا حبیب اللہ ٹکانا
چلا اُشتر ہو واں قربان تیری
تیرے راہاں توں گھولی جان میری
ہوئی مدت جو رووں نین میرے
کلیجے چھیک پاون وین میرے
رسول اللہ دے کر کر یاد آثار
النبے مار بھڑکے شوق دیدار

مدینے میں پوچھا اک وار مینوں
حیاتی میں ملا دلدار مینوں
غبار اس راہ دا سرمہ بنا واں
ہوواں صدقے اگر اک جھات پاواں
جے پر ہوون تاں ماراں اوڈاری
ویکھاں روضہ جے طالع کرن یاری

ایک اور پنجابی نظم پڑھیے۔

صبا روضے رسول اللہ دے جائیں
میرے احوال رو رو کے سنائیں
کہیں بعد از ہزاراں بار صلوات
کروڑیں بار تسلیم و تحیات
جو اے محبوب ربانی نگاہ کر
وچھوڑے سے ہے جاں آئی لباں پر
النبے عشق سے جل بل گیا جی
کہو اس در و دا دا رو کراں کی
خدا جانے جدوں دی جائیاں میں
میرے بابل تیرے لڑلائیاں میں
میرا دل چور کیتا درد تے غم
ترحم یا نبی اللہ ﷺ ترحم

دیہو جلوہ اٹھا بر دِ یمانی
نہیں تے ہو چکی ہے زندگانی
تعلق شہر سے ایک بار چھوڑوں
مدینے کی طرف دیوانہ دوڑوں
جوتا محبوب دے آثار ویکھاں
وہ روضۂ مطلع انوار ویکھاں
کراں دن رات نوں دل سے دعائیں
خدا و ندا حبیب اپنا ملائیں
حیاتی ہو گئی بر باد میری
کرو مقبول ایہ فریاد میری
گناہاں نال میں نامہ سیاہ ہوں
بسا تقصیر مندو پُر گناہ ہوں
تغافل نال گزری عمر ساری
گیاں سیاں کھڑی رہیاں بیچاری
نہ میں جاگ چرخے تند پائی
تمامی رات سونے میں گوائی
گیاں سیاں کویلے سار ہوئی
کیے جا تک نہیں مل دی ہے ڈھوئی
کیا کرساں جو بھلکے کات منکسن

اجل دی جنج بوہے آن ڈھوسن
جدوں ڈولی کہاراں آن چائی
اکیلے چھوڑ جا سن بھین بھائی
بیگانیاں نال ہے پر دیس جا ناں
نہیں پھر نت نت اس دیس آناں
غلام ایہہ پُر گناہ بے سازو ساماں
پھڑاں محکم رسول اللہ دا داماں

مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ سوموار کے دن 5۔ شوال 1288ھ (17۔ دسمبر 1871ء) کو اپنے گھر سے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے مولانا عبدالقادر اور چھوٹے مولانا عبدالعزیز۔ انھوں نے ان کے لیے فارسی میں حسب ذیل وصیت لکھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الذی لا نبی بعدہ وعلیٰ آلہ و صحبہ وسائر من بذل فی مرضیات اللہ جهده۔

امابعد: امروز دو شنبہ 5۔ شوال 1288 ہجری مقدسہ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ فقیر عبداللہ المعروف بغلام رسول بن جناب فضیلت دستگاہ رحیم بخش بن حافظ نظام الدین خادم بن حافظ فاضل کامل بہاؤ الدین بن جامع کمالات حافظ محمد اکرم بن حافظ فاضل عصمت اللہ بن مصدر کمالات زبدۂ اہل اللہ کامل التحریر جناب عبداللہ بن سکندر بن نور محمد بن پیر محمد بحض فضل الٰہی عازم زیارت حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً گردید۔

لہذا بہ فرزندی عبدالقادر کہ امروز نہ (9) سالہ است و بعد تلاوت قرآن شریف و تحصیل صرف تا زرادی، بوستان و گلستان می خواند۔ و نور چشمی محمد عبدالعزیز کہ سہ (3) و نیم سالہ است وصیت می کنم کہ از ہمہ امور علم دینی از تفسیر و حدیث وفقہ وسیر و تصوف مقدم دارند و ملاک الامر و اساس الایمان یقین کنند و بہمگی ہمت بہ او متوجہ شوند خصوصاً صحبت محدثین لازم شمارند کہ اہل حدیث اہل اللہ و بعد فراغ از علم دینیہ دست بیعت شیخ کامل مکمل دہند۔ و دریں زمان مثل عبداللہ غزنوی در قیاس ما احدے نیست۔ صحبتش اکسیر است و بہ حقیقت آنحضرت کامل مکمل پیراست، و عبدالقادر ترجمہ قرآن از یشاں شروع کنند و بسم اللہ عبدالعزیز از یشاں شروع کند، کہ در عقیدۂ فقیر مثل جنید و نظیر حضرت بایزید است۔ لا یدرک الواصف المطری خصائصہ وان یک سابقاً فی کل ماوصفا۔ ہمیں بس گرچہ بس کاسد قماشم، کہ در سلکِ خریدار انش باشم دمے باید کہ بملحدین وزنا دقہ و کسے کہ سرمو مخالف شریعت محمدیہ ﷺ باشد مجلس نکنند و با ولیاء اللہ و کمال صوفیہ حسن عقیدہ ثابت نمائند۔ امام شعرانی فرمودہ ایاک ولحوم الاولیاء فانہا مسمومۃ و شطحیات آں حضرات مہما امکن برمحمل نیک فرود آرند۔ و اوقات خودرا اولاً بہ ادائے صلوٰۃ دراوقات مستحبہ واقامت ارکان و واجبات و سنن و مستحبات بتقید جماعت و خشوع تمام معمور کنند، و ایمان خود را راست کنند، وثانیاً بہ تلاوت قرآن و درود شریف واذکار نور علیٰ نور نمایند و بس

گر بما	ندیم	زندہ	بر	دو	زیم
دامنے	کز	فراق	چاک	شد	ہ
ور بمردیم		عذر		ما	بپذیر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس وصیت کا اردو ترجمہ یہ ہے:

”سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو ایک ہے اور درود وسلام اس کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جن کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور آپ کے آل اور اصحاب پر اور ان پر جنھوں نے فقط اللہ کی رضا کے لیے جدوجہد کی۔“

امابعد

آج سوموار کا دن 5۔ شوال 1288 ہجری کا مقدس سال ہے۔ (مکہ سے مدینہ کو ہجرت کرنے والے (اللہ کے نبی) پر درود وسلام ہو۔ یہ فقیر عبداللہ جو غلام رسول کے نام سے معروف ہے (اس کا سلسلۂ نسب یہ ہے) غلام رسول بن صاحب فضیلت رحیم بخش بن حافظ نظام الدین خادم بن فاضلِ کامل حافظ بہاء الدین بن جامع کمالات حافظ محمد اکرم بن حافظ فاضل عصمت اللہ بن منبع کمالات، زبدۂ اہل اللہ، کامل و ماہر جناب عبداللہ بن سکندر بن نور محمد بن پیر محمد، محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے حرمین شریفین (اللہ تعالیٰ ان کے شرف میں مزید اضافہ فرمائے) کی زیارت کے لے عازم سفر ہوا ہے، اس لیے اپنے فرزند عبدالقادر کو جس کی عمر نو سال ہے اور وہ قرآن شریف پڑھنے اور علم صرف کی کتاب زرادی تک پڑھنے کے بعد گلستان اور بوستان پڑھ رہا ہے، اور اپنی آنکھوں کے نور محمد عبدالعزیز کو جو ساڑھے تین سال کا ہوا ہے، وصیت کرتا ہوں کہ تمام کاموں پر علم دینی (یعنی) تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تصوف کو اولین اہمیت دیں، اور ہمت کرکے اس کی طرف متوجہ ہوں، بالخصوص محدثین کی ہم نشینی اختیار کریں (یادرکھیں) کہ اہل حدیث ہی اہل اللہ ہیں، علومِ دینی سے فراغت کے

بعد کسی کامل و مکمل کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ ہمارے علم کے مطابق اس عہد میں (حضرت) عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ جیسا کوئی نہیں۔ ان کی صحبت کیمیا ہے اور وہ کامل و مکمل پیر ہیں۔ عبدالقادر ترجمہ قرآن انہی سے شروع کرے اور عبدالعزیز انہی سے بسم اللہ کا آغاز کرے۔ کیوں کہ میرے عقیدے کی رو سے وہ (حضرت) جنید کے مثل اور حضرت بایزید کی مانند ہیں رحمۃ اللہ علیہم۔

(یاد رکھیے!)

کوئی مدح کرنے والا ان کے خصائص کا احاطہ نہیں کرسکتا، اگرچہ مدح کرنے میں وہ سب پر سبقت لے گیا ہو۔ بس اتنی بات ہی کافی ہے۔ اگرچہ میں کھوٹا سا مال ہوں، لیکن ان کے خریداروں کی قطار میں کھڑا ہوں۔ چاہیے کہ ملحدوں، زندیقوں اور ان لوگوں کی مجلس میں نہ بیٹھیں جو شریعت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بال بھر بھی مخالف ہوں۔ اولیا اور کامل صوفیا کی بارے میں حسنِ عقیدت رکھیں۔

امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

ایاك ولحوم الا ولیاء فانها مسمومة.

''اپنے آپ کو اولیا اللہ کی گوشت خوری سے بچاؤ۔ یہ زہریلے گوشت ہیں۔ یعنی ان کی غیبت نہ کرو۔ جہاں تک ممکن ہو، ان کے ساتھ نیک گمان رکھو۔''

اپنے (دن رات کے) اوقات دو کاموں میں صرف کریں۔

اول: مستحب اوقات میں نماز کی ادائیگی، ارکانِ نماز کی درستی، واجبات وسنن و مستحبات کی صحت، جماعت کی پابندی اور پورے خشوع کے ساتھ ادائے نماز کا التزام اور ایمان کو صحیح رکھنے کا اہتمام۔

دوم: قرآن مجید کی تلاوت کرنا، درود شریف پڑھتے رہنا اور اللہ کے ذکر میں مصروفیت۔ بس یہ کام نور علیٰ نور ہے۔

گر بما ندیم زندہ بر دو زیم
دامنے کز فراق چاک شدہ
ور بمر دیم عذرِ ما بپذیر
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

''یعنی اگر ہم زندہ رہے تو اس دامن کو جو فراق سے چاک ہو گیا ہے، سی لیں گے، اگر مر گئے تو ہمارا عذر قبول کر لینا، کیوں کہ بہت سی ایسی آرزوئیں ہیں جو خاک ہو گئیں (یعنی پوری نہ ہوئیں)۔''

حج بیت اللہ

ہر مسلمان کے دل میں حج بیت اللہ کا شوق موج زن رہتا ہے۔ مولانا غلام رسول صاحب بھی اس کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ بیت اللہ کی زیارت، اس کا طواف، مسجد نبوی کے دیدار اور روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کی تڑپ۔ مکہ مکرمہ کے مقاماتِ مقدسہ میں مناسکِ حج ادا کرنے کا جذبۂ صادقہ۔ مدینہ منورہ کے مختلف مقامات کو دیکھنے کا بے پناہ اشتیاق۔ ہر مسلمان کے دل کی آواز اور روح کی صدا ہے۔

پانچ شوال 1288ھ کو مولانا غلام رسول حج بیت اللہ کے لیے گھر سے روانہ ہوئے۔

یہ مندرجہ ذیل چھ عازمینِ حج کا قافلہ تھا۔

① خود مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ۔

② مولوی محمد عثمان: یہ مولانا غلام رسول قلعوی کے داماد تھے۔ (ساکن فتح گڑھ چوڑیاں ضلع گورداس پور)

③ حکیم غلام محمد: یہ مولانا کے برادرِ کبیر تھے۔

④ مولانا کی بڑی بیٹی۔ اہلیہ مولوی محمد عثمان۔

⑤ محمد قاسم: یہ مولانا کے شاگرد تھے جو قلعہ اسلام میں ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔

⑥ چودھری حاکم: یہ مولانا کے مرید تھے۔ (ساکن لدھے والا وڑائچ ضلع گوجراں والا)

دونوں بھائی (حکیم غلام محمد اور مولانا غلام رسول) ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ دونوں کے لیے آپس کی جدائی بہت مشکل تھی۔ حکیم صاحب اس قافلۂ خیر کو الوداع کہنے کے لیے ان کے ساتھ لاہور آئے تو مولانا نے ان سے کہا کہ اب آپ واپس گاؤں چلے جایے۔ انھوں نے فرمایا آپ کو چھوڑ کر میرا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اس طرح وہ ان کے ساتھ ہی حج کو روانہ ہو گئے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ یہ فقرا کا قافلہ تھا۔ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی محبت کے سوا ان کے پاس کوئی مادی شے نہ تھی۔ تقویٰ ہی ان کا زادِ راہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو بہترین زادراہ قرار دیا ہے۔ فان خیر الزادالتقوٰی۔(البقرہ: 197) (عازمین حج کے لیے بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔) چنانچہ یہ لوگ یہی زادِ راہ لے کر گھر سے روانہ ہوئے تھے اور تمام سفر حج میں یہی زادِ راہ ان کے پاس رہا۔

حکیم غلام محمد فرماتے ہیں: ہم نہیں جانتے کہ ہمیں خرچ کہاں سے ملتا گیا اور کون ہمیں دیتا تھا۔ گھر سے مدینہ منورہ تک اور پھر مدینہ شریف سے گھر واپسی تک ہم نے اپنی روٹی پکا کر نہیں کھائی۔ ہر جگہ دعوتیں ہوتی رہیں۔ مکہ شریف میں بھی ایسا ہی حال رہا۔ معلموں کو ہم جو کچھ دیتے تھے، وہ بھی زبردستی دیتے تھے، ورنہ وہ بھی لینے سے انکار کرتے تھے۔[1]

---

① سوانح حیات مولانا غلام رسول ص 162.

مکہ شریف میں مولانا غلام رسول کے اردگرد اسی طرح لوگوں کا ہجوم رہتا تھا، جس طرح پنجاب میں رہتا تھا۔ ہر وقت لوگوں کی طرف سے وعظ کی درخواستیں آتیں۔ انھوں نے حرم شریف میں عربی زبان میں وعظ فرمائے۔ اس سے لوگ اسی طرح متاثر ہوتے، جس طرح پنجاب کے لوگ ان کا پنجابی وعظ سن کر متاثر ہوتے تھے، بلکہ عرب لوگ ان کا وعظ سن کر یہاں تک کہتے کہ ہمیں ان کے وعظ میں قرآن مجید سن کر ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن اب نازل ہو رہا ہے۔ غالباً انھیں بعض پنجابی حاجیوں سے پتا چل گیا تھا کہ پنجاب کے رہنے والے مولانا غلام رسول پنجابی زبان کے بہت بڑے واعظ اور قرآن وحدیث کے ماہر خطیب ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بہت نیک اور متقی بزرگ ہیں۔ اسی بنا پر لوگ کثیر تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، ان کی زیارت کرتے اور ان سے مسائل پوچھتے۔

جتنے دن چھ ارکان کا یہ قافلہ یا یہ اصحاب ستہ مکہ شریف اور مدینہ طیبہ میں رہے، عرب لوگ ان کی برابر دعوت کرتے رہے۔

کسی جگہ بھی انھوں نے کسی سے کوئی سوال نہیں کیا اور اشارتاً یا کنایتاً کسی پر اپنی حالت ظاہر نہیں ہونے دی، لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہر جگہ ان کی مدد ہوتی رہی۔ مولانا موصوف کا زیادہ وقت وعظ وتبلیغ یا ذکر الٰہی میں گزرتا تھا۔

حکیم غلام محمد کے حوالے سے مولانا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ پورے سفر حج میں کسی وقت کہیں بھی مولانا نے اپنے کسی ساتھی کو خدمت کا موقع نہیں دیا، حتیٰ کہ کسی سے پانی پینے کو بھی نہیں مانگا۔ اصرار اور کوشش کے باوجود کسی سے اپنا کوئی ذاتی کام نہیں

کرایا۔ اس کے برعکس خود اپنے ساتھیوں کی خدمت کرتے رہے۔[1]

جہاز میں چودھری حاکم (لدھے والا وڑائچ) بیمار ہو گئے۔ دس دن بیمار رہے۔ مولانا نے ان کی بڑی خدمت کی۔ اگر ساتھیوں میں سے کوئی انھیں دوا دینے یا پانی پلانے کے لیے اٹھتا تو مولانا فرماتے تم تکلیف نہ کرو۔ اس شخص کی خدمت کرنا میرا فرض ہے، تمھارا نہیں۔ مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے، وہ خدمت کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنے دادا حافظ نظام الدین خادم کی بیماری کے دنوں میں خدمت کی اور انھوں نے میرے لیے دعا کی جو اللہ نے قبول فرمائی اور میں لوگوں کو وعظ وتبلیغ کرنے کے قابل ہوا۔ پھر اپنے بڑے بھائی حکیم غلام محمد سے مخاطب ہو کر کہا کہ میری مثال وہ ہے جو شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے کسی مقبولِ درگاہِ خداوندی کے قصے میں اس کی زبان سے بیان کی ہے۔

گلِ خوشبوئے در حمام روزے
رسید از دست محبوبے بہ دستم
بہ دو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بہ گفتا من گلِ ناچیز بودم
ولیکن مدتے با گل نشستم
کمال ہم نشیں درمن اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یعنی ایک روز حمام میں خوشبو دار مٹی، محبوب کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں پہنچی۔

[1] سوانح حیات مولانا غلام رسول ص 163۔

میں نے اس سے کہا کہ تیری دلآویز خوشبو سے میں مست ہوگیا ہوں، تو بتا کہ تو مشکی ہے یا عنبری؟

اس نے جواب دیا میں تو ناچیز مٹی ہوں، لیکن ایک عرصے تک مجھے پھول کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، اس لیے ہم نشین کی خوبیوں نے مجھ پر اثر کیا، ورنہ میں تو وہی مٹی ہوں جو کہ ہوں۔

شیخ سعدی کے یہ اشعار پڑھ کر مولانا نے فرمایا کہ میرے دادا حافظ نظام الدین خادمؔ نے میرے ذہن میں وہ اثر کیا، جس کی حلاوت مَیں اب تک محسوس کر رہا ہوں۔ حافظ صاحب بھی انسان تھے، یہ چودھری حاکم بھی انسان ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ جس طرح حافظ صاحب نے میرے لیے دعا کی تھی، یہ شخص بھی دعا کرے۔

دس دن کی بیماری کے بعد چودھری حاکم وفات پا گئے۔ وفات کے وقت انھوں نے اپنا تمام مال واسباب مولانا کے حوالے کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسے جہاں چاہیں خرچ کریں۔ لیکن انھوں نے سارا مال واسباب واپس آ کر چودھری صاحب موصوف کے وارثوں کو دے دیا تھا۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اشعارِ محبت

حج بیت اللہ کے لیے مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ نہایت بے تاب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور وہ ایک مختصر قافلے کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوگئے۔ یہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل 1288ھ (1871ء) کی بات ہے۔ اس وقت حج کرنا بہت مشکل تھا۔ پیسے کی بھی کمی تھی اور سفر بھی تکلیف دہ تھا۔ جدہ سے لے کر مکہ مکرمہ تک کچا راستہ اور اونٹوں کا سفر۔ یہی حالت مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک کے سفر کی تھی۔ جگہ جگہ بدو بیٹھے تھے جو حجاج کے قافلوں کو لوٹ لیتے تھے۔ لیکن ادائیگی فرض کا ایک جذبہ اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کا بے پناہ شوق تھا جو دور دراز کے لوگوں کو وہاں جانے پر مجبور کرتا تھا۔ مولانا غلام رسول کو اللہ تعالیٰ نے زہد و عبادت، اطاعتِ الٰہی اور محبت پیغمبر ﷺ کے جن اوصاف سے نوازا تھا، اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں تفصیل سے آچکا ہے۔ مولانا اپنے رفقائے سفر کے ساتھ جدہ سے مکہ مکرمہ گئے۔ وہاں انھوں نے بیت اللہ شریف کی زیارت کر کے فارسی کے مندرجہ ذیل اشعار کہے۔ یہ 1288ھ کے آخر کی بات ہے۔ قارئین کرام کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ فارسی اور پنجابی کے مشہور شاعر تھے۔

زِ راہ دور بہ بیت الحرام می آیم
بصد نیاز بصد احترام می آیم

گزشت عمرِ جوانی بہ حظِ نفسانی
سفید ریش بباب السلام می آیم

برائے عفوِ جرائم بہ توبہ مستغفر
بصد ندامت تااِیں مقام می آیم

کرم نما وگزرکن کہ ناسزا کردم
طفیل حضرت خیرالانام می آیم

بحضرت تو باستار کعبہ دست زدہ
باستغاثہ وطلبِ مرام می آیم

زلالِ رحمتِ خوردہ کہ تا شوم سیراب
بسا کہ تشنہ لب وتلخ کام می آیم

وقوفِ موقفِ عرفات رانیم لائق
چوں خواندۂ تو برحمت بکام می آیم

گریختم ز جرائم بسعی در میلین
پس از طواف بسوئے مقام می آیم

برائے رمی شیاطین رسیدہ برجمرہ
پے طواف بمسجد حرام می آیم

نمودہ حلق زِا خلاق بد بفضلِ خدا

بطلب رحمت رحمان مدام می آیم
مگر کہ کبش مُنیٰ درِ مِنیٰ شود قرباں
امید وار عنایت غلام می آیم

اب ان اشعار کا اردو ترجمہ پڑھیے۔

"لمبی راہ طے کر کے بیت الحرام میں آرہا ہوں، سیکڑوں عجز اور سیکڑوں احترام کے ساتھ آرہا ہوں۔

جوانی کی عمر، خواہشات نفسانی میں گزری، سفید ڈاڑھی لیے باب السلام پر آرہا ہوں۔

گناہوں کی معافی کے لیے توبہ و استغفار کر رہا ہوں، سیکڑوں شرمندگیوں کے ساتھ اس مقام پر آرہا ہوں۔

بخشش فرما اور معاف کر دے جو میں نے غیر مناسب کام کیے، مخلوق میں سب سے بہتر ذات کے طفیل آرہا ہوں۔

تیری بارگاہ میں کعبہ کے پردے کو ہاتھ میں تھامے، فریاد طلبی اور حصولِ مقصد کے لیے آیا ہوں۔

اپنی رحمت کا شیریں پانی پلا کہ آسودہ ہو جاؤں، بہت زیادہ پیاسے ہونٹ اور بے مزہ حلق کے ساتھ آیا ہوں۔

عرفات کے میدان میں ٹھہرنے کے لائق نہیں ہوں، (لیکن) جب تو نے بلالیا ہے تو حصولِ رحمت کو مقصد بنا کر آیا ہوں۔

دونوں پہاڑیوں (صفا، مروہ) کی دوڑ لگا کر گناہوں سے بھاگتا ہوں، کعبے کے

چکر لگا کر مقام (ابراہیم) کی طرف آیا ہوں۔

شیطانوں کو کنکریاں مارنے کے لیے جمرے پر پہنچا ہوں، کعبے کے چکر لگانے کو مسجد حرام میں آیا ہوں۔

اللہ کے فضل سے بری عادات سے سر منڈ والیا، اللہ کی رحمت کی طلب میں آیا ہوں۔

شاید کہ خواہشات کا مینڈھا منیٰ میں قربان ہو جائے، تیری توجہ کی امید رکھ کر میں غلام آیا ہوں۔"

1289ھ میں وہ مدینہ منورہ پہنچے۔ وہاں انھوں نے مندرجہ ذیل شعر کہے۔

شکر خدا چہ وقت سعید است و بختیار
غنچہ مرادِ قلب شگفت از دمِ بہار
دیدم بچشمِ عشق مدینہ منورہ
ایں دم سزد کہ گوہرِ جاں را کنم نثار
یعنی شبِ وصال رسید است در حیات
شب قدر ہا فدائے بیک ساعتش ہزار
ذوقش بجز حلاوتِ ایماں کجا چشید
کذاب مدعی کہ ازیں فیض بر کنار
حقا چہ دولتیست کہ شد دست یاب من
وردِ زبان کنم چوں عنادل ہزار با
استادہ باآداب حضورِ محمدی (ﷺ)

صلوات زاکیات وتحیاتِ بے شمار

یارب صل علی الذی اخترته واجتبیته
وعلی تمام آله وعلیٰ صحبته الکبار

وهو النبی شفیعنا خیر البشر ختم الرسل
هو رحمة للعالمین کالشمس فی وسط النهار

اے سرورِ دوعالم وسلطان مرسلین
بس مجرمم شفاعت خود کن رفیق ویار

از جان ودل غلامِ رسولم مراچه غم
یک نیمۂ نگاه ترا ام امیدوار

ان شعروں کا اردو ترجمہ یہ ہے:

’’خدا کا شکر کیا مبارک اور خوش قسمت وقت ہے، دلی مراد کی کلی، بہار کی وجہ سے کھل اٹھی ہے۔

میں نے محبت کی آنکھ سے مدینہ منورہ کا نظارہ کیا، اس وقت مناسب ہے کہ جان کے موتی کو نچھاور کر دوں۔

یعنی ملاقات کی رات، زندگی میں میسر آ گئی، اس کی ایک گھڑی پر ہزاروں شب قدر قربان ہوں۔

اس کی چاشنی، ایمان کی مٹھاس کے بغیر وہ کہاں چکھ پائے گا، جو جھوٹا، (فقط) دعوے کرنے والا اس کے فیض سے دور ہو۔

یقیناً وہ کیا دولت ہے، جو مجھے ملی ہے، زبان پر یہ وظیفہ بلبل کے مانند ہزار

بار کروں۔

تمام تر آداب کے ساتھ بارگاہِ محمدی (ﷺ) میں کھڑا ہوں، آپ پر ان گنت صلوات اور تحیات کا نذرانہ لے کر۔

پروردگار! پاکیزہ صلوٰۃ نازل فرما اس ذات پر جو تیرا برگزیدہ و چنیدہ ہے، اور آپ کی کل آل پر اور آپ کے صحابہ کرام پر۔

وہی نبی (ﷺ) ہمارے لیے شفاعت کرنے والے ہیں، جو تمام انسانوں میں افضل اور پیغمبروں کے خاتم ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ وہی سارے جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ وہ ایسے سورج ہیں، جن کی روشنی تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے ﷺ۔

اے دونوں جہانوں کے سردار اور پیغمبروں کے سلطان! ﷺ میں بے حد گناہ گار ہوں، اپنی شفاعت کو میرا دوست و مددگار بنا۔

میں (تو وقت پیدائش ہی سے) جان ودل سے، رسول (ﷺ) کا غلام ہوں، مجھے فکر کیا ہے۔ میں آپ کی رحمت کی ایک آدھی نظر کی آس لگائے ہوئے ہوں۔

مدینہ طیبہ کے متعلق مولانا کی مندرجہ ذیل پنجابی نظم بھی پڑھیے۔

بحمد اللہ ہو یا فضلِ الٰہی

فراغت حجِ بیت اللہ سے پائی

مدینہ کی طرف ہوئی تیاری

کیتی حجاج اونٹوں پر سواری

پہلے دن قافلہ ہو جمع سارا
کیتو نے فاطمہ وادی اتارا
مدینہ طیبہ دی وا جو آئی
کلیجے عاشقاں دے ٹھنڈ پائی
خدا دے فضل کیتی مہربانی
چلے منزل بمنزل کاروانی
ہو یا دن بارھویں فضلِ الٰہی
خدا نے آس عاشق دی پہنچائی
وہ روضہ دور سے نظریں جو آیا
خدا اوہ نور دا جلوہ وکھایا
ادب سے قافلے ہوئے پیادے
محبت غیر تے دل صاف سادے
مبارک شہر تھیں واؤں جو چلیاں
کھلے دل مانند کلیاں
صلوٰتاں وانگ بلبل دے پکاراں
دلوں محبوب دا حلیہ چتا راں
کیتی اج طالع بیدار یاری
اجو کی اس گھڑی پر جان واری
عجب وہ مسجد نبوی منورا

عجب روضہ رسول اللہ دا انور
نہ جھلن اکھیاں وہ ویکھ انوار
ہوون صدقے رسول اللہ دے دربار
کہیا ہن جی نے کیا سامان کریے
پکارے عشق جان قربان کریے
مبارک روضہ مسجد دے کنارے
وہ سورج وانگ دوروں لاٹ مارے
دکھن وَل جد امام اس جا کھلووے
مبارک روضہ کھبی طرف ہووے
حضور اندر کھڑے ہوئے جو سارے
صلوٰتاں تے سلام اک اک پکارے
رسول اللہ دے لے لے نام صلوات
دیوے لذت کیا اس دی کراں بات
سعادت سرمدی حاصل جو ہوئی
سوا ایمان دے جانے نہ کوئی
اگر اس ذوق دی تقریر کریے
سوا جنت دے کیا تدبیر کریے
وہ جنت قبر و منبر دا میانہ
وہ منبر حوض کوثر دا ٹکانا!

کیا محراب پر انوار برسن
ستون اس دے کھڑے ہم وار ہوسن
مدینے وچ ملے درجہ ہزاری
خدایا شکر اس پر لاکھ واری
کہیا حضرت جو اس پر لاکھ صلوٰات
نماز اس کعبہ دی ہے لاکھ درجات
خدا وندا لیا پھر وہ زمانہ
مدینے وچ ہووے میرا ٹکانہ
ہوواں قربان نبی دا کر کے دیدار
کہاں ہر دم درود اس پاک دربار
رسول اللہ سنے پھر بے وسیلہ
ملے اس پر کیا نعمت جلیلہ
کرن جے طالع بیدار یاری
دعا میری ہووے مقبول باری
غلاؔم ایہ عین میرا مدعا ہے
شکستہ شیشہ دل کا صدا ہے

تیسواں باب

وفات

گزشتہ صفحات میں مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ کے بے شمار واقعات ہمارے علم میں آئے۔ ان کے آباو اجداد، ان کا دورِ طفولیت، زمانۂ طالب علمی، صالحین کی تلاش اور ان کی صحبت، اندازِ وعظ و خطابت، مختلف مقامات کے سفر، قبولیت دعا اور ظہور کرامات، سخاوت وجودت، عام لوگوں اور رشتہ داروں سے تعلقات کی نوعیت، 1857ء کی جنگِ آزادی کے زمانے میں گرفتاری، انگریزی حکومت کی طرف سے وعظ و تذکیر کی ممانعت، حکومت کی اجازت کے بغیر کہیں آنے جانے پر پابندی، شعر و شاعری، مہمان نوازی، غربت و تنگ دستی وغیرہ ان کی کتنی ہی باتوں سے ہم آگاہ ہوئے۔ پھر ان کے اسلوب درس و تدریس، ان کے تلامذہ اور ان کے معاصرین کا بھی ہمیں پتا چلا۔

انھوں نے رفیع المنزلت اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ اپنے عہد کے برصغیر کی وہ عظیم شخصیت تھے۔ گونا گوں اوصافِ حسنہ کے مالک۔ علم و عمل کے میدان میں انھوں نے ایک سے ایک بڑھ کر کارنامے سرانجام دیے۔ اس عالی ہمت عالم اور مرد صالحیت پیشہ

نے جس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی نشر و اشاعت کا فریضہ ادا کیا، اس کی مثال پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کے زمانے میں نہ ریلیں تھیں نہ موٹریں، نہ سڑکیں تھیں، نہ سفر کی سہولتیں حاصل تھیں۔ وہ جہاں جاتے پیدل جاتے یا گھوڑی پر سفر کرتے اور اللہ کے دین کی فی سبیل اللہ تبلیغ فرماتے۔ ان کی پوری زندگی اسی طرح گزری اور اسی جدوجہد میں انھوں نے وفات پائی۔

وفات کا قابل رشک واقعہ

ان کی وفات کا واقعہ بھی نہایت تعجب انگیز اور قابل رشک ہے۔ ان کی مسجد میں ایک حافظ صاحب رہتے تھے۔ وہ مؤذن بھی تھے اور گاؤں کے بچوں کو قرآن مجید بھی پڑھاتے تھے۔ ایک روز خلافِ معمول مولانا مرحوم ان کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس دن قمری حساب سے مولانا کی عمر کے 63 سال پورے ہونے میں ایک دن باقی تھا۔ حافظ صاحب بے حد متقی اور پابندِ شرع بزرگ تھے۔ مولانا نے ان سے فرمایا کہ حافظ صاحب! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، مجھ پر اللہ کا یہ خاص فضل رہا ہے کہ دانستہ کسی ایسے عمل کا ارتکاب نہیں ہوا جو خلافِ سنت ہو، اور کوئی ایسا عمل اللہ کی مہربانی سے ترک نہیں ہوا جو مطابقِ سنت ہو۔ اب آخری سنت رہ گئی، اللہ تعالیٰ وہ بھی نصیب فرمادے تو زہے قسمت۔ جس وقت انھوں نے یہ بات فرمائی، انھیں کوئی تکلیف نہ تھی۔ بہت اچھی صحت تھی اور وہ ہشاش بشاش تھے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک پورے 63 سال کی ہوئی ہے اور میری عمر کل 63 سال کی ہوجائے گی۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔

اتفاق سے دوسرے روز ساہی وال سے دو مہمان آئے۔ مولانا نے نماز ظہر سے قبل اپنے بڑے بیٹے مولوی عبدالقادر سے فرمایا کہ قطب الدین درویش کو ساتھ لے کر گھر جاؤ اور وہاں سے دانے (گندم) اٹھوا کر خراس پر رکھو تاکہ آٹا پس جائے۔

اس کے بعد ظہر کی اذان ہوئی۔ مولانا نے خود جماعت کرائی۔ نماز کے بعد ساہی وال سے آنے والے دونوں مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر حجرے میں تشریف لے گئے۔ اس وقت بالکل تندرست تھے۔ کسی قسم کی کوئی بیماری یا نقاہت وغیرہ نہ تھی۔ مہمانوں کو تلقین کرنا شروع کی۔ پہلے مولوی فضل الدین صاحب کو کلمے کا ذکر کرایا۔ ایک بار کلمے کی ضرب دی۔ دوسری بار ضرب دے رہے تھے کہ روحِ مبارک جسدِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ صورت حال بالکل اچانک پیش آئی تھی۔ مہمان اسے دیکھ کر گھبرا گئے۔ مولوی فضل الدین جلدی سے باہر آئے اور مولانا کے بھائی حکیم غلام محمد سے کہا کہ مولوی صاحب کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ طبیبِ حاذق تھے۔ انھوں نے دیکھتے ہی فرمایا: ''مولوی صاحب وفات پا گئے ہیں۔''

یہ خبر اسی وقت گاؤں میں پھیل گئی۔ پھر جلد ہی اردگرد کے دیہات میں پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر میں بے شمار لوگ جمع ہو گئے۔ متعدد طبیب بھی آ گئے۔ اطبا نے کہا کہ مولانا کی موت واقع نہیں ہوئی، انھیں سکتہ ہو گیا ہے، رگ لگائی جائے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ لیکن حکیم غلام محمد یہی کہتے رہے کہ مولوی صاحب وفات پا چکے ہیں۔

حکیم غلام محمد نے طبیبوں اور وہاں موجود لوگوں کو بتایا کہ ہمارے خاندان میں یہی معاملہ چلا آ رہا ہے۔ ان کے والد مولوی رحیم بخش بحالتِ تندرستی نماز پڑھتے ہوئے

سجدے میں فوت ہوئے۔ دادا صاحب نظام الدین خادم نے حالتِ رکوع میں وفات پائی۔ یہی معاملہ مولوی صاحب کو پیش آنا تھا جو آ گیا۔

مولانا غلام رسول جمعرات کو ظہر اور عصر کے درمیان فوت ہوئے تھے۔ جمعۃ المبارک کے دن انھیں دفن کیا گیا۔ جنازے میں لا تعداد لوگ شامل تھے...... یہ 1291ھ (1874ء) کا واقعہ ہے۔ یعنی تیرھویں صدی ہجری کے آخری عشرے کا۔ لیکن سید حکیم عبدالحی حسنی نے مولانا غلام رسول کا تذکرہ اپنی عربی کتاب نزہۃ الخواطر کی آٹھویں جلد (یعنی چودھویں صدی، ہجری کے علما و زعما) میں کیا ہے۔ اس کی وجہ فاضل مصنف کے صاحب زادے سید ابوالحسن علی ندوی یہ بیان کرتے ہیں:

وكانت وفات المترجم فى سنة احدى وتسعين ومأتين، فكان محل الترجمة فى الجزء السابع من الكتاب، ولم تبلغ المؤلف سنة وفاته وكان يعتقد ان وفاته تاخرت الى القرن الرابع عشر، فوضعه فى هذا الجزء.[1]

یعنی صاحبِ ترجمہ مولانا غلام رسول کی وفات 1291ھ کو ہوئی، اس لیے ان کے حالات ساتویں جلد میں آنا چاہئیں تھے، لیکن مؤلف کتاب (سید عبدالحی حسنی) کو ان کی صحیح تاریخ وفات کا علم نہیں ہوسکا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ ان کی وفات چودھویں صدی ہجری میں ہوئی ہے، لہٰذا ان کا تذکرہ اس جلد میں کیا۔

اب ملاحظہ فرمایے مولانا غلام رسول کے تذکرے میں حکیم سید عبدالحی حسنی کے عربی الفاظ۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج 8 ص 370.

الشيخ العالم المحدث غلام رسول القلعوى۔ نسبة الیٰ قلعة میهاں سنگھ، من بلاد پنجاب۔ کان من العلماء الرا سخين فی العلم، قرأ علیٰ مولانا نظام الدین البگوی وعلیٰ غیره من العلماء۔ ثم دخل دهلی واخذ الحدیث عن الشیخ المحدث نذیر حسین الحسینی الدهلوی مشار کا للشیخ الا جل عبدالله بن محمد اعظم الغزنوی فی القرأة والسماع، واقبل علی الحدیث اقبالا کلیاً، ورجع الیٰ بلدته وجدفی البحث والا شتغال، ثم فی التدریس والتذکیر.

وکان أیة ظاهرة ونعمة باهرة فی کثرة العمل وقلة الا مل وتاثیر الوعظ، مارائ الناس مثله فی دیاره علما وعملا وجمالًا وخلقاً واتباعاً وکرما وحکما فی حق نفسه وقیامافی حق الله عند انتهاك حرمته۔ ها بته الحکومة الانکلیزیة فمنعته عن التذکیر وعن السفر دون الاذن.

له ر سا لة فی اثبات رفع السبابة عند التشهد فی الصلوٰة ورسالة فی ابطال اربع رکعات فی الجمعة الاخیرة من رمضان المشهور بقضاء العمر کما فی تذکرة النبلاء.[1]

''یعنی شیخ، عالم، محدث غلام رسول قلعوی ''قلعہ اسلام'' کی طرف نسبت ہے جو کہ علاقۂ پنجاب میں واقع ہے۔ وہ پختہ علم علماء میں سے تھے۔ انھوں

[1] نزہۃ الخواطر 8/370.

نے مولانا نظام الدین بگوی اور دیگر علما سے تعلیم حاصل کی [1] پھر دہلی گئے، وہاں شیخ ومحدث نذیر حسین حسنی دہلوی سے علم حدیث پڑھا۔ جلیل القدر شیخ عبداللہ بن محمد اعظم غزنوی حدیث میں ان کے شریکِ درس تھے۔ [2] تعلیم حدیث کے بعد وہ اپنے وطن واپس آئے اور تبلیغ دین میں مشغول ہو گئے۔ پھر تدریس وتذکیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ کثرتِ عمل، خواہشات کے ترک اور تاثیر وعظ میں اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی اور بہت بڑی نعمت تھے۔ علم، عمل، جمال، اخلاق، اتباعِ کتاب وسنت، سخاوت، پابندئ شریعت اور حقوق اللہ کی ادائیگی میں جب کہ اس پر عمل کا سلسلہ ڈھیلا پڑ گیا تھا، ان کے علاقے کے لوگوں نے کوئی ان کا ہم سر نہ دیکھا۔

''انگریزی حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا تھا۔ پھر انھیں وعظ وتذکیر سے روک دیا تھا اور حکومت کی اجازت کے بغیر ان پر کہیں آنے جانے پر پابندی عائد کر دی تھی۔۔۔ ان کا تصنیف شدہ ایک رسالہ (تووہ) ہے جو انھوں نے نماز میں تشہد کے موقعے پر انگشتِ شہادت اٹھانے کے اثبات میں لکھا، اور ایک رسالہ ان چار رکعتوں کے ابطال میں تصنیف کیا جو رمضان المبارک کے آخری جمعے کے روز قضائے عمری کے نام سے پڑھی جاتی ہیں۔''

[1] حضرت مصنف کو سہو ہو گیا ہے۔ ان کا نام مولانا نظام الدین بگوی نہیں، بلکہ مولانا غلام محی الدین بگوی ہے۔ ان کا تذکرہ اس کتاب کے باب نمبر 3 میں کیا گیا ہے۔

[2] یہاں بھی فاضل مصنف سے سہو ہو گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خود سید عبداللہ غزنوی کا نام محمد اعظم تھا جو ان کے والدین نے رکھا تھا۔ بعد میں خود حضرت سید صاحب نے اپنا نام عبداللہ رکھ لیا۔ ان کے والد کا اسم گرامی محمد تھا۔ اس کی تفصیل کتاب کے چھٹے باب میں بیان کی جا چکی ہے جو حضرت سید عبداللہ غزنوی کے حالات پر محیط ہے۔

معلوم ہوتا ہے یہ دونوں رسالے قلمی تھے جو تذکرۃ النبلاء کے مصنف علام محدث شمس الحق ڈیانوی کے علم میں آئے۔ یہ پتا نہ چل سکا کہ یہ رسالے کتنے صفحات پر مشتمل تھے۔ میں نے مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کے پڑپوتوں (حافظ حمید اللہ خطیب وامام جامع مسجد قلعہ اسلام اور ملک عصمت اللہ صاحب) سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ انھیں ان دونوں رسالوں کے بارے کوئی علم نہیں ہے۔

اللہ اللہ! کس قدر پاک باز تھے وہ لوگ کہ مولانا غلام رسول کے والد مکرم مولوی رحیم بخش نے بارِ گاہِ الٰہی میں زمین پر پیشانی رکھ کر حالتِ سجدہ میں اللہ کے حضور میں حاضری دی۔ جدِ امجد حافظ نظام الدین خادمؔ نے اللہ کے دربار میں جھکتے ہوئے رکوع کی حالت میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی، اور بیٹے اور پوتے (مولانا غلام رسول) نے کلمہ طیبہ پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے وفات پائی، اور ان کی یہ دعا قبول اور تمنا پوری ہوئی کہ ٹھیک 63 سال میں یعنی نبی ﷺ کی عمر کو پہنچ کر اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔

اللہ نے ان کو ہمیشہ اپنے سایۂ عاطفت میں رکھا اور جو دعا انھوں نے کی اسے شرف قبول حاصل ہوا۔ ان کی آخری دعا بھی قبول ہوئی اور یہ تمنا بر آئی کہ ٹھیک 63 سال عمر پا کر فوت ہوئے۔ قمری حساب سے ان کی تاریخ وفات 15۔ محرم 1291 ہجری اور عیسوی حساب سے 4۔ مارچ 1874ء تھی۔ اللہ ان کو اور ان کے آباو اجداد کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے اخلاف کو ان کی نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق سے نوازے۔

اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم و ادخلھم جنت الفردوس۔

مولانا حکیم غلام محمد

اب آئندہ صفحات میں مولانا غلام رسول کے بھائیوں اور ان کی اولاد کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جو ان کے پڑپوتے ملک عصمت اللہ کا تحریر کردہ ہے۔ یہ سنتالیس (47) صفحات ہیں جو آخرِ کتاب تک چلتے ہیں۔

مولانا غلام رسولؒ کے بڑے بھائی غلام محمد تھے اور چھوٹے شیر محمد۔ راجا رنجیت سنگھ کی فوج کے جرنیل میہاں سنگھ نے اپنے نام سے گاؤں کی بنیاد رکھی۔ وہ مولانا غلام رسول کے والد مولانا رحیم بخش کا شاگرد تھا اور اسے اپنے استاد سے بے حد عقیدت تھی۔ اس نے مولانا رحیم بخش سے اپنے گاؤں میں سکونت اختیار کرنے کی درخواست کی۔ مولانا رحیم بخش خود تو نہ گئے مگر اپنے بڑے بیٹے حکیم غلام محمد کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ حکیم صاحب اپنے چھوٹے بھائی مولانا غلام رسولؒ کو بھی ساتھ لے گئے اور اس گاؤں (قلعہ اسلام) میں سکونت اختیار کر لی۔

حکیم غلام محمد دینی علوم سے آشنا، عربی و فارسی کے متبحر عالم اور اعلیٰ درجے کے طبیب تھے۔ طبابت میں مہارت کے سبب انھیں والئی افغانستان کے شاہی طبیب

ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ کابل اور کشمیر سے خشک میوے لا کر تجارت کرتے تھے اس لیے وہ صاحب ثروت بزرگ تھے۔

مولانا غلام محمد صاحب کے دو بیٹے تھے، شیخ احمد اور شاہ محمد۔ شیخ احمد صاحب کا ایک ہی بیٹا تھا، جس کا نام ثناء اللہ تھا۔ شیخ احمد کا انتقال جوانی میں ہو گیا تھا اور ثناء اللہ صاحب بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے، لہٰذا ان کی کفالت کی ذمہ داری ان کے چچا مولوی شاہ محمد صاحب نے اٹھائی۔ جوان ہوئے تو اپنی دختر نیک اختر (اقبال بیگم) سے ان کی شادی کر دی۔

مولانا شاہ محمد صاحب عالم دین بھی تھے اور ماہر طبیب بھی۔ قلعہ اسلام کی ایک مسجد میں جمعے کا خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ کیمیا گری کا بھی شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے سادھوؤں کے ساتھ نہ جانے کس کس جنگل کی خاک چھانتے پھرے۔ زمین، گھر بار اور جائیداد وغیرہ سب کچھ اسی شوق کی نذر ہو گیا۔ اس مشکل وقت میں مولوی ثناء اللہ صاحب نے ان کی مدد کی۔ 1937ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی تین بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا۔ بیٹے کا نام محمد عثمان تھا۔ بڑی بیٹی اقبال بیگم کی شادی مولوی ثناء اللہ سے ہوئی۔ مولوی ثناء اللہ صاحب کا ایک بیٹا اور چار پوتے ہیں۔ بیٹے کا نام احسان اللہ ہے اور پوتوں کے نام ہیں محمد عفان، محمد صفوان، محمد فرحان اور محمد شمزان۔ یہ لوگ علامہ اقبال ٹاؤن (لاہور) میں مقیم ہیں۔

منجھلی صاحب زادی کی شادی مولانا عبدالعزیز کے بیٹے عبدالرحمن سے ہوئی۔ ان دونوں کا تذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔

چھوٹی صاحب زادی امۃ المجید کی شادی گکھڑ کے قریب موضع ہیراں والا کلاں

میں راجپوت کھوکھر برادری کے ایک شخص چودھری عبداللطیف سے ہوئی۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ محمد ظفر اللہ، محمد سعادت اللہ اور محمد عظمت اللہ۔

محمد ظفر اللہ نے بی۔ اے کرنے کے بعد ملازمت کا آغاز محکمہ انہار سے کیا۔ بعد ازاں اے جی آفس میں ملازمت کرنے لگے۔ پھر مسلم کمرشل بنک میں چلے گئے، بعدازاں سعودی عرب (جدہ) گئے۔ ایک عرصے کے بعد واپس پاکستان آئے ہیں۔ آج کل فیروز پور روڈ پر چاولوں کی ایک فیکٹری میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔

ان کے تین بیٹے ہیں۔ ولید ظفر ڈاکٹر ہیں، سعد ظفر چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ یہ دونوں بھائی آج کل نیویارک میں مقیم ہیں۔ سب سے چھوٹے بیٹے عمیر ظفر انجینئر ہیں اور پاکستان میں مصروف کار ہیں۔

محمد سعادت اللہ صاحب کے دو صاحب زادے ہیں۔ محمد بلال اور حذیفہ۔ محمد بلال ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں اور حذیفہ انجینئر۔ پاکستان ہی میں ہیں اور ڈیفنس لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔

محمد عظمت اللہ کا ایک ہی بیٹا ہے، جس کا نام محمد آصیف ہے اور زیر تعلیم ہے۔ ٹاؤن شپ لاہور میں مقیم ہے۔

مولوی ثنا اللہ صاحب

یہ شیخ احمد صاحب کے اکلوتے فرزند تھے۔ 1901ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہوگئے تھے۔ ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ نائب تحصیل دار کی جگہ مل رہی تھی، لیکن اپنے ہی گاؤں کے ایک دوست عبدالحق وکیل جنھیں انگریزی فوج میں درزی خانہ

اور کافی خانہ کا ٹھیکا ملا ہوا تھا، انھیں اپنے ساتھ جالندھر چھاؤنی لے گئے۔ وہاں اپنے کاروبار کا مینیجر مقرر کر دیا۔ تقسیم ملک کے بعد واپس گاؤں آ گئے اور کپڑا بننے کی کھڈیاں لگائیں لیکن ناتجربہ کاری کے باعث بھاری نقصان اٹھایا اور تمام سرمایہ ڈوب گیا۔

چوہدری عبدالحق وکیل نے پشاور خیبر آٹوز کے نام سے ایک فرم قائم کی۔ انھوں نے مولوی ثناء اللہ صاحب کو اس فرم میں مینیجر بنا دیا لیکن اس بار ملازمت راس نہ آئی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ایک ریٹائرڈ فوجی جرنیل زیڈ۔ ایچ انصاری کے پاس 120 روپے ماہوار پر ملازمت مل گئی۔ بعد میں برانڈرتھ روڈ کی ایک فرم ویسٹرن ٹریڈرز میں بطور اکاؤنٹنٹ ملازم ہو گئے اور تادم واپسیں وہیں ملازمت کرتے رہے۔

ملازمت کے دوران نماز اور جمعہ مسجد مبارک اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں پڑھتے تھے۔ وہاں ان دنوں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانیؒ جمعے کا خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ تعلقات استوار ہوئے جو محبت اور عقیدت میں بدل گئے۔ اتفاق سے ان کی فرم نے ان کو رہائش کے لیے شیش محل روڈ پر ایک مکان دے دیا۔ اس طرح وہ نمازوں کے لیے دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں جانے لگے۔ وہاں مولانا محمد داؤد غزنویؒ کے ساتھ بھی ربط وضبط پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ اندرون لوہاری دروازہ کوچہ تامی ہوکاں میں سکونت پذیر تھے۔

انتہائی شریف النفس اور حلیم الطبع بزرگ تھے۔ بردباری ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ نہایت کریمانہ اخلاق کے مالک تھے۔ مشکل سے مشکل وقت میں بھی گھبراہٹ کا اظہار نہ کرتے۔ سحری کے وقت، نماز تہجد ادا کرتے اور اپنے رب کے سامنے مناجات کرتے اور اپنے رب سے بار بار کہتے:

﴿فلم اکن بدعائك رب شقیا﴾ (سورہ مریم: 4)

”اے میرے رب! میں تیری بارگاہ میں دعا کر کے کبھی نامراد نہیں رہا۔“

فراخ دل، کشادہ دست اور مہمان نواز تھے۔ کوئی مہمان آتا تو خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا استقبال کرتے اور اس کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ خوش خوراک اور خوش لباس تھے۔ ہر موسم میں شلوار قمیض اور کوٹ پہنتے۔ سر پر جناح کیپ سجاتے۔ چلتے تو واقصد فی مشیک کا اعلیٰ نمونہ اور یمشون علی الارض ھونا کا مصداق تھے۔

جون 1970ء کے آخری ہفتے میں بخار ہوا اور 29۔ جون 1970ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللھم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه.

ان کے دو بیٹے تھے اور دو بیٹیاں۔ دونوں بیٹیوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ بڑا بیٹا انعام اللہ بچپن ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ ان کا ایک ہی بیٹا احسان اللہ ہے، جس کے چار بیٹے ہیں جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

ملک محمد عثمان

یہ مولوی شاہ محمد صاحب کے اکلوتے بیٹے تھے۔ 11/نومبر 1926ء کو قلعہ اسلام میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ حالتِ یتیمی میں پرورش پائی۔ ان کے تایا زاد مولوی ثناء اللہ صاحب نے ان کی کفالت کی۔ ہوش سنبھالا تو اپنے خالو مولوی محمد عظیم ہاشمی کے پاس دہلی چلے گئے۔ انھوں نے ان کو اینگلو عرب سکول دریا گنج میں داخل کرا دیا۔ مولانا عبدالجبار غازی ان دنوں اس سکول کے انچارج تھے۔ ان سے تعلیم پائی۔ غازی صاحب بڑے موحد اور عملی مسلمان تھے۔ جماعت

اسلامی میں شامل ہوئے۔ 1952ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی گرفتاری پر جماعت اسلامی کے امیر بنے۔ بعد ازاں جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کرلی۔ راولپنڈی سٹیلائٹ ٹاؤن میں مدرسہ قائم کیا۔ آج کل ان کے صاحب زادے فرقان غازی اس مدرسے کے مہتمم ہیں۔

ملک محمد عثمان کا رابطہ اپنے استاد سے آخری وقت تک رہا۔ استاد اور شاگرد جب بھی ملتے تو استاد کی طرف سے محبت وشفقت کا اظہار ہوتا اور شاگرد کی طرف عزت واحترام کا۔

1944ء میں میٹرک پاس کیا۔ 1945ء میں واپس گوجراں والا آگئے اور وہاں اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی صاحب کے فرزند حکیم محمود صاحب ان کے ہم جماعت رہے تھے۔

حالات کے دباؤ سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملازمت پر مجبور ہوگئے اور دہلی چلے گئے، جہاں ملازمت اختیار کرلی۔

پروفیسر عبدالسلام فاروقی (سیالکوٹ) ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"1947ء میں تقسیم وطن پر ہنگامے پھوٹ پڑے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ 12/اگست 1947ء کو بذریعہ طوفان میل دہلی سے روانہ ہوئے۔ 13۔ اگست کو امرتسر پہنچے۔ امرتسر ریلوے سٹیشن پر گورکھا رجمنٹ نے ڈائریکٹ فائرنگ کردی۔ لوگ جانیں بچانے کے لیے پلیٹ فارم پر لیٹ گئے۔ انھوں نے (عثمان صاحب نے) بھی لیٹنے کا سوچا ہی تھا کہ معاً خیال آیا گلے میں قرآن مجید حمائل کیا ہوا ہے، لیٹ گیا تو قرآن مجید کی بے حرمتی ہوگی، لہٰذا

کھڑے رہے۔ ہر طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ لیکن اللہ نے انھیں ہر طرح سے محفوظ رکھا۔" (سیارہ ڈائجسٹ۔ قرآن نمبر جلد سوم ص 34)

آگ اور خون کے دریا سے گزر کر 14۔ اگست 1947ء کو لاہور پہنچے اور وہاں ازسرِ نو ملازمت کا آغاز کیا۔

انارکلی میں جہاں آج کل بخشی مارکیٹ ہے، کبھی کھلا میدان تھا۔ وہ یہاں اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ ان دنوں جناب مفتی محمد حسن صاحبؒ کے فرزند گرامی مولانا عبیداللہ صاحب بھی وہاں ان کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ دوستی بڑھی تو دونوں ایک دوسرے کے استاد شاگرد بن گئے۔ مولانا عبیداللہ صاحب نے ان سے انگریزی پڑھی اور انھوں نے ان سے عربی۔

1952ء میں گریجوایشن کرلی 56۔1955ء میں وزارت مال کراچی میں چلے گئے۔ 1959ء میں FCMA کا امتحان پاس کیا اور وزارت مال کراچی میں بطور اکاؤنٹس آفیسر تقرری ہوئی۔ پھر وزارت مذہبی امور اسلام آباد میں بطور سینئر اکاؤنٹس آفیسر تعینات ہوئے۔ پھر وزارت پیداوار میں افسر بکار خاص مقرر ہوئے۔ بعد میں نیشنل شپنگ کارپوریشن میں چیف انٹرنل آڈیٹر رہے۔ نومبر 1986ء میں ریٹائر ہوگئے۔

انھیں قلم و قرطاس سے بھی لگاؤ تھا، کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ (پنجابی)، اسلام دینِ حق (اردو)، "Wholy world Order" (دنیا کا مقدس نظام) سرفہرست ہیں۔ ان کتابوں پر تبصرہ ہفت روزہ تکبیر نے (جس کے ایڈیٹر جناب صلاح الدین تھے) 2۔ اگست 1997ء کی اشاعت میں کیا۔ ان کی پاکستان شپنگ کارپوریشن پر لکھی ہوئی ایک مبسوط رپورٹ فروری 1988ء

میں شائع ہوئی۔ ان کا ایک مضمون سیارہ ڈائجسٹ کے قرآن نمبر میں چھپا۔ اپنی آپ بیتی ''خودنوشت سرگزشت'' کے عنوان سے لکھی اور آخر عمر میں قرآن مجید کے مضامین کے اعتبار سے تبویب مرتب کررہے تھے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی اور 24/ اگست 2007ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ کراچی میں مدفون ہوئے۔

ملک محمد عثمان صاحب کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ناعمہ عثمان ہے۔ بیٹوں میں سے بڑے بیٹے کا نام محمد نعمان ہے جو 19/ مارچ 1955ء کو پیدا ہوئے۔ ایم بی اے کیا۔ آج کل سینئر وائس پریذیڈنٹ بنک آف پنجاب لاہور ہیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا ہے جس کا نام سعد نعمان ہے۔20/ دسمبر 1989ء کو پیدا ہوا۔ الیکٹرو انجینئرنگ کا طالب علم ہے۔

عثمان صاحب کا دوسرا بیٹا محمد سلمان ہے جو 23/ اپریل 1958ء کو پیدا ہوا۔ ماسٹر آف میرینز کیا۔ کیپٹن مرچنٹ نیوی ہے۔ سارا سال بحری جہازوں کے عرشے پر ہی گزرتا ہے۔ ان کی دو بچیاں ہیں۔

تیسرے بیٹے محمد عرفان ہیں۔ یکم نومبر 1959ء کو پیدا ہوئے۔ کراچی یونیورسٹی سے گریجوایشن کی۔ اٹک سیمنٹ فیکٹری میں بطور اسسٹنٹ منیجر ایڈمن خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا ہے، جس کا نام محمد عبداللہ ہے۔ وہ 20/ اگست 1996ء کو پیدا ہوا۔ ساتویں جماعت کا طالب علم ہے۔ ماشاء اللہ قرآن مجید کا حافظ ہے۔

چوتھا بیٹا محمد عمران ملک ہے۔ یکم مئی 1963ء کو پیدا ہوا۔ بی کام کیا۔ آج کل ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ فہد عمران اور سعود عمران جو علی الترتیب 15/ اکتوبر 1998ء اور 20/ اپریل 2004ء کو پیدا ہوئے۔ دونوں بچے زیر تعلیم ہیں۔

پانچویں بیٹے محمد ریحان ہیں جو 29 / اپریل 1969ء کو پیدا ہوئے۔ ایم بی اے کیا۔ پاک عرب فرٹیلائزر ملتان کے ریجنل مینجر ہیں۔ فیصل آباد میں تعینات ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ زید سلطان ملک (پیدائش 23 / جون 2006ء) اور التمش عثمان ملک، جس کی تاریخ پیدائش 5 / اپریل 2009ء ہے۔

بتیسواں باب

مولانا شیر محمد

مولانا شیر محمد مولانا غلام رسول کے چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے دونوں بھائی قلعہ اسلام میں آبسے تھے لیکن مولانا شیر محمد نے پنجاب کے بغداد (کوٹ بھوانی داس) میں رہنے کو ترجیح دی۔

مولانا شیر محمد کے تین بیٹے تھے۔ سید احمد، خیر دین اور زین العابدین۔ زین العابدین کی نرینہ اولاد نہ تھی، تین بیٹیاں تھیں۔ ہاجرہ، کلثوم اور خدیجہ۔

ہاجرہ مولوی ثناء اللہ صاحب کی والدہ، کلثوم ملک عبدالاحد صاحب اور خدیجہ ڈاکٹر محمد یونس کی والدہ تھیں۔ ان کی ایک بیٹی فاطمہ ہے جن کا ایک ہی بیٹا اعجاز ناصر ہے۔

مولانا شیر محمد صاحب کے بڑے بیٹے سید احمد کے پانچ بیٹے تھے، حسن محمد، محمد حسین، محمد سعید، فقیر اللہ اور محمد شریف۔ ان میں سے محمد حسین اور محمد شریف لاولد تھے۔

حسن محمد صاحب کے دو بیٹے ضیاء الدین اور قائم دین تھے۔ قائم دین کا ایک ہی بیٹا ہے محمد یونس، اور ضیاء الدین صاحب کے دو بیٹے ہیں محمد یوسف اور محمد اسحاق۔ ان کے بارے میں مزید کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ ضیاء الدین صاحب تعلیم یافتہ تھے اور کئی

کتابوں کے مصنف بھی۔

محمد سعید صاحب کے چھ بیٹے ہوئے عزیز احمد، عبدالواحد، عبدالجبار، عبداللہ، محمد اشرف اور زین العابدین۔ عزیز احمد اور عبدالواحد کا ایک ایک بیٹا ہے۔ عزیز احمد کے بیٹے کا نام محمد اکرم اور عبدالواحد صاحب کے بیٹے کا نام منظور احمد ہے۔ محمد اکرم صاحب کے بارے میں مزید کچھ علم نہیں۔ البتہ منظور احمد صاحب کے چار بیٹے ہیں سیف اللہ، انعام اللہ، محمد آصف اور محمد عاطف۔

عبدالجبار صاحب کے تین بیٹے ہیں عبدالسلام، عبدالرحمٰن اور محمد زکریا۔ عبدالسلام صاحب نہایت ذہین آدمی تھے۔ شلوار قمیص پہنتے اور سر پر سیاہ جناح کیپ رکھتے تھے۔ صاحب طرز ادیب تھے۔ جناب شورش کاشمیری کے دست راست تھے اور ان کے ہفت روزہ ''چٹان'' میں کام کرتے تھے۔ انھیں ہزاروں شعر، لطیفے اور چٹکلے یاد تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے جان محفل بن جاتے۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان گنت موضوعات کے بارے میں وسیع معلومات رکھتے تھے۔ سیاسی معلومات کا ایک خزانہ تھے۔ بہت سی اندرون خانہ کہانیوں کا انھیں علم ہوتا۔ سناتے تو حیران کر دیتے۔ راقم الحروف کے والد مولوی عبدالرحمٰن صاحب سے انھیں خاص انس تھا۔ گاہے بگاہے ملاقات کے لیے تشریف لاتے تو خوب محفل جمتی۔ گفتگو کا انداز خطیبانہ تھا۔ آخر انھیں بھی پیغام اجل آن پہنچا اور اپنے رب کے پاس چلے گئے۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔

عبدالسلام صاحب کے منجھلے بھائی عبدالرحمن صاحب اچھرہ لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ انیس الرحمان، نوید الرحمٰن اور وقار عظیم۔

عبدالسلام کے سب سے چھوٹے بھائی محمد ذکریا نے سڑک کے حادثے میں وفات

پائی۔ ان کے پانچ بیٹے ہیں۔ عمر فاروق، محمد عثمان، محمد نعمان، محمد عمران، محمد حسن۔

مولانا عبدالجبار کے چوتھے بھائی عبداللہ تھے۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ محمد زبیر اور محمد زمان۔ پانچویں بھائی محمد اشرف کے چار بیٹے ہیں۔ امان اللہ، محمد ذوالفقار، فضل الرحمٰن اور عتیق الرحمٰن۔

چھٹے بھائی زین العابدین صاحب کے پانچ بیٹوں کے نام یہ ہیں۔ عبدالخالق، محمد ادریس، محمد فاروق، مسعود احمد اور محمد عتیق۔

مولانا شیر محمد صاحب کے بیٹے فقیر اللہ صاحب کے تین بیٹے تھے۔ نصیر الدین، رفیع الدین اور محمد اشرف۔ نصیر الدین پروفیسر تھے اور محکمہ تعلیم سے منسلک۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ محمد جمیل اور خورشید احمد۔

ڈاکٹر رفیع الدین صاحب پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھے۔ اور صاحب قلم وقرطاس تھے۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے (Ideology of Islam) ''نظریہ اسلام''۔ نہایت علمی اور وقیع کتاب ہے۔ ان کے تین بیٹے ہیں صلاح الدین محمود، عبدالسلام اور شجاع الرحمٰن۔

فقیر اللہ صاحب کے تیسرے بیٹے محمد اشرف تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا ہے محمد اشفاق' جو آزاد کشمیر میں رہائش پذیر ہے۔

مولانا شیر محمد صاحب کے دوسرے بیٹے خیر دین تھے۔ خیر دین صاحب کے تین بیٹے تھے غلام اللہ، عبداللہ اور حافظ محمد اسحٰق۔

غلام اللہ صاحب محکمہ انہار میں ایس ڈی او تھے۔ عبداللہ صاحب کا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار تھا۔ حافظ محمد اسحٰق صاحب، مولوی ثناء اللہ صاحب کے ساتھ انگریزی فوج کی

— پلٹنوں میں ملازمت کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد واپس آ گئے تھے۔

غلام اللہ صاحب کے دو بیٹے ہوئے عبدالحفیظ اور عبدالحمید۔ آگے عبدالحفیظ صاحب کے دو بیٹے تھے عبدالمنان اور عبدالحنان۔ عبدالمنان صاحب لاولد فوت ہوئے اور عبدالحنان صاحب کی ایک ہی بیٹی ہے۔ عبدالحمید صاحب کاتب تھے۔ مدتوں البلاغ پریس بیرون شاہ عالمی گیٹ میں کام کرتے رہے۔ انتہائی خوش اخلاق، ملنسار اور مہمان نواز تھے۔ عبدالحمید صاحب کے چار بیٹے ہیں منصور الحق، مسعود الحق، عبدالوحید اور محمد آصف۔ سمن آباد (لاہور) میں مقیم ہیں۔ مسعود الحق اور عبدالوحید بیرون ملک تھے۔ عبدالوحید صاحب کا بیرون ملک ہی انتقال ہو گیا تھا۔

منصور الحق صاحب کے دو بیٹے ہیں رضوان الحق اور محمد عثمان۔ رضوان الحق بیرون ملک ہیں اور محمد عثمان حافظ قرآن ہیں اور زیر تعلیم ہیں۔ مسعود الحق اور محمد آصف کا ایک ایک بیٹا ہے۔ ان کے نام محمد حارث اور اسامہ ہیں۔

مولانا شیر محمد کے دوسرے پوتے عبداللہ تھے، جن کے ایک ہی بیٹے تھے عبدالاحد صاحب۔ عبدالاحد صاحب نہایت خوب صورت تھے۔ گورا چٹا رنگ، پورا قد، بھرا ہوا جسم، اجلی سفید شلوار قمیص زیب تن کرتے۔ سر پر جناح کیپ، آنکھوں پر نہایت نفیس اور شفاف عینک، سفید دانت۔ بائیں طرف کے دانتوں میں ایک دانت پر سونے کا خول، ہنستے اور مسکراتے تو سونے کا دانت زیادہ نمایاں ہوتا۔ مشہور مسلم لیگی لیڈر میاں منظر بشیر کے پرسنل سیکرٹری تھے۔ نہایت دیانت داری کے ساتھ ان کی املاک کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ نفیس ذوق کے مالک تھے۔ نفاست پسند اتنے کہ کیا مجال ان کے سفید اور اجلے لباس پر معمولی سا داغ بھی ہو۔

ان کے دو بیٹے ہوئے ظفر اقبال اور نصر اقبال۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی نہایت خوب صورت اور جوان تھے، ایڈووکیٹ تھے۔ پنجاب کے اسٹنٹ پراسیکیوٹر رہے۔ نہایت خوش اخلاق، ملنسار، ہمدرد اور غم گسار قسم کے انسان تھے۔ ان کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔

ظفر اقبال کے دو بیٹے ہیں۔ ایک کا نام محمد بلال ہے اور دوسرے کا نام ہے باسم۔ محمد بلال ایم بی اے ہیں اور باسم ابھی زیر تعلیم ہیں۔ نصر اقبال بیرون ملک ہیں، نصر اقبال کا ایک ہی بیٹا ہے جس کا نام ولید نصر ہے۔

حافظ محمد اسحٰق صاحب

مولانا خیر دین صاحب کے تیسرے بیٹے حافظ محمد اسحٰق صاحب تھے۔ تلاش روزگار کے سلسلے میں انگریزی فوج میں ملازمت کی۔ تقسیم ملک کے بعد واپس آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں لحنِ داؤدی سے نوازا تھا۔ جامع مسجد مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ میں فجر کی نماز کی عموماً امامت فرماتے۔ قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تو ہوا تھم جاتی اور فضا جھوم اٹھتی۔ جی چاہتا کہ حافظ صاحب قرآن پڑھتے جائیں اور ہم سنتے جائیں۔ شلوار قمیص اور اوپر واسکٹ پہنتے۔ آنکھوں پر عینک، سر پر ترکی ٹوپی۔ داڑھی سرخ مہندی سے رنگی ہوئی، ان کے چہرے پر عجب بہار دیتی۔ اب ایسی ہستیاں کہاں؟

حافظ صاحب کے تین بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے محمد یعقوب تھے۔ اپنے والد کی طرح نہایت خوش الحان تھے۔ مسجد میں اذان دیتے تو چلتے قدم رک جاتے۔ عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔ ان کے چھوٹے بھائی محمود الحسن تھے۔

ریلوے میں ملازمت کرتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بیمار ہو گئے۔ طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ ان کا ایک ہی بیٹا ہے حامد محمود۔ ان کا بھی ایک ہی بیٹا ہے جس کا نام محمد عباس ہے۔

محمود الحسن صاحب سے چھوٹے محمد خالد ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے اور برکت عطا فرمائے۔ نہایت شریف انسان ہیں۔ سمن آباد ٹیلیفون ایکسچینج کے آس پاس رہائش پذیر ہیں۔ ان کے چار بچے ہیں۔ غیاث الرحمٰن، سجاد خالد، سلمان خالد اور نعمان خالد۔ نعمان صاحب حافظ قرآن ہیں۔ سجاد خالد کے دو بچے ہیں، حذیفہ اور خزیمہ۔

مولانا عبدالقادر

مولانا غلام رسولؒ کے دو صاحب زادے تھے، عبدالقادر اور عبدالعزیز۔ ان سطور میں پہلے مولانا عبدالقادرؒ کا تذکرہ کیا جائے گا اور مولانا عبدالعزیز کا ان کے بعد۔

مولانا عبدالقادر 1279ھ (63۔ 1862ء) کو بمقام قلعہ اسلام پیدا ہوئے۔ طفولیت کی منزلیں طے کرنے کے بعد شعور کی منزل میں قدم رکھا ہی تھا کہ بارہ سال کی عمر (1291ھ) میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

مولانا غلام رسولؒ نے 1288ھ میں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اپنی اولاد کے لیے ایک وصیت نامہ لکھا:

"لہٰذا بہ فرزندی عبدالقادر کہ امروز نہ سالہ است وبعد تلاوت قرآن شریف وتحصیل صرف تا زرادی، بوستان و گلستان مے خواند...... از فراغ علم دینیہ دست بیعت شیخ کامل مکمل دہند و دریں زمان مثل عبداللہ غزنوی درقیاس ما احدے نیست، صحبتش اکسیراست، وتحقیقت کامل مکمل پیراست۔ عبدالقادر ترجمہ قرآن از ایشاں شروع کنند"

ترجمہ: میرا فرزند عبدالقادر جو نو سال کا ہے، قرآن مجید پڑھنے کے بعد علم صرف زرادی تک اور گلستان، بوستان پڑھ رہا ہے۔ دینی تعلیم سے فراغت کے بعد کسی کامل بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرے۔ اس وقت میرے خیال میں (حضرت سید) عبداللہ غزنوی سے بہتر کوئی نہیں۔ ان کی صحبت اکسیر ثابت ہوگی۔ حقیقت میں وہ کامل اور مکمل پیر ہیں۔ عبدالقادر ان سے قرآن مجید کے ترجمے کا آغاز کرے۔

مولانا عبدالقادر کی عمر بارہ سال تھی کہ ان کے والد مولانا غلام رسولؒ کا 1291ھ میں انتقال ہو گیا۔ آٹھ سال بعد 1298ھ میں مولانا عبداللہ غزنویؒ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس وصیت پر عمل ہو سکا یا نہیں، اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ غالب گمان یہی ہے کہ ہوا ہوگا۔ تاہم تعلیمی سلسلہ دیر تک جاری نہ رہ سکا ہوگا، کیوں کہ حافظ عبدالمنان صاحب وزیرآبادیؒ کے علمی فیض یافتگان کی فہرست پر نگاہ ڈالتے ہیں تو مولانا عبدالقادرؒ کا نام نامی سرفہرست نظر آتا ہے۔

حافظ عبدالمنانؒ وزیرآبادی کا بیان ہے کہ

''مولانا غلام رسولؒ کے انتقال کے بعد انھوں نے خواب دیکھا کہ مولانا کو سخت پیاس لگی ہے اور وہ دونوں ہاتھ پھیلائے ان سے پانی طلب کر رہے ہیں۔ میرے آگے ایک چشمہ نہر بہہ رہا ہے۔ میں نے اس سے لے کر ایک پیالہ پیش کیا۔ انھوں نے پانی پیا لیکن پیاس بجھی نہیں۔ میں اور دینا چاہتا تھا کہ جاگ اٹھا اور اس خواب کی تعبیر کے بارے میں بہت فکر مند ہوا، لیکن بعد میں تعبیر از خود ظاہر ہوگئی جب کہ مولانا کے دونوں صاحب زادوں مولانا

عبدالقادر اور مولانا عبدالعزیز نے مجھ سے علم حدیث کی تحصیل کی۔"

(استاد پنجاب۔ص 90)

مولانا عبدالقادر کی شادی صغر سنی یعنی دس سال کی عمر میں کردی گئی تھی۔ مولانا عبدالقادر کا بیان ہے کہ

"آپ (مولانا غلام رسولؒ) جب حج بیت اللہ کر کے قلعہ اسلام تشریف لائے تو میری شادی کی اور اس کے بعد ڈھائی سال زندہ رہے۔"

(سوانح حیات مولانا غلام رسول۔صفحہ 68)

اس صغر سنی کے باوجود مولانا غلام رسولؒ کے انتقال کے بعد ان کی مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض بھی ان کے کندھوں پر آگئے تھے۔ چنانچہ تعلیمی اور تبلیغی سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ جب آپ کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالعزیزؒ، حافظ عبدالمنان وزیر آبادیؒ سے سند فراغت حاصل کر کے آئے تو آپ نے امامت وخطابت کا سلسلہ ان کے سپرد کردیا اور خود زمینوں کی دیکھ بھال اور کاشت کاری میں مصروف ہوگئے، تاہم تبلیغی سلسلہ بھی کسی حد تک جاری رہا۔

مولانا عبدالعزیز رحمہ اللہ

مولانا عبدالعزیزؒ، مولانا غلام رسول صاحب کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ 1284ھ (1868ء) کو قلعہ اسلام میں پیدا ہوئے۔ ابھی ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ والدہ چل بسیں۔ پانچ سال کی عمر میں والد کا سایۂ عاطفت بھی سر سے اٹھ گیا۔ یوں مکمل یتیمی کی گود میں پرورش پائی۔ کچھ بڑے ہوئے تو بہن کے پاس فتح گڑھ چوڑیاں چلے گئے اور مولوی محمد عثمان صاحب سے تعلیم کا آغاز کیا۔ لیکن وہاں 1299ھ (1882ء) میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے اور وہ وہاں سے آگئے۔ پھر حافظ عبدالمنان وزیرآبادیؒ کے دامانِ علم سے وابستہ ہوگئے اور ان سے سندِ فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد قلعہ ہی میں امامت و خطابت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ علم میں رسوخ حاصل تھا۔ ہم عصر علماً کے ساتھ نہایت گہرے اور خوش گوار تعلقات تھے۔ قلم وقرطاس سے بھی رابطہ تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کے ہفتہ وار اخبار "اہل حدیث" سے مستقل تعلق تھا۔ اس کے مستقل خریدار تھے اور قلمی معاون بھی۔ ان کے مضامین اخبار "اہل حدیث" امرتسر میں شائع ہوتے رہتے تھے۔

مرزائیوں کے خلاف تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ مرزائیوں کے رد میں ایک طویل فارسی قصیدہ بعنوان "قصیدہ یائیہ دررد عقائد مرزائیہ" اہل حدیث میں بالا قساط شائع ہوتا رہا۔

ستمبر 1906ء کے بعد مرزا صاحب کی زندگی میں انجمن اہل حدیث وزیر آباد کی طرف سے ایک فتوی شائع ہوا جس میں مرزا صاحب کے دعوائے نبوت و مسیحیت کی بنیاد پر اس کی اور اس پر ایمان لانے والوں کی تکفیر کی گئی تھی۔ نیز ان اشخاص کی بابت بھی فتوائے تکفیر صادر کیا گیا تھا جو مرزائی نہ ہونے کے باوجود مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کو نبی و مجدد ماننے والوں کی تکفیر میں تامل کرتے تھے۔ ان فتووں پر درج ذیل بزرگوں نے دستخط فرما کر تحریکِ ختم نبوت کے کارواں میں شمولیت اختیار کی۔

① مولانا ابوالوفاء مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ ② حافظ عبدالمنان وزیر آبادیؒ

③ مولانا عبدالجبار عمر پوری ④ مولانا عبدالجبار غزنوی

⑤ مولانا ظہور احمد بگوی ⑥ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی

⑦ مولانا عبدالعزیز قلعہ اسلام۔

مولانا عبدالعزیز شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی فارسی اور اردو نظمیں اہل حدیث (امرتسر) میں شائع ہوتی رہیں۔

مزاج میں نزاکت بہت تھی۔ سردی ابھی کوسوں دور ہوتی، اور کمبل اوڑھ لیتے۔ گرمی کا ابھی اتا پتا بھی نہ ہوتا کہ ململ کا کرتہ پہن لیتے۔

طبیعت میں استقلال نہ تھا۔ قرآن مجید کی تفسیر، تفسیر عزیزی کے نام سے لکھنی شروع کی تو معاملہ دو سپاروں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ صحیح مسلم کا ترجمہ عمدۃ التاج کے

نام سے شروع کیا تو ایک پارے کے بعد معاملہ ٹھپ ہو گیا۔

گاؤں سے نکلنا کسی صورت گوارا نہ تھا۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے اچھے خاصے مشاہرے پر بطور استاد بلایا گیا لیکن اپنے آباو اجداد کی مسند کو چھوڑ کر جانا گوارا نہ کیا۔

پروفیسر محمد صدیق مان اپنے والد کی زبانی ایک روایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے والد محمد عبداللہ صاحب کے مولانا عبدالعزیز کے ساتھ نہایت گہرے عقیدت مندانہ تعلقات تھے۔ ایک دفعہ ان کے کماد کے کھیت کو چوہا لگ گیا۔ کماد کی فصل برباد ہو رہی تھی۔ انھوں نے مولانا عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہو کر بات کی۔ آپ ان کے ہمراہ کماد کے کھیت پر تشریف لے گئے اور ان سے کہا کہ چوہے کے بلوں کی مٹی لے کر اس فصل کے تین کونوں میں بکھیر دو اور چوتھا کونا خالی چھوڑ دو۔ چوتھے کونے پر میرے ساتھ خود کھڑے ہو گئے اور بہ آواز بلند کہا ''چوہو یہ کماد انسانوں کی خوراک ہے، تمھاری نہیں، لہٰذا اس کھیت کو فوراً خالی کر دو''۔ پروفیسر صاحب کے والد عبداللہ جٹ بیان کرتے ہیں کہ چوہے قطار اندر قطار ہمارے پاس سے گزر کر جانے لگے۔ ان کا بیان ہے کہ عجب شادی و مرگ کی کیفیت تھی۔ خوشی سے ہنسی بھی آ رہی تھی اور فرط جذبات سے آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ مولانا عبدالعزیز کا 15۔ جنوری 1940ء کو انتقال ہو گیا۔

مولانا عبدالقادر کی اولاد

مولانا عبدالقادر کے چار بیٹے تھے: مولانا عبدالمالک، مولانا عبدالرشید، مولانا محمد صادق اور مولانا عبدالوکیل۔

اب ان چاروں کی الگ الگ اولاد کے متعلق کچھ تفصیل۔

مولانا عبدالقادر کے پہلے بیٹے مولانا عبدالمالک عالم وفاضل بزرگ تھے۔ سفر وحضر میں اپنے والد کے ہمراہ رہے۔ محکمہ مال میں ملازمت اختیار کی مگر جلد ہی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔

ان کے تین بیٹے حکیم عبدالقیوم، عبدالحی اور ڈاکٹر محمد نعیم تھے۔ حکیم عبدالقیوم زبدۃ الحکما تھے اور منڈی وابرٹن میں مطب کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے حکیم خلیل الرحمان مطب کا کام چلا رہے ہیں۔ حکیم خلیل الرحمان کے تین بیٹے ہیں۔ حمزہ خلیل، ڈاکٹر طلحہ اور حسان خلیل۔ یہ نوعمری ہی میں راہی ملک عدم ہو گئے۔

عبدالحی صاحب کے پانچ صاحب زادے ہوئے۔ محمد سعید، عبدالوحید، عبدالتوحید،

— محمد ندیم اور وسیم اختر۔

عبدالتوحید حادثاتی طور پر وفات پا گیا تھا۔

ڈاکٹر محمد نعیم صاحب بفضلہٖ صاحبِ اولاد ہیں۔ ان کے چار بیٹے طاہر، طیب، ناصر اور یحییٰ ہیں۔ یہ چاروں بیٹے ڈاکٹر ہیں۔

محمد سعید صاحب کے چار صاحب زادے مبشر، مظفر، منور اور عدیل اختر ہیں۔

عبدالوحید کے دو بیٹے حسن اور ثاقب ہیں۔

محمد ندیم کے تین بیٹے احمد، عمر اور محمد ہیں۔

وسیم اختر کا ایک بیٹا اذان ہے۔

مولانا عبدالقادر کے دوسرے بیٹے مولانا عبدالرشید صاحب دینی اور دنیاوی علوم سے بہرہ ور تھے۔ مختلف گورنمنٹ سکولوں میں درس و تدریس کا کام انجام دیتے رہے۔ ان کے چھ صاحب زادے تھے، جن کے اسمائے گرامی ہیں۔ محمد یوسف، محمد افضل، محمد اکرم، عبدالراشد، محمد خالد اور محمد اسلم۔

بڑے تین اور سب سے چھوٹا بیٹا انتقال کر چکے ہیں۔ عبدالراشد اور محمد خالد بقید حیات ہیں۔

محمد یوسف صاحب کے دو بیٹے ہیں عبدالماجد اور عبدالخالق۔

محمد افضل صاحب ساری عمر بچوں کو قرآن حکیم کی تعلیم دیتے رہے۔ ان کا ایک ہی صاحب زادہ ہے حفیظ الرحمٰن۔

حفیظ الرحمٰن کے تین بیٹے محمد انس، محمد اویس اور محمد عزیر ہیں۔ یہ لاہور میں فروکش ہیں۔

محمد اکرم صاحب کے چار بیٹے ہیں۔ ان کے نام بالترتیب محمد محسن، محمد احسن، محمد اکمل اور محمد اجمل ہیں۔

محمد محسن کے دو بیٹے محمد نعمان اور محمد فرقان ہیں۔

محمد احسن کے دو بیٹوں کے نام محمد اسد اور محمد عمر ہیں۔

محمد اجمل کے دو بیٹے محمد فہد اور محمد سعد ہیں۔

محمد خالد صاحب کا ایک ہی فرزند ہے۔ اس کا نام عبدالمعید ہے۔

مولانا عبدالقادر کے تیسرے بیٹے مولانا محمد صادق صاحب ایک متبحر عالم تھے۔ جناب مولانا حافظ محمد گوندلوی صاحب کے ساتھ احادیث پر ان کی پہروں گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ گوجراں والا شہر میں وہ مولوی ''جن'' کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے حبیب الرحمٰن، محمد احمد اور عزیز الرحمٰن۔

حبیب الرحمٰن کا ایک ہی بیٹا ہے، جس کا نام عتیق الرحمٰن ہے۔

محمد احمد حکیم تھے۔ ان کے چار بیٹے ہیں، جن کے نام محمد یحییٰ، محمد احسن، محمد ذیشان اور حافظ انوار الحق ہیں۔

محمد یحییٰ کا ایک بیٹا ہے۔ اس کا نام احمد صادق ہے۔

مولانا عبدالقادر کے چوتھے بیٹے مولانا عبدالوکیل صاحب دینی و دنیاوی علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے کچھ عرصہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ مولانا عبدالقادر کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کے چھ صاحب زادے تھے۔ عبدالرحیم، حافظ سلیم تابانی، محمد انور، حکیم عبدالباسط، محمد نسیم اور محمد الیاس۔

عبدالرحیم صاحب کے دو بیٹے عبدالمجید اور محمد ادریس ہیں۔

محمد ادریس کے چار بیٹے ارقم، حنظلہ، حماد اور ہارون ہیں۔ایک بیٹا وفات پا گیا۔یہ دونوں بھائی اور ان کی اولاد کاموں کی میں آباد ہیں۔

حافظ سلیم تابانی صاحب بہت عرصہ روزنامہ نوائے وقت اور ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے۔ان کے دو بیٹے شاہد اور مبشر ہیں۔دونوں لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔

محمد انور صاحب محکمہ مال میں پٹواری تھے۔ان کے تین بیٹے محمد فاروق، محمد زبیر اور محمد عمیر تھے۔محمد فاروق اور محمد عمیر وفات پا چکے ہیں۔

محمد فاروق کے بیٹے کا نام متین احمد ہے۔

محمد زبیر کے تین بیٹے ہیں جن کے نام اسامہ، وجیہہ الحسن اور احمد انور ہیں۔

حکیم عبدالباسط صاحب معروف سماجی کارکن تھے۔ ان کے پانچ بیٹے محمد عاصم، مبین الحق، سہیل احمد عتیق، حکیم خبیب الرحمٰن اور وحید الزمان ہیں۔

محمد نسیم ایم۔ اے، ایم۔ ایڈ ہیں۔ جامع مسجد مولانا غلام رسولؒ اور جامع مسجد مہاجرین میں کئی سال خطابت کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے تعلیم وتعلم کا پیشہ اختیار کیا۔اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔مولانا غلام رسول ویلفیئر سوسائٹی کے مسلسل چھ سال صدر رہے۔

محمد نسیم صاحب کے تین بیٹے ہیں، جن کے نام محمد طارق، محمد امجد اور سہیل احمد ہیں۔

محمد طارق کے دو بیٹے نجم الثاقب اور محمد اسعد ہیں۔

محمد امجد کے دو بیٹے معاذ اور عبداللہ ہیں۔یہ واپڈا ٹاؤن لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔

سہیل احمد کا ایک بیٹا ہے۔اس کا نام سعد سہیل ہے۔محمد طارق اور سہیل احمد سول لائن گوجراں والا میں رہائش رکھتے ہیں۔

محمد الیاس صاحب ایم۔ اے، بی۔ ایڈ ہیں۔ درس وتدریس سے متعلق رہے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ان کے چار بیٹے محمد سلمان، فیصل، وقاص اور سعد ہیں۔ ایک بیٹا وفات پا چکا ہے۔

محمد سلمان کا ایک بیٹا ساریہ سلمان ہے۔

ڈاکٹر فیصل بطور میڈیکل آفیسر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا عبدالعزیز کی اولاد

مولانا عبدالعزیز کے چار صاحب زادے تھے۔ سب سے بڑے مولوی عبدالواحد صاحب تھے۔ انھوں نے چند ابتدائی کتابیں پڑھیں اور فن کتابت سیکھا۔ آخری دم تک اسی فن کے ہو رہے۔ عمر کے آخری حصے میں بینائی ختم ہوگئی تھی۔ عمر کی اسی (80) بہاریں دیکھنے کے بعد 8۔ اگست 1975ء کو داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ ان کے دو بیٹے تھے، عبدالرؤف اور عبدالغفور۔

عبدالرؤف بی اے بی ٹی تھے۔ گورنمنٹ ہائی سکول حضرو میں عرصہ دراز تک ہیڈ ماسٹر رہے۔ ان کے چار بیٹے ہیں، محمد افتخار، محمد سرفراز، محمد فیاض اور محمد آفتاب۔

محمد افتخار صاحب کے تین بیٹے ہیں۔ فرخ افتخار، خرم افتخار اور مدثر افتخار۔ علامہ اقبال ٹاؤن میں رہائش پذیر ہیں۔

سرفراز لا ولد ہیں جب کہ فیاض کی کوئی نرینہ اولاد نہیں۔

آفتاب صاحب کا ایک ہی بیٹا ہے جس کا نام سرخیل آفتاب ہے۔

عبدالغفور صاحب کے تین بیٹے ہیں۔ نثار احمد، مختار احمد اور محمد احسان۔

نثار احمد کے تین بیٹے محمد سلمان، محمد عفان اور محمد ذی شان ہیں۔ لاہور میں مقیم ہیں۔

مختار احمد کے چار بیٹے ہیں۔ محمد رضوان، محمد صفوان، محمد ارسلان اور محمد نعمان۔ یہ سب کراچی میں ہیں۔

محمد احسان کی کوئی اولاد نہیں۔

مولانا عبدالعزیز کے دوسرے بیٹے محمد شفیع تھے۔ یہ تعلیم وتعلم سے وابستہ رہے۔ ان کا ایک ہی صاحب زادہ تھا۔ حافظ محمد داؤد۔

حافظ محمد داؤد صاحب کے تین بیٹے ہیں۔ محمد سلیمان، فضل الرحمٰن اور ضیا الرحمٰن۔

محمد سلیمان کا ایک بیٹا ہے، محمد یحییٰ۔

فضل الرحمٰن کے دو بیٹے ہیں۔ فیصل اور حسن۔

ضیاء الرحمٰن کے پانچ بیٹے ہیں۔ عبدالرافع، محمد عاشر، عبید الرحمٰن، علی اور عبدالواسع۔

مولانا محمد اشرف رحمہ اللہ

مولانا محمد اشرف صاحب مولانا عبدالعزیز صاحب کے تیسرے صاحب زادے تھے۔ یکم دسمبر 1907ء کو بروز سوموار قلعہ اسلام میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں طبیعت میں ایک قسم کا لاابالی پن تھا لیکن پھر نہایت خوش گوار انقلاب آیا۔ دینی تعلیم اپنے والد محترم مولانا عبدالعزیز صاحب سے حاصل کی۔ کتابت سیکھی۔ طیبہ کالج لاہور سے حکمت کی سند لی۔ اپنے والد محترم کی وفات کے بعد مسجد میں خطبہ اور درس قرآن کی ذمہ داری سنبھالی۔

مولانا محمد اشرف بہت سے اوصاف سے متصف تھے۔ وہ بہ یک وقت کاتب بھی

تھے اور طبیب بھی، خطیب بھی تھے اور ادیب بھی۔ گوجراں والا (ریل بازار) کے جناب بشیر صحرائی صاحب کے اخبار ہفت روزہ ''قومی دلیر'' میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

مسجد میں جمعۃ المبارک کا خطبہ ارشاد فرماتے اور موسم سرما میں صبح کی نماز کے بعد درس قرآن بھی دیتے۔ مسلسل اکیس سال تک یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔

اپنے گاؤں کی پنچایت کے سرپنچ بھی رہے، قانون پر گہری نظر تھی۔ قانونی پیچیدگیوں اور موشگافیوں کو خوب سمجھتے تھے، اس لیے ان کے لکھے ہوئے فیصلے حتمی ہوتے تھے۔ ان کے فیصلوں کے متعلق اپیل کے نتیجے میں تبدیلی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ان کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ کسی برائی کا ارتکاب ہوتے ہوئے دیکھتے تو زبان سے تو روکتے ہی تھے لیکن اگر قوت کے استعمال کی ضرورت محسوس کرتے تو اس سے بھی گریز نہ کرتے۔ اس لیے ان کی زندگی میں کسی کو علی الاعلان برائی کے ارتکاب کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

غربا و مساکین کے ہم درد تھے۔ ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دامے، درمے، سخنے ہر وقت آمادہ رہتے۔ پروفیسر محمد صدیق مان نے مصیبت زدگان کی امداد کے متعلق ان کا ایک واقعہ لکھا ہے:

''قلعہ اسلام کے مشرق میں ایک گاؤں کوٹ شیرا ہے۔ اس گاؤں کے مغرب میں سڑک کے دائیں بائیں دو جوہڑ تھے اور ان کے درمیان سے سڑک ایک پل صراط کی طرح گزرتی تھی۔ تانگوں کا زمانہ تھا۔ گوجراں والا سے قلعہ جانے والا ایک تانگہ سڑک تنگ ہونے کی وجہ سے سواریوں سمیت الٹ کر جوہڑ میں گر گیا۔ مولوی محمد اشرف صاحب سائیکل پر تانگے کے پیچھے گوجراں والا سے

گاؤں آرہے تھے۔ انھوں نے تانگے کو جوہڑ میں گرتے دیکھا تو سائیکل تیز تیز چلا کر فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ کنارے پر کھڑے لوگ تماشا دیکھ رہے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا اور شام کا وقت۔ کوئی آدمی جوہڑ میں اترنے کی ہمت نہیں کررہا تھا۔ مولوی صاحب نے انھیں کچھ نہ کہا اور خود تالاب میں چھلانگ لگادی اور سواریوں کو تالاب سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر تالاب کے کنارے کھڑے لوگ بھی اس تالاب میں کود گئے۔ تانگہ سیدھا کیا۔ سواریوں کو جن میں زیادہ تعداد مستورات کی تھی، نکالا اور پھر تانگہ گھوڑا نکالا۔ سواریوں کو گاؤں پہنچانے کا بندوبست کیا۔ پھر خود گئے۔''

اپنا کام دوسروں سے کرانے کی بجائے خود کرنے کو ترجیح دیتے۔ طبیعت میں ظرافت بھی تھی۔ پروفیسر محمد صدیق مان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ گندم پسوانے کے لیے گندم کی بوری کندھوں پر اٹھائے چکی کی طرف جارہے تھے جو بازار کے دوسرے سرے پر تھی۔ بازار سے گزرتے ہوئے ایک آدمی نے دیکھ کر کہا مولوی صاحب گندم پسوانے کے لیے کیا کوئی بندہ نہیں ملا؟ فوراً جواب دیا'' بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ مجھے بندہ ہی نہیں سمجھتے۔''

اپنے بھائیوں کے لیے سراپا ایثار تھے۔ ان کے بڑے بھائی محمد شفیع صاحب کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اوائل عمر ہی میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔ لیکن بصارت سے محرومی ان کی راہ میں حائل نہ ہوسکی۔ قرآن حفظ کیا۔ قاری فضل کریم صاحب سے قرأت سیکھی اور حدیث کا علم جامعہ اسلامیہ گوجرانوالا سے حاصل کیا۔ ان کے والد نے اپنے بھائی سے ان کے لیے ان کی بیٹی کے رشتے کا سوال کیا تو مولانا محمد اشرف نے انکار نہ کیا

اور اپنی جوان اور تندرست بیٹی ان کے معذور بیٹے سے بیاہ دی۔ آفرین ہے اس بیٹی پر بھی جس نے باپ کے حکم سے سرتابی نہیں کی بلکہ ساری عمر معذور خاوند کے ساتھ گزار دی۔

مولوی محمد اشرف عبادت گزار اور تہجد گزار تھے۔ دوران نماز ایسا خشوع و خضوع طاری ہو جاتا کہ محسوس ہوتا کوئی بے جان چیز کھڑی ہے۔ ملک محمد عثمان اپنی سرگزشت میں ان کا ایک واقعہ لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ وہ لاہور میرے خالہ زاد بھائی بشیر احمد (بی۔ اے۔ ہاشمی) کے گھر میری والدہ کے ساتھ گئے۔ بی۔ اے ہاشمی اس وقت سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے پرنسپل تھے اور ان کی کوٹھی کالج کے عقب میں تھی۔ عصر کے وقت مولوی محمد اشرف نے کوٹھی کے لان ہی میں جائے نماز بچھائی اور نماز شروع کر دی۔ ہاشمی صاحب کے پاس السیشن نسل کا بہت بڑا کتا تھا۔ وہ کسی طرح کھل گیا اور سیدھا مولوی اشرف صاحب کی طرف لپکا، لیکن مولوی صاحب اسی طرح نماز میں کھڑے رہے۔ کتا لپک کر پاس آیا تو (بھونکنے کاٹنے کی بجائے) دم ہلا کر واپس چلا گیا۔ یہ واقعہ ہاشمی صاحب نے خود راقم کو سنایا"۔

خودنوشت سرگزشت ص (10-9)

انتقال سے تین روز قبل اپنے ایک معتقد عبداللہ مہر کو بلایا اور کہا "رات والد محترم اور دادا جان خواب میں ملے تھے اور انھوں نے کہا تھا کہ بیٹا اب ہمارے پاس آجاؤ" اور ٹھیک تین روز بعد 6۔ مارچ 1961ء کو بروز سوموار ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کے تین بیٹے تھے۔ عبداللہ، کفایت اللہ اور نعمت اللہ۔ عبداللہ کے چار بیٹے ہیں۔

انعام اللہ، احسان اللہ، اکرام اللہ اور عبدالقادر۔ یہ سب اپنے آبائی گاؤں میں ہیں۔

کفایت اللہ کے تین بیٹے ہیں محمد عمر، اسامہ اور محمد ارقم ۔نعمت اللہ کے تین بیٹے ہیں۔ بلال، شفیق اور افضال۔ یہ سب لاہور میں ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن

مولانا عبدالعزیز کے سب سے چھوٹے فرزند مولوی عبدالرحمٰن تھے جو 1912ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں ماں کی ممتا سے محرومی مقدر بنی۔ والد نے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے دوسری شادی کی لیکن بات بنائے نہ بنی۔ والد کی نرم دلی اور ماں کی شفقت سے محرومی نے طبیعت پر یہ اثر کیا کہ تعلیم کی طرف رغبت نہ ہوئی اور بات ''گلستان''''بوستان'' سے آگے نہ بڑھی۔ کتابت سیکھی لیکن اسے بطور پیشہ اختیار نہ کیا، کیوں کہ گاؤں چھوڑنا گوارا نہ تھا۔

کبڈی، کشتی کھیلتے۔ گتکا (بنوٹ) میں مہارت حاصل تھی۔ مختلف دست کاریاں، جن میں پارچہ بافی اور خطاطی شامل ہے، سیکھیں، لیکن انھیں بھی روزی کمانے کا ذریعہ نہ بنایا۔ آخر اپنے بڑے بھائی کے ساتھ دوا سازی کو ذریعہ روزگار بنایا۔

مقامی سیاست میں دل چسپی تھی۔ ایک بار اپنی یونین کونسل کے چیرمین بھی بنے۔ مسجد کے تمام معاملات کی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی۔ خود تو دینی علم کی طرف توجہ نہ دے سکے تھے لیکن اپنی اولاد کو پڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اپنے بیٹے سلیم اللہ کو دینی تعلیم دلوائی۔ ایک دن سلیم اللہ صاحب ان کے پاؤں داب رہے تھے تو کہنے لگے میں نے اپنے عالم باپ کی خدمت کی تھی۔ آج اس کا صلہ یہ ملا ہے کہ

عالم بیٹا میری خدمت گزاری میں مصروف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حسن صوت کی نعمت سے نوازا تھا۔ اپنی مترنم آواز میں قرآن کی تلاوت کرتے تو سماں بندھ جاتا۔ جمعۃ المبارک کے روز ان کے بڑے بھائی مولانا محمد اشرف جو خود بھی خوش الحان تھے، جمعے کا خطبہ ارشاد فرماتے اور وہ جمعہ کی نماز پڑھاتے تو جمعہ کا لطف دو بالا ہوجاتا۔

نہایت رقیق القلب تھے۔ کانپتے کانپتے جمعہ کی نماز میں سورۃ قیامہ کی تلاوت کرتے کلا اذا بلغت التراقی O وقیل من راقO وظن انه الفراقO پر پہنچتے تو سسکیاں بلند ہونے لگتیں۔ گلا رندھ جاتا اور آواز بند ہوجاتی اور روتے روتے براحال ہوجاتا۔ تلاوت کا مزید جاری رکھنا ناممکن ہوجاتا تو اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلے جاتے۔ یہ تو راقم الحروف کے مشاہدے کی بات ہے کہ شاید ہی نماز میں سورۃ قیامہ کبھی مکمل کر پائے ہوں۔

ان میں خدمتِ خلق کا جذبہ بے پایاں تھا۔ طبعاً نہایت مہمان نواز، متواضع، منکسر المزاج، فراخ دل اور کشادہ دست تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ گن گن کر خرچ کرنے سے اللہ بھی گن کر ہی دیتا ہے اور اگر بلا حساب کھائیں پیئیں تو اللہ بھی بغیر حساب کے نوازتا ہے۔ اللہ پر بہت توکل تھا۔ آبائی مسجد کو تعمیر ہوئے سو سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کی دیواریں اور چھتیں کمزور پڑ گئی تھیں۔ یہ صورتِ حال اس امر کی متقاضی تھی کہ مسجد کی ازسرنو تعمیر کی جائے۔ مسجد کی تعمیرنو کے لیے فنڈز کی فراہمی کا سوال سامنے آیا۔ ہماری تجویز یہ تھی کہ سفیر مقرر کیے جائیں اور اخبارات میں اپیلیں شائع کرائی جائیں۔ انھوں نے ہماری تجاویز کے ساتھ اتفاق نہ کیا اور فرمایا مسجد خدا کا

مسجد کی بالائی منزل

مسجد کا اندرونی منظر
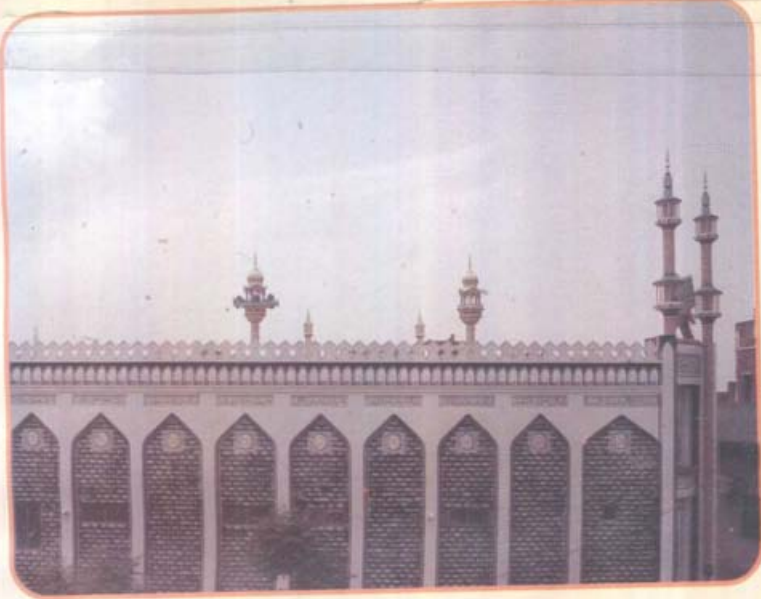
مسجد کے بیرونی مناظر

گھر ہے۔ وہ اپنے گھر کی تعمیر کا خود ہی انتظام فرمائے گا۔ میں اس سلسلے میں کسی سے سوال نہیں کروں گا۔ صبح اٹھے، مزدوروں سے پرانی مسجد شہید کرا کے ازسرنوتعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ ڈیڑھ سال کے قلیل عرصے میں مسجد کی نئی عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ کم از کم ہمارے علم میں نہیں کہ یہ فنڈز کیسے اور کہاں سے مہیا ہوئے۔ اللہ پر ان کے بے پناہ توکل کا نتیجہ تھا کہ جو کام برسوں میں ہونے والا تھا، وہ نہایت قلیل عرصے میں مکمل ہوگیا۔

1976ء میں اللہ تعالیٰ نے حج بیت اللہ کے شرف سے بھی نوازا۔ حج بیت اللہ کو گئے تو مسجد کا کام اپنے منجھلے صاحب زادے حافظ حمید اللہ صاحب کے سپرد کر گئے۔

یہ ذمہ داری ان کی واپسی کے بعد بھی حافظ صاحب کے پاس رہی لیکن مسجد سے ان کا تعلق آخر دم تک بدستور قائم رہا۔

دین کے ساتھ گہری وابستگی تھی۔ خود تو دینی علم کی تکمیل نہ کر پائے تھے، اس لیے اپنی اس کوتاہی پر تمام عمر تاسف کا اظہار کرتے رہے۔ اس کی تلافی کے لیے اپنی اولاد کو دینی علم پڑھانے کی پوری کوشش کی۔ ان کے ایک صاحب زادے سلیم اللہ نے جامعہ اسلامیہ گوجراں والا سے فراغت حاصل کی اور دوسرے صاحب زادے حمید اللہ نے قرآن مجید حفظ کیا اور مولانا گوہر رحمٰن سے دورہ تفسیر کیا۔

علمائے دین کی بلاتفریق ولحاظِ مسلک بڑی تعظیم کرتے۔ بعض علماء کے ساتھ ان کے تعلقات برادرانہ نوعیت کے تھے۔ ان میں سید عبدالغنی شاہ صاحب مرحوم ومغفور (کاموں کے) اور حافظ محمد یوسف صاحب گکھڑوی سرفہرست تھے۔ جماعت اسلامی کے ساتھ منسلک رہے اور اس کی دعوتی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔

24۔ اپریل 1980ء کو جمعرات کے روز صبح فالج کا حملہ ہوا اور 26۔ اپریل (بروز ہفتہ صبح آٹھ بجے) خالق حقیقی سے جا ملے۔ جامعہ اسلامیہ گوجراں والا کے شیخ الحدیث مولانا ابوالبرکات احمد رحمہ اللہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اپنے والد کی قبر کے بائیں جانب اور اپنے بھائی مولانا محمد اشرف صاحب کے پہلو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹی کی چادر اوڑھ لی۔

مولوی عبدالرحمٰن کی اولاد

اب مولوی عبدالرحمٰن کی اولاد کا تذکرہ ملاحظہ فرمایئے۔

ملک عصمت اللہ

23۔جون 1943ء کو قلعہ اسلام میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید ناظرہ مولانا حکیم عبدالرشید صاحب اجملؒ سے پڑھا۔ ختم قرآن کے بعد سکول میں داخلہ لیا۔ 1957ء میں مڈل کا امتحان پاس کر کے لاہور آگئے اور مسلم ماڈل ہائی سکول سے 1959ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں داخل ہوئے۔ کالج میں جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں پروفیسر مولانا علم الدین سالک، خواجہ عبدالحی فاروقی اور پروفیسر عبدالحمید صدیقیؒ ایسی نابغہ روزگار شخصیات شامل تھیں۔

1961ء میں ایف اے پاس کیا۔ 1962ء میں وائی ایم سی اے ہال سے اکاؤنٹینسی میں ڈپلومہ لیا اور پاکستان آڈٹ ڈیپارٹمنٹ (کمرشل آڈٹ) میں ملازمت اختیار کرلی۔

تعلیم و ملازمت کے دوران مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا۔ علاوہ ازیں حدیث کی کتابیں بلوغ المرام، مشکوۃ المصابیح اور سنن دارمی

پڑھیں۔ 1974ء میں گریجوایشن کی۔ 1981ء میں واہ کینٹ تبدیلی ہوگئی۔اس دوران جن دوستوں سے زیادہ ربط و ضبط رہا ان میں جناب عبدالستار غوری (ریسرچ سکالر المورد۔لاہور) اور ڈاکٹر محمد کمال (امیر جماعت اسلامی، ضلع راولپنڈی) شامل ہیں۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد سے درس نظامی کا امتحان پاس کیا اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی سے بنیادی اسلامی قانون میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ 2003ء میں ملازمت سے ریٹائرمنٹ لی۔ 2009ء میں ہفت روزہ الاعتصام لاہور کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے اور آج کل بطور مدیر کام کررہے ہیں۔

مولانا سلیم اللہ

مولانا عبدالرحمن کے دوسرے بیٹے مولانا سلیم اللہ تھے جو 19/ دسمبر 1945ء کو قلعہ اسلام میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو ناظرہ قرآن مجید حکیم عبدالرشید اجمل سے پڑھا۔ جامعہ اسلامیہ گوجراں والا سے دینی تعلیم حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ، مولانا ابوالبرکات احمد رحمہ اللہ (مدراسی) اور مولانا فاروق احمد راشدی شامل تھے۔ اس کے ساتھ انھوں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ عربی فاضل کی سند لی اور طب کا علم بھی حاصل کیا۔ گورنمنٹ پی بی ہائی سکول میں بطور او۔ ٹی ٹیچر تعیناتی ہوئی اور تیس سال تک اسی سکول میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے ساتھ طب کو بھی بطور پیشہ اختیار کیے رکھا۔ ساتھ ساتھ گوجراں والا میں تبلیغی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ شاہ پور کھیالی، آبادی مہر وزیر خاں، ماڈل ٹاؤن میں اہل حدیث مسجد کی امامت و خطابت کی ذمہ داریاں ادا کیں اور آخر میں جامع مسجد مرکزی عید گاہ گھوڑے شاہ میں

امامت اور خطابت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو عمر عزیز کا بیشتر حصہ تقریباً تیس سال کا عرصہ یہیں گزار دیا۔

فجر کی نماز کے بعد درس قرآن بھی دیتے رہے اور عوام میں قرآن شناسی پیدا کرنے کے لیے ترجمہ قرآن کی کلاسوں کا بھی اجرا کیا۔ طالبات کی تعلیم کے لیے ایک شعبہ قائم کیا جو جامعہ حفصہ للبنات کے نام سے موسوم ہے اور اب بھی کام کر رہا ہے جو ان کے لیے یقیناً صدقہ جاریہ ثابت ہوگا۔

مولانا سلیم اللہ کے چار بیٹے ہیں۔ عزیز الرحمٰن، محمد لقمان، نجم الثاقب اور عبدالحسیب۔ انھوں نے اپنی اولاد کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ محمد لقمان کے علاوہ ان کے تینوں بیٹے قرآن مجید کے حافظ اور اہل علم ہیں۔

ان کے بڑے بیٹے عزیز الرحمٰن ان کی جگہ پر مرکزی عیدگاہ کی جامع مسجد ہی میں امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ نجم الثاقب جامعہ رحمانیہ برکت مارکیٹ میں استاد ہیں اور علامہ اقبال ٹاؤن کی ایک مسجد میں خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ سب سے چھوٹے بیٹے عبدالحسیب جامعہ سلفیہ میں چھٹے سال کے طالب علم ہیں اور فیصل آباد کے مدینہ ٹاؤن میں مسجد قبا میں امامت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ مولانا سلیم اللہ کی یہ نیک اور صالح اولاد بھی ان کے لیے یقیناً صدقہ جاریہ ہے۔

عزیز الرحمٰن صاحب کے چار بیٹے ہیں جن کے نام ہیں محمد فواد، محمد جواد، محمد حماد اور محمد سعد۔ مولانا سلیم اللہ صاحب نہایت کشادہ دست اور مہمان نواز تھے۔ 2/ جولائی 2006ء کو صبح تہجد کے لیے اٹھے۔ دل کا اتنا سخت دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا

اور اپنے رب کے دربار میں حاضر ہو گئے۔

حافظ حمید اللہ سدید

یہ مولانا عبدالرحمٰن کے منجھلے بیٹے ہیں۔ 26 نومبر 1955ء کو قلعہ اسلام میں پیدا ہوئے۔ ناظرہ قرآن حکیم عبدالرشید اجمل سے پڑھا۔ مقامی گورنمنٹ مڈل سکول سے پرائمری پاس کی۔ اپنے بڑے بھائی مولانا سلیم اللہ سے قرآن مجید حفظ کیا۔ این ڈی اسلامیہ ہائی سکول اچھرہ سے مڈل اور میٹرک کے امتحان پاس کیے۔ جامعہ تعلیمات اسلامیہ فیصل آباد میں کچھ عرصہ زیر تعلیم رہنے کے بعد منصورہ (لاہور) آ گئے اور شیخ الحدیث و مہتمم مدرسہ تفہیم القرآن مردان مولانا گوہر رحمان سے دورہ تفسیر پڑھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے قرآن کالج لاہور سے قرآن کورس کیا اور امتیازی سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ والد علیہ الرحمہ نے حج کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے مسجد کے انتظام و انصرام کی تمام ذمہ داریاں ان کے سپرد کر دی تھیں جو بہت اچھے طریقے سے نباہ رہے ہیں۔

ان کے دو بیٹے ہیں، خزیمہ ناصر اور اسامہ یاسر۔ دونوں زیر تعلیم ہیں۔ خزیمہ ناصر بی کام کرنے کے بعد اے۔ سی۔ سی۔ اے۔ کر رہا ہے اور ساتھ ساتھ قرآن مجید بھی حفظ کر رہا ہے۔ دوسرا بیٹا اسامہ یاسر قرآن مجید حفظ کر چکا ہے۔ میٹرک کے بعد طبیہ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہو گیا ہے اور اب اپنا کلینک الکوثر دواخانہ کے نام سے چلا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا حصول بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔

حافظ صاحب نے 1992ء میں حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ 2004ء میں دوسرا حج کیا۔ 1995ء اور 1999ء میں عمرے بھی کیے۔ مسجد میں مزید وسعت حاجی محمد

طیب، بریگیڈیئر محمد سلیم کی مساعی جمیلہ سے ہوئی۔ انھوں نے اس کے لیے 16 مرلے زمین وقف کی۔ آج یہ مسجد عظیم الشان مساجد میں سے ہے۔ ملک ظفر اقبال ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور نے مسجد کے سامنے 5 مرلے کا پلاٹ فی سبیل اللہ وقف کیا تھا۔ اس پر بچیوں کے لیے مدرسہ تعمیر کیا گیا جہاں بچیاں تعلیم حاصل کررہی ہیں جو ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

حکیم نجیب اللہ 13 /نومبر 1952ء کو قلعہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دو صاحب زادے ہیں، جن کے اسمائے گرامی تنزیل الرحمٰن اور عقیل الرحمٰن ہیں۔ یہ سب گوجراں والا میں مقیم ہیں۔

رفیع اللہ 13 /اکتوبر 1957ء کو پیدا ہوئے۔ آج کل ام القوین میں مقیم ہیں۔

محمد زبیر 4 /اگست 1959ء کو پیدا ہوئے۔ ایم اے، ایل ایل بی ہیں۔ اسلام آباد میں وزارت ریلوے میں ملازم ہیں۔ ان کا ایک ہی صاحب زادہ عرباض ہے۔ رفیع اللہ کے سب سے چھوٹے بھائی سیف اللہ خالد ہیں۔ یہ 22 /ستمبر 1964ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے دو بیٹے طلحہ اور ساریہ ہیں۔

مولانا غلام رسولؒ کی بیٹیوں کی اولاد

مولانا غلام رسولؒ کی سات بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے دو بڑی بیٹیوں کی شادی فتح گڑھ چوڑیاں میں ہوئی تھی۔ ایک داماد مولانا محمد عثمان تھے۔

مولوی محمد عثمان عالم فاضل شخص تھے۔ مولانا غلام رسولؒ کے شاگرد تھے اور مولانا غلام رسولؒ کے چھوٹے بیٹے مولانا عبدالعزیز کے استاد بھی تھے۔ مولانا غلام رسولؒ 1288ھ میں حج بیت اللہ کے لیے گئے تو یہ اپنی اہلیہ سمیت اس قافلے میں شامل اور ان کے ہم رکاب تھے۔

مولانا عبدالعزیزؒ نے حصول علم کے لیے ان کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیے۔ لیکن وہاں کے حالات نے یہ تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہنے دیا۔ آئے دن ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے۔ ان حالات کی عکاسی مولانا عبدالعزیز صاحب نے یوں فرمائی ہے:

"بندہ فتح گڑھ چوڑیاں ضلع گورداس پور نزد مولوی محمد عثمان بن مولانا نظام الدین صاحب، 1299ھ طالب علم بود کہ ناگاہ درآں جا فساد مسلماناں باہنود برپا شد۔"

مولانا محمد عثمان کے دو بیٹے تھے عبدالحی اور محمد طاہر۔ مولوی عبدالحی کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ محمد طاہر صاحب تقسیم ملک کے بعد فتح گڑھ چوڑیاں سے ہجرت کر کے قلعہ اسلام میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ ان کے بیٹے سیف اللہ اور مولوی عبدالسلام تھے۔ عبدالسلام صاحب نے دینی تعلیم کے ساتھ اس دور میں گریجوایشن بھی کر رکھی تھی۔ مولانا محمد اشرف صاحب خطیب جامع مسجد مولانا غلام رسولؒ کے انتقال کے بعد گاہے گاہے جمعے کا خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ بعدازاں مسجد مہاجرین میں تادم واپسیں خطاب فرماتے رہے۔ ان کی گفتگو علمی نوعیت کی ہوتی تھی۔ آخرکار یہ بھی اپنے رب کے بلاوے پر اس کے پاس چلے گئے۔

ان کے پانچ بیٹے ہیں اور وہ ہیں ابوبکر، عمر فاروق، محمد عثمان، عبدالوحید اور عبدالکبیر۔ عمر فاروق ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں۔ ابوبکر صاحب کاروباری آدمی ہیں۔ محمد عثمان صاحب اپنی زمینوں پر کاشت کاری میں مصروف ہیں۔ عبدالکبیر ڈاکٹر عمر فاروق کے ساتھ کام کرتے ہیں اور عبدالوحید لاہور میں کسی کالج میں پروفیسر ہیں۔

ابوبکر صاحب کے ایک ہی صاحب زادے ہیں۔ ان کا نام محمد مدثر ہے۔ آج کل ملک سے باہر ہیں۔ ڈاکٹر عمر فاروق کے دو بیٹے ہیں، حسن فاروق اور زید فاروق گوجراں والا میں زیر تعلیم ہیں۔

محمد عثمان صاحب کے تین بیٹے ہیں۔ عبدالمعید، محمد طاہر اور محمد عامر...... عبدالمعید صاحب ملک سے باہر ہیں جب کہ دوسرے دونوں برخوردار زیر تعلیم ہیں۔ محمد عامر صاحب حافظ قرآن ہیں۔

عبدالوحید صاحب کے دو بیٹے (طلحہ وحید اور طلال وحید) ہیں۔ عبدالکبیر صاحب

کے دو بیٹے ہیں اور ان کے نام ہیں عبداللہ اور عبدالرحمٰن۔

سیف اللہ صاحب کا ایک ہی بیٹا تھا محمد افضال۔

افضال صاحب کے دو بیٹے ہیں عبدالواجد اور عبدا لصبور۔ یہ گوجراں والا میں مقیم ہیں۔

مولانا غلام رسول کی دوسری بیٹی کے پانچ بیٹے تھے۔ عبیداللہ، محمد معظم، غلام اللہ، ولی اللہ اور محمد عبداللہ۔

عبیداللہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔

غلام اللہ صاحب کے دو بیٹے تھے، محمد ایوب اور عبدالقیوم۔ دونوں بھائی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

عبدالقیوم صاحب کی اولاد نہ تھی۔

محمد ایوب صاحب کے چار بیٹے ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ عبدالحسیب، یاسر صالح، عامر صالح اور اسداللہ۔

محمد معظم صاحب کا ایک ہی فرزند تھا، جس کا نام محمد اعظم تھا۔ ان کے والد کی کتابوں کی دکان اردو بازار میں رہی ہے۔

محمد اعظم کے تین بیٹے ہیں۔ طارق محمود، خالد محمود اور اطہر محمود۔ یہ سب بیرون شیراں والا گیٹ لاہور میں مقیم ہیں۔

ولی اللہ صاحب بھی لا ولد تھے۔

محمد عبداللہ کے ایک بیٹے تھے، جن کا اسم گرامی حکیم محمد داؤد (فتح گڑھی) تھا۔ ان کا مطب گوجراں والا میں ہے جسے اب ان کے صاحب زادے حکیم ضیاء اللہ چلا رہے

ہیں۔

حکیم محمد داؤد صاحب کے پانچ بیٹے ہیں۔ محمد ضیاء اللہ، ڈاکٹر فیاض اللہ، احسان اللہ (مرحوم) حماد اطہر، عماد اطہر۔ ڈاکٹر فیاض اللہ بیرون ملک مقیم ہیں۔ باقی بھائی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔

مولانا غلام رسول کی دو بیٹیاں دھرم کوٹ (گورداس پور) میں بیاہی تھیں۔ بڑی بیٹی کے شوہر کا نام شیخ احمد تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ عبدالرحمٰن اور عبدالحی۔

عبدالحی بے اولاد تھے۔ عبدالرحمٰن تقسیم ملک کے بعد قلعہ اسلام میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ ان کا ایک بیٹا تھا جس کا نام حکیم عبدالرشید اجمل تھا۔

انھوں نے حکیم حاذق کی سند حاصل کر کے طبابت کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ انھیں قرآن مجید کا اکثر حصہ یاد تھا۔ بچوں کو قرآن مجید پڑھایا کرتے تھے۔ گاؤں کے اکثر لوگ ان کے شاگرد ہیں۔ حکیم صاحب کے چار بیٹے ہیں۔ خالد رشید اکبر، احمد سعید اختر، عبدالقدیر صفدر اور فیاض محمود اصغر۔

خالد رشید صاحب کی کوئی اولاد نہیں۔ قلعہ ہی میں رہائش پذیر ہیں۔ احمد سعید اختر صاحب (مرحوم) کے دو صاحب زادے ہیں۔ عبیدالرشید، عمیر عبدالصمد۔

عبدالقدیر صفدر صاحب کا ایک ہی بیٹا ہے، جس کا نام عزیر احمد سعد ہے۔ یہ لوگ شاہدرہ میں مقیم ہیں۔

فیاض محمود اصغر صاحب کے دو بیٹے ہیں۔ عیاض احمد اور علی احمد۔ یہ جوہر ٹاؤن میں مقیم ہیں۔

دوسری بیٹی کے شوہر کا نام علی احمد تھا، ان کے بھی دو بیٹے فقیر اللہ اور احمد اللہ تھے۔

تقسیم ملک کے بعد یہ دونوں بھائی گکھڑ کے قریب ایک گاؤں بدو کے گوسائیاں میں بس گئے تھے۔ دونوں تعلیم کے پیشے سے منسلک تھے۔

احمد اللہ صاحب کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔

فقیر اللہ صاحب کا ایک ہی صاحب زادہ تھا جس کا نام ناصر نذیر احمد تھا۔ناصر نذیر احمد صاحب کا بھی ایک ہی بیٹا اعجاز ناصر ہے۔

اعجاز ناصر کے تین بیٹے ہیں، زین ناصر، حمزہ ناصر اور ولید ناصر۔ یہ بھی جوہر ٹاؤن (لاہور) میں مقیم ہیں۔

مولانا غلام رسول کی تین بیٹیوں کی شادی ساہو والہ (ضلع سیالکوٹ) میں حکیم غلام حسین (جو مولانا غلام رسول صاحب کے شاگرد تھے) کے دو بیٹوں مولوی محمد شریف اور حکیم محبوب عالم، اور حکیم غلام حسین کے بھائی حکیم علی محمد کے بیٹے حکیم عبدالقادر سے ہوئی تھی۔ ان تینوں صاحب زادیوں کی اولاد کی تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے۔

مولوی محمد شریف کے دو بیٹے تھے۔ حکیم عبدالحی ساہو والہ اور محمد بشیر صاحب (کراچی)۔

حکیم عبدالحی صاحب کے چار بیٹے ہیں عتیق الرحمٰن، شفیق الرحمٰن، محمد فاروق اور محمد داؤد۔آگے محمد فاروق کے دو بیٹے ہیں۔عمر فاروق اور محمد علی۔

محمد بشیر صاحب (کراچی) کے تین بیٹے ہیں۔محمد منیر، محمد نصیر اور محمد نسیم۔

محمد منیر صاحب آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ ان کے تین صاحب زادے ہیں۔ ارشد منیر، اسد منیر اور خضر منیر۔تینوں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور برسر روزگار ہیں۔

حکیم محبوب عالم صاحب کے چار بیٹے ہیں، مسعود اختر، مقبول اختر، محمود اختر اور

افتخار احمد۔

حکیم عبدالقادر صاحب کے بھی چار بیٹے ہیں۔ ولی اللہ، حکیم محمد نذیر (سیالکوٹ)، حکیم محمد بشیر (بھوپال والہ) اور عبیداللہ صاحب (منڈی بہاؤ الدین)۔

ولی اللہ صاحب کی کوئی اولاد نہ تھی۔ حکیم محمد نذیر کے تین بیٹے تھے۔عبدالحفیظ، عبدالقدیر اور ریاض احمد۔

عبدالحفیظ صاحب کے چار بیٹے ہیں۔عبدالغفور، عبدالشکور، نثار احمد اور افتخار احمد۔

عبدالقدیر صاحب کے تین بیٹے ہیں، طلعت محمود، منیر محمود اور شاہد محمود۔

ریاض احمد صاحب کے بھی تین ہی بیٹے ہیں۔عبدالقیوم، شکیل احمد اور تنویر احمد۔

حکیم محمد بشیر (بھوپال والہ) کے چار بیٹے ہیں۔ محمد عثمان (مرحوم)، محمد اقبال، عبدالحنان اور عبدالمنان۔

مولوی عبیداللہ صاحب (منڈی بہاؤ الدین) کے دو بیٹے ہیں۔ ابراہیم اور عبدالسلام۔ابراہیم صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔

عبدالسلام صاحب کے پانچ بیٹے ہیں۔عبدالجبار، عبدالرؤف، ثناء اللہ، محمد یعقوب اور محمد ایوب۔

ابراہیم صاحب کے ماشاء اللہ آٹھ بیٹے ہیں، جن کے نام یہ ہیں۔ نیر جہاں گیر، شاہد محمود، زاہد محمود، خلیل الرحمٰن، طاہر انجم، جاوید اقبال، عبدالجلیل اور اعجاز احمد۔

ملک عصمت اللہ صاحب کی تحریر ختم ہوئی۔ اس میں انھوں نے میری درخواست پر حضرت مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ کے بھائیوں (حکیم غلام محمد اور شیر محمد) مولانا کے صاحب زادوں (مولانا عبدالقادر اور مولانا عبدالعزیز) اور مولانا کی صاحب

زادیوں کا تذکرہ کر دیا ہے جو اکتیسویں باب سے لے کر آخرِ کتاب تک سنتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ملک عصمت اللہ صاحب، حضرت مولانا غلام رسول کے حقیقی پڑپوتے ہیں۔ انھوں نے مہربانی فرمائی کہ مولانا کے اعزہ و اخلاف کی نرینہ اولاد کی پوری فہرست بیان کردی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مرحومین کے جو مشاغل تھے، ان کا ذکر بھی کر دیا ہے اور موجودین کی مصروفیات سے بھی قارئین کو مطلع فرما دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ اس خاندان کے فوت شدگان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور زندوں کو خدمتِ دین کی توفیق سے نوازے۔ اس کتاب کے مصنف عاجز کو اور اس سعی کے معاونین خصوصاً حافظ محمد سعید طاہر کو بھی دنیا و آخرت میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم.
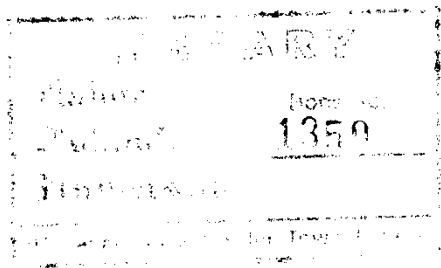
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ ایسی ہی صاحب عزیمت شخصیت تھے آپ 1228ھ/1813ء کو پیدا ہوئے۔ عالم طفولیت ہی میں نیکی اور ورع طبیعت پر غالب تھا۔ ابتدائی تعلیم بگوی خاندان سے حاصل کی۔ شیخ الکل سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کئے اور حضرت سید امیر رحمہ اللہ (کوٹھا شریف) کو روحانی پیشوا بنایا۔ سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ سے رشتہ اخوت اُستوار کیا۔ قرآن وسنت کی تعلیم کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔ اور پھر ساری زندگی دین حنیف کی دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتعلم کے مقدس کام میں بسر کر دی۔

آپ کا شمار صاحب کرامت اولیاء اور مستجاب الدعوات ہستیوں میں ہوتا ہے۔ آپ کا حلقہ ارادت بڑا وسیع تھا۔ آپ جیسی شخصیات ہی اُمت کے لئے روشنی اور رہبری کی قندیل ہوتی ہیں۔ یقیناً ایسی شخصیات کا تذکرہ ایمان کو جلا بخشتا ہے اور قدموں کو صحیح راہ پر ڈالتا ہے۔

تنہا مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ کا تذکرہ ہی بجائے خود اہمیت کا حامل ہے مگر یہ تذکرہ اس وقت ایک ادبی شہ پارہ بن گیا جب یہ قلم وقرطاس کے فرمانروا مؤرخ مولانا محمد اسحٰق بھٹی حفظہ اللہ کے رشحات قلم سے منظر عام پر آیا۔ موصوف اب تک سینکڑوں شخصیات کی قلمی تصویریں کھینچ چکے ہیں۔ اب ان کے قلم سے مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کا ذکر جمیل ایک شاہکار بن کر سامنے آیا۔

ان شاء اللہ اس کے مطالعے سے آپ کے دل و دماغ میں ایمان ویقین کے چراغ روشن ہوں گے۔ اور دل پکارے گا: ع

یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی